مسئلہ فقر وافلاس اور اس کا تدارک

(اسلامی معاشی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی روشنی میں)

(تقابلی و تحقیقی جائزہ)

تحقیقی مقالہ برائے

پی ایچ۔ڈی علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

کاظم حسین

پی ایچ۔ڈی علوم اسلامیہ

نگران مقالہ

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری

صدر شعبہ علوم اسلامیہ

نمل، اسلام آباد

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

۲۰۱۹ء

مسئلہ فقر وافلاس اور اس کا تدارک

(اسلامی معاشی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی روشنی میں)

(تقابلی و تحقیقی جائزہ)

تحقیقی مقالہ برائے

پی ایچ۔ڈی علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

کاظم حسین

پی ایچ۔ڈی علوم اسلامیہ

نگران مقالہ

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری

صدر شعبہ علوم اسلامیہ

نمل، اسلام آباد

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

۲۰۱۹ء

©(کاظم حسین)

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرستِ عنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
.1	فہرست عنوانات	III
.2	منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ	V
.3	حلف نامہ فارم	VI
.4	انتساب	VII
.5	اظہارِ تشکر	VIII
.6	رموز و اشارات	X
.7	Abstract	XI
.8	مقدمہ	XII
.9	**باب اول: فقر کا لغوی و اصطلاحی مفہوم**	
.10	فصل اول: فقر کا لغوی و اصطلاحی مفہوم	2
.11	فصل دوم: فقر کی اقسام	34
.12	فصل سوم: موجودہ دور میں فقر و افلاس-اعداد و شمار کی روشنی میں	43
.13	**باب دوم: فقر و افلاس کے اسباب**	48
.14	فصل اول: سیاسی اسباب	53
.15	فصل دوم: معاشی اسباب	61
.16	فصل سوم: معاشرتی و اجتماعی اسباب	76
.17	**باب سوم: فقر و افلاس کے انسانی زندگی پر اثرات**	91
.18	فصل اول: معاشرتی و اجتماعی زندگی پر اثرات	94
.19	فصل دوم: ایمان و اخلاق پر اثرات	108

20.	فصل سوم: اقتصادی زندگی پر اثرات	121
21.	فصل چہارم: افکار انسانی پر اثرات	129
22.	**باب چہارم: فقر کا حل اسلامی معاشی اصولوں کی روشنی میں**	136
23.	فصل اول: تقسیم دولت کا اصول اور ارتکاز دولت کی ممانعت	143
24.	فصل دوم: غریب پروری اور فقر کے خاتمے کی تلقین	178
25.	فصل سوم: زکاۃ و خمس و عشر اور نظامِ صدقہ و خیرات	208
26.	فصل چہارم: ذاتی ملکیت کی فراہمی اور اقتصادی حدود و قیود	241
27.	فصل پنجم: اسلامی بیت المال اور امداد باہمی کا اصول	266
28.	فصل ششم: اسلام کا قانون میراث	281
29.	**باب پنجم: فقر کا حل سرمایہ دارانہ نظام کی روشنی میں**	301
30.	فصل اول: فرد کی معاشی آزادی کا تصور	305
31.	فصل دوم: ریاست کی عدم مداخلت	314
32.	فصل سوم: ذاتی منافع کا محرک	326
33.	فصل چہارم: صارف کی حکمرانی	334
34.	فصل پنجم: ذاتی کاروبار کے مواقع اور عوامی آگاہی فراہم کرنا	344
35.	نتائج بحث	354
36.	تجاویز و سفارشات	357
37.	فہارس	360
38.	فہرست مصادر و مراجع	399

منظوری فارم برائے مقالہ ودفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval Form)

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالہ کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہے اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: مسئلہ فقر وافلاس اور اس کا تدارک
اسلامی معاشی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی روشنی میں
(تقابلی وتحقیقی جائزہ)

The Issue of Poverty and its Solution in the Light of Islamic Economic and Capitalism
(A Comparative Study)

نام ڈگری: ڈاکٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ

نام مقالہ نگار: کاظم حسین

رجسٹریشن نمبر: 608-Mphil/IS/Jan-11

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری
(نگران مقالہ) ______________ دستخط نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر شاہد صدیقی
(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) ______________ (دستخط فیکلٹی آف سوشل سائنسز)

میجر جنرل (ر) محمد جعفر
(ریکٹر نمل) ______________ دستخط ریکٹر نمل

تاریخ: ______________

حلف نامہ فارم

(Candidate Declaration Form)

میں کاظم حسین ولد کرم حسین

رول نمبر:I-69 رجسٹریشن نمبر: 608-Mphil/IS/Jan-11

طالب علم، پی ایچ ڈی، شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز(نمل) اسلام آباد، حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ

مقالہ بعنوان: مسئلہ فقر وافلاس اوراس کا تدارک

اسلامی معاشی نظام اور سرمایہ دارانہ نظام کی روشنی میں

(تقابلی و تحقیقی جائزہ)

The Issue of Poverty and its Solution in the Light of Islamic Economic and Capitalism
(A Comparative Study)

پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے۔اورڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے۔ نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لیے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: کاظم حسین

دستخط مقالہ نگار: __________

انتساب

میں اس تحقیقی کاوش کو اپنے شفیق اور مہربان والدین کے نام کرتا ہوں، جن کی بے لوث دعاؤں، محبتوں اور شفقتوں کے باعث آج جذبہ مفتخر حاصل ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ انھیں کی بے حساب دعاؤں نے آج تک زندگی میں مشکلات کا احساس نہیں ہونے دیا ہے۔ خدا ان پر اپنی بے پایاں رحمتیں اور برکتیں نازل فرمائے۔ (آمین)

اظہارِ تشکر

سب سے پہلے میں اپنے رب کے حضور سراپا سپاس گزار ہوں کہ اس نے اپنی بے پایاں رَحمت اور لُطف و کرم سے مجھے اس مقالہ کو مکمل کرنے کی ہمت و طاقت اور توفیق عطا فرمائی۔ اس کے بعد اس تحقیقی مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں جن اہلِ علم کے مشوروں اور آراء سے میں مستفید ہوتا رہا، میں ان سب کا بالعموم تہہ دل سے شکر گزار اور احسان مند ہوں۔

بعد ازاں میں نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اور شعبہ علوم اسلامیہ نمل کا خاص طور پر شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے میرے جیسے طلاب کی تدریس وراہنمائی کے فرائض کو بطریق احسن نبھایا ہے۔

نگرانِ مقالہ پروفیسر ڈاکٹر عبد الغفار بخاری صاحب (صدر شعبہ علومِ اسلامیہ، نمل اسلام آباد) میرے انتہائی شکریہ کے مستحق ہیں جن کی رہنمائی مجھے ہر قدم پر حاصل رہی۔ انہوں نے شفقت اور محبت سے مسوّدہ کو ملاحظہ فرمایا اور اپنی گراں قدر آراء اور مشوروں سے مستفیض کیا۔

میں اپنے محسن، مربی اور شفیق و مہربان استادِ بزرگوار علامہ محسن علی نجفی (دام ظلہ) کا بھی احسان مند ہوں کہ آج جس مقام پر کھڑا ہوں وہ اس بزرگ شخصیت کی عنایات اور سرپرستی کے بغیر ناقابلِ حصول تھا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی ان کو صحت و تندرستی اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ (آمین)

اپنے شفیق اور محنتی اساتذہ پروفیسر ڈاکٹر ضیاء الحق یوسفزئی (سابق صدر علومِ اسلامیہ، نمل اسلام آباد) اور پروفیسر ڈاکٹر مستفیض احمد علوی صاحب (لیڈز یونیورسٹی، لاہور) کی شفقت و عنایت ہر موقع پہ شاملِ حال رہی۔ میں ان سب اساتذہ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

میں نے دورانِ تحقیق، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی (اسلام آباد)، نذیر لائبریری، (نمل، اسلام آباد) آرمی سنٹرل لائبریری (جی-ایچ-کیو) کے علاوہ جامعہ پنجاب لاہور، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد)، جامعہ الصادق (اسلام آباد)، جامعہ الکوثر اسلام آباد اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے کتب خانوں سے استفادہ کیا ہے۔ میں ان کتب خانوں کے منتظمین کا شکر گزار ہوں۔ اور خاص طور پر جامعہ الصادق لائبریری (اسلام آباد) کے منتظم محترم جناب محسن عباس رضوی صاحب کی خصوصی معاونت پر ان کا احسان مند ہوں۔ انگریزی عبارات میں معاونت نیز مسودہ کی کمپوزنگ اور فنی معاونت و مشاورت کے حوالے سے اپنے دوست برادر محسن رضا ہاشمی کا بے حد احسان مند ہوں۔ اس موقع پر اپنی شریکہ حیات کا بھرپور ساتھ رہا میں ان کا بھی دل کی گہرائیوں سے سپاس گزار ہوں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرے ان تمام معاونین کو اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ (آمین)

وَ مَا تَوفیْقِی إِلّا بِاللہِ عَلَیْہِ تَوَکلتُ وَ إِلَیْہِ أُنَیْبُ

رموزواشارات

تحقیق کے دوران مندرجہ ذیل رموزواشارات کو مقالہ میں اختیار کیا گیا ہے۔

• آیاتِ کریمہ کے لیے	﴿---﴾
• احادیث مبارکہ کے لیے	((---))
• اقتباسات اور اقوال کے لیے	"---"
• سن ہجری کے لیے	ھ
• سن عیسوی کے لیے	ء
• جلد اور صفحہ نمبر کے لیے	ج/ص

ABSTRACT

Poverty is one of the most crucial and biggest social problem of the modern age. Unfortunately, the number of people living below poverty line is increasing day by day at an alarming rate. Poverty is a social problem that further gives raise to more distressing problems, like, unemployment, crime, depression, etc. Sincere efforts are being made to find a solution to this issue. However, poverty continues to afflict us by growing at an ever-increasing rate. While the world on the whole has become more prosperous in recent years, inequality has increased both within and between countries. Extreme poverty is globally the greatest single human rights issue. It is the dream of every society to get rid of poverty and its accompanying crisis, but the question that torments us is “How can this goal be achieved?” Poverty and economic deprivation are the causes of anarchy and instability in many countries of the world.

Evils emanating from man designed economic system have existed from time immoral, the sufferings of which are experienced by the individual man, society of what we call the radical today. Equality of opportunity no longer exists. Are we all running a losing race?

Nature has far more provided to cater to each one's requirements and needs but with the devilish acts of few, this very same Divine Blessing gets abused in the form of unequal distribution. Such unfair practices makes man to hoard more and even more, and with the high rise population there's seen an ever increase in man's greed too. Such uncontrolled liberty and unbridled power needs an emergency check. Clearly all this calls for eradication of the existing economic system.

Islamic norms ensure that the principle for factor pricing is based on justice and fairness. Islamic Economic System is a swift solution in safeguarding the interests of an individual and the society as a whole. One man's meat can never be another man's poison, are those values which an Islamic Economic System offers. Through this Research paper on Eradication of Poverty, to pursue private motives and self-interest a growing realization of appreciating all what this Fair Islamic System has to offer, can be logically recognized.

مقدّمہ

(ا)۔ موضوع تحقیق کا تعارف و پسِ منظر

معاشی خوش حالی افراد کو نہ صرف اقتصادی میدان میں بلکہ زندگی کے تمام دیگر شعبوں میں بھی راحت و سکون عطا کرتی ہے، تاکہ وہ تمام معاشرتی و سماجی مسائل میں بھرپور کردار ادا کر سکے۔ یہ معاملہ فقط افراد تک ہی محدود نہیں بلکہ معاشی ترقی اور خود انحصاری ہی وہ چیز ہے جس کے باعث معاشی میدان میں ترقی یافتہ اقوام کو کسی ملک کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کرنے اور اس کا استحصال کرنے کا موقع نہیں مل سکتا۔ کسی بھی ملک کی فوجی طاقت اور دفاعی قوت کی بنیاد اور اس کے سیاسی استحکام کی لازمی شرط بھی معاشی تعمیر ہے۔ لہٰذا معاشی و اقتصادی ترقی افراد، ممالک اور معاشروں میں غربت کے خاتمہ اور خود کفالت کے لئے ضروری ہے۔ حد درجہ معاشی تفاوت اور دن بدن بڑھتی ہوئی غربت و افلاس کو ختم کرنے اور ضرورت مندوں کی کم از کم بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات میں بھرپور راہنمائی فراہم کی گئی ہے۔

اسلام ایک متوازن مذہب ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کے لیے نہ صرف بہتر معاشرتی نظام دیتا ہے بلکہ بہتر معاشی نظام بھی فراہم کرتا ہے۔ اسلام جہاں اپنے ماننے والوں کو اپنی تعلیمات کی طرف متوجہ کرتا ہے وہیں وہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کی توجہ معاشی وسائل کی ترقی اور پیداواری امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی طرف مرکوز کرتا ہے۔ اس کے نزدیک معاشی یا اقتصادی وسائل اور ذرائع پیداوار صرف مسلمان افراد کے لیے ہی نہیں بلکہ بنی آدم کے تمام افراد کے استفادہ کے لیے یکساں اور برابر ہیں۔ اسلام معاشرے میں معاشی انصاف اور معاشی آزادی کے قیام کے ساتھ ساتھ غربت و افلاس کا انسداد کر کے بہتر معاشی زندگی کا قیام ممکن بناتا ہے۔ اسلام کے فراہم کردہ معاشی اصولوں میں پیدائشِ دولت، صرفِ دولت، تبادلۂ دولت اور تقسیم دولت غرضیکہ تمام معاشی پہلوؤں پر بھرپور توجہ دی جاتی ہے۔

بحیثیت مسلمان ہمارا اس بات پر پختہ ایمان ہے کہ دنیا کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کے بارے میں رسول رحمت و رافت سیدنا و مولانا محمد مصطفی احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمارے لئے کوئی نمونہ، رہنمائی اور اصولی ہدایات نہ چھوڑی ہوں۔ تمام مسلمانوں کا بالاتفاق اس بات پر عقیدہ اور ایمان ہے کہ دینِ اسلام نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر گوشہ و کنار میں اپنے ماننے والوں کو ایسے رہنما اصول عطا فرمائے ہیں جو دنیا و آخرت میں ان کی فلاح و نجات کے ضامن ہیں۔ اسلام کی طرف سے عطا کیے گئے یہ اصول و قوانین اس قدر لاریب اور بے عیب ہیں کہ ان کی پاسداری انسانی سماج کے اندر معاشرتی و معاشی انصاف کے قیام کی ضامن ہے۔

دنیا میں ظلم و ناانصافی، بھوک، افلاس، تنگدستی، خودساختہ استحصالی، غیر منصفانہ قانون، غیر فطری حد تک معاشی و معاشرتی تفاوت اور معاشی عدم توازن جیسی بنیادی اور ننگ انسانیت خرابیوں کو ختم کرنے کے لیے اسلامی معاشی اصول بے مثل و بے نظیر اور انتہائی قابلِ عمل شکل میں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اور نہیں تو کم از کم اسلام کے وہ معاشی اصول جو غربت و افلاس اور تنگدستی و محتاجی جیسے مسائل کے محاذ پر لڑنے کے لیے پوری انسانیت کے کام آسکتے ہیں، ان تمام اقتصادی اصولوں کو صحیح معنوں میں روشناس کرایا جائے تاکہ نہ صرف اسلامی معاشرے بلکہ دیگر اقتصادی مکاتب فکر بھی فقر و غربت اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے ان سے استفادہ کر سکیں۔

دوسری طرف سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اصولوں میں سے کچھ خاص طور پر معاشی مسئلہ سے نبٹنے کے لیے معاون اصول ہیں اور ان کا مثبت پہلو یہ ہے کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے رائج معاشی نظام ہونے کی وجہ سے لگاتار نہ صرف آزمائے جارہے ہیں بلکہ ان میں آئے روز مزید بہتری اور پختگی بھی نظر آرہی ہے۔ چنانچہ اس پسِ منظر کو سامنے رکھتے ہوئے، اس تحقیقی کاوش میں، مسئلہ و فقر و افلاس سے نبرد آزما ہونے کے لیے اسلام کی معاشی تعلیمات و ہدایات اور سرمایہ دارانہ نظام کی کاوشوں کا تنقیدی اور تقابلی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش گئی ہے۔

(۲)۔ضرورت و اہمیت

علم الاقتصاد اتنا ہی پرانا ہے جتنی کہ انسانی تاریخ۔ دنیا میں بھیجا جانے والا پہلا انسان جب کرہ ارضی پر آیا تو اپنے ساتھ معاشی اور اقتصادی مسائل بھی لایا۔ اللہ نے تخلیق انسان کے وقت کسب معاش کی صلاحیت بدرجہ اتم اس میں رکھ دی تھی۔ یہی وجہ ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر انسان اپنی صلاحیت اور طاقت کے مطابق زیادہ سے زیادہ وسائل جمع کر کے اپنی ضرورت پوری کرنا چاہتا ہے۔ صرف انفرادی زندگی ہی نہیں بلکہ قوموں کے عروج و زوال، خوش حالی و بدحالی، امن و جنگ اور کامیابی و ناکامی کی اہم وجوہ میں بھی معاشیات و اقتصادیات کے استحکام و عدم استحکام کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر میں جو ملک معاشی طور پر مضبوط ہیں وہ ترقی یافتہ، بااختیار اور طاقتور تصور کیے جاتے ہیں۔ اور جو اقتصادی طور پر مضبوط نہیں ہیں وہ غریب اور پسماندہ ممالک کی فہرست میں شمار کیے جاتے ہیں۔

عام مشاہدے کی بات ہے کہ اجتماعی زندگی کا ایک بہت اہم شعبہ انسان کی معاشی و اقتصادی زندگی ہے کہ جس پر اس کی مادی زندگی کا بہت بڑا دارومدار ہے۔ اگر معاشی زندگی ناکام ہو، اگر انسان فقر و فاقہ کا شکار ہو اور اگر اسے مادی وسائل میسر نہ ہوں تو اس کے لیے اپنے دیگر دنیوی اور دینی تقاضوں کی انجام دہی بھی بعض حالات میں انتہائی مشکل اور کبھی کبھی بالکل ہی ناممکن ہو

جاتی ہے۔ان حالات میں کہا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے سماجی معاملات، اخلاقی تقاضوں اور دینی ذمہ داریوں کی تکمیل اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ معاشی اور اقتصادی طور پر مستحکم اور مضبوط ہو۔

یہ سب باتیں بجاہیں لیکن صد افسوس کہ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت فقر و افلاس دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ ہے اور اکیسویں صدی میں دنیا کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ روزانہ ۲۵۰۰۰ لوگ بھوک یا اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کی وجہ سے مر رہے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر ساڑھے تین سیکنڈ بعد ایک فرد اس دنیا سے صرف بھوک یا اس کی وجہ سے جنم لینے والے مسائل کی نذر ہو رہا ہے۔ لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ دنیا میں موجود فقر کی وجہ "خوراک کی کمی" نہیں ہے کیونکہ دنیا میں موجود خوراک موجودہ آبادی کے لیے ناکافی نہیں ہے بلکہ مسئلہ خوراک کی، یا پھر جس پیسے سے خوراک خریدی جاتی ہے اس کی، منصفانہ تقسیم کا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر غربت کے تدارک کے لیے کی جانے والی سعی و کوشش کے باوجود بد قسمتی سے فقر و افلاس، تنگدستی و محتاجی اور ان سے منسلک مسائل ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں مزید پیچیدگی آتی جا رہی ہے۔اب یہ مسائل افراد اور خاندان کے اندر تک محدود نہیں بلکہ ملکی سطح سے بھی بڑھ کر عالمی سطح تک جا پہنچے ہیں۔عالمگیریت کے اس ماحول میں کسی بھی ملکی کی پسماندگی اور غربت، اس کے ساتھ ساتھ دیگر ممالک کو بھی متاثر کرتی ہے۔عالمی سطح پر فقر و افلاس کے خاتمے اور تدارک کے لیے کی جانے والی کوششوں کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی معاشی اصولوں میں اس مسئلے کی نزاکت اور اس سے نبرد آزما ہونے کے طریقہ کار کو دیگر معاشی مکاتب کے سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔موجودہ عالمی حالات، فقر و تنگدستی، غربت و افلاس اور اقتصادی ناہمواری کے ماحول میں غربت و افلاس کے مسئلے سے بر سر پیکار ہونے کے لیے اسلامی معاشی افکار کو قرآن اور اسلامی تعلیمات کی روشنی پیش کیا جاتا ہے تا کہ نفسا نفسی، تنگدستی اور غربت و افلاس کی صورتحال سے نکلنے کے لیے دیگر معاشی نظاموں کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشی نظریات سے بھی استفادہ کیا جا سکے جو اس ضمن میں سب سے زیادہ مؤثر لائحہ عمل کا حامل ہے۔یوں فقر و افلاس کے مسئلے کا حل نکالا جا سکے اور امن و سلامتی کی راہ ہموار کی جا سکے۔

(۳)۔موضوعِ تحقیق کا بنیادی مسئلہ

- فقر کی حقیقت و ماہیت اور اس کا تاریخی پس منظر کیا ہے اور وہ کون سے اسباب اور وجوہ ہیں جن سے مسئلہ فقر و افلاس پیدا ہوتا ہے؟ نیز فقر و افلاس اور غربت و تنگدستی کا مسئلہ معاشرے کے کن پہلوؤں پر اور کس طرح سے اثر انداز ہوتا ہے؟

❖ اسلامی اقتصادیات کی روشنی میں فقر و افلاس کا جامع حل کیا ہے؟ نیز اسلامی اقتصادی قوانین اور معاشی اصول کس طرح سے فقر و افلاس کے تدارک میں معاون ثابت ہوتے ہیں؟

❖ سرمایہ دارانہ نظام کے وہ کون سے اصول ہیں جو فقر کی راہ میں حائل ہیں اور جن کی مدد سے اس مسئلے کے تدارک میں مدد لی جاسکتی ہے؟

(۴)۔ اہداف و مقاصد تحقیق

اکیسویں صدی میں بڑھتے ہوئے اقتصادی و معاشی مسائل کی وجہ سے میں نے فقر و افلاس کے مسئلے کو اپنی تحقیق کا عنوان بنایا ہے۔ میں نے اپنے اس تحقیقی کام میں فقر کے تاریخی پس منظر کے ساتھ اس کے علل و وجوہ اور اس کے نتائج اور ثمرات کو بھی اپنی تحقیق میں شامل کیا ہے۔ عالمی اقتصادی نظام یعنی سرمایہ دارانہ نظام اس مسئلے کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے؟ اور پھر اس کا حل کن مراحل کی صورت میں پیش کرتا ہے؟ اور وہ اقدامات کس حد تک غربت کی کمی یا خاتمے کا باعث بن سکتے ہیں؟ ان موضوعات کو بھی تحقیقی کام کا حصہ بنایا گیا ہے۔

ہماری اس تحقیقی کاوش کا بنیادی مقصد اقوامِ عالم کو فقر و افلاس کے خاتمے کے لیے اسلام کی طرف سے پیش کیے گئے مدلل اور قابل عمل حل سے روشناس کرانا ہے تاکہ روز بروز افزوں ہوتے ہوئے اس مسئلے کے لیے مزید عملی تدابیر کو بھی اپنایا جاسکے اور انسانی معاشرے میں ایک مرض کی طرح پھیلتی ہوئی اس بیماری اور مرض کو کنٹرول کرنے اور پھر اس کا قلع قمع کرنے میں مدد مل سکے۔ مزید بر آں چونکہ اسلام ایسی کسی قید و پابندی کا قائل نہیں کہ جس کے تحت معاشرتی فلاح و بہبود اور انسانیت کی بھلائی کے لیے نازل شدہ قوانین صرف مسلمانوں ہی کے استفادہ کے لیے ہوں، بلکہ اس کے قوانین ابدی اور سب کے استفادے کے لیے یکساں ہیں، لہٰذا اپنی اس تحقیقی کاوش کے ذریعے دنیا کے تمام اقتصادی مکاتب کو فقر و افلاس کے خاتمے کے لیے اسلام کے بتائے گئے لائحہ عمل کی طرف متوجہ کرنا اور ان کو اپنانے کی طرف راغب کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میری اس تحقیق کا اہم حصہ فقر کے خاتمے کے لیے اسلام کا پیش کردہ حل ہے جو کہ بہت وسیع، نہایت مدلل اور بہت جامع ہے۔ علاوہ ازیں فقر کے مسئلے کے حل کے لیے اس کا نعم البدل شاید کسی اقتصادی نظام یا کسی مذہب کے پاس نہیں ہے۔ اگر اسلامی اقتصادی اصولوں کے مطابق اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے تو بہت جلد ہی پوری دنیا کی غربت و افلاس پر قابو پایا جاسکتا ہے یہی میری تحقیق کا مقصد ہے۔

(۵)۔ موضوعِ تحقیق کے مفروضات

❖ مذہب اسلام فقط امورِ عبادات تک ہی محدود نہیں بلکہ یہ تمام معاشرتی و سماجی مسائل میں، بشمول اقتصادی و معاشی معاملات کے، اپنے خاص نکتہ نظر اور الگ نظریے کا حامل ہے جو کسی اور نظام سے ماخوذ ہے نہ ہی کسی نظام

کی مخلوط شکل، بلکہ خالصۃً الہامی ہے۔ اسلام معاشی مساوات پر مشتمل ایک ایسا نظام رکھتا ہے جس میں تمام اشیاء کی حقیقی ملکیت صرف اللہ کے لیے ہے پس انسانوں کے ہاتھوں میں جو مال ہے، اسے وہ اللہ کی امانت قرار دیتا ہے۔

- ❖ معاشی و اقتصادی مسائل کثیر الجہتی اثرات کے حامل ہیں، جو افراد کی اقتصادی و معاشرتی زندگی ہی نہیں بلکہ ان کے ایمان وعقیدے کے ساتھ ساتھ ان کی فکری صلاحیتوں پر بھی بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔
- ❖ اسلامی نظام معیشت معاشی مسائل کو بالکل فطری انداز میں حل کرتا ہے۔ حرام اور ناجائز ذرائع سے دولت کو کمانے کے ساتھ ساتھ وہ دولت کے غلط استعمال کے راستوں کو بھی بند کرتا ہے۔ سلامی معاشی اصولوں کے مطابق انسان جو کچھ بھی اپنی ذاتی محنت و مشقت سے کماتا ہے اس سب کا وہ بلا شرکت غیرے مالک نہیں ہوتا بلکہ اس کی ضرورت سے زائد مال پر وہ امین ٹھہرایا گیا ہے۔ اسلام کے یہ اقدامات فقر و افلاس کے مسئلے کے حل کے لیے کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔
- ❖ سرمایہ دارانہ نظام میں فقر و افلاس کے خاتمے کے لیے موجود معاشی اصولوں کو اسلام کے اسی مسئلے کے لیے تعلیم کردہ الہامی حل کے ساتھ ملا کر دیکھنا اور ان میں مشترک نکات کو اخذ کر کے اس مسئلے کے تدارک کی لیے عملی کوشش کی جاسکتی ہے جو اس پر خطر مسئلے کو حل کرنے میں بہترین لائحہ عمل ثابت ہوگی۔

(۶)۔ موضوع پر سابقہ کام کا جائزہ

اسلامی معاشی نظام کے حوالے سے اب تک کئی کتابیں لکھی جاچکی ہیں اور یونیورسٹی سطح پر بھی اس موضوع پر تحقیقی کام ہوا ہے جس میں اسلامی معیشت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے لیکن فقر و افلاس کے مسئلہ کی وجوہات اور مختلف نظام ہائے معیشت کی نظر میں اس کے حل پر کوئی تحقیقی کام ابھی تک منظر عام پر نہیں آیا اور یہ موضوع تاہنوز تشنہ تحقیق ہے۔ البتہ اسلامی معاشی نظام کے حوالے سے کیے گئے سابقہ کاموں میں سے چند ایک یہ ہیں:

- اقتصاد الفقر: بؤس و ازمات — زید الرمانی
- الزکاۃ فقھھا و أسرارھا وعلاج مشکلۃ الفقر فی الإسلام — محي الدين مستور
- استرتجیۃ مکافحۃ الفقر — سید مرتضی حسین الشیرازی
- مشکلۃ الفقر و سبل علاجھا فی ضؤ الاسلام — عبد الرحمن بن سعد

- دور الزکاۃ فی علاج المشکلات الاقتصادیۃ و طرق نجاحها — یوسف قرضاوی
- من اسباب الفقر والحرمان فی العالم — محمد حسینی شیرازی
- سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے موازنہ — علامہ شمس الحق افغانی
- اسلام میں غربت کا علاج — ڈاکٹر یوسف القرضاوی
- معیشت و اقتصاد کا اسلامی تصور — حکیم محمود احمد ظفر
- اسلام کا معاشی نظام — پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری
- اسلام اور جدید معاشی نظریات — سید ابوالاعلیٰ مودودی
- معاشیات اسلام — مظفر حسین ملاٹھوی
- اسلام کا اقتصادی نظام — محمد حفظ الرحمن سیوہاروی
- محاضرات معیشت و تجارت — ڈاکٹر محمود احمد غازی
- پاکستان میں غربت و افلاس کی کمی میں زکوۃ و عشر آرڈیننس ۱۹۸۰ کا کردار (مقالہ برائے ایم فل، نمل، اسلام آباد)

- The Future of Capitalism — Lester C. Thurow , Nicholas Barclay
- Education and Capitalism — Joseph L. Bast, Herbert J. Walberg
- Capitalism — James D.Forma

(۷)۔اسلوبِ تحقیق

- ❖ مقالے کا اسلوب تحقیق تنقیدی، تحقیقی اور تقابلی ہے۔
- ❖ موضوع تحقیق میں پوری کوشش کے ساتھ اصل ماخذ و مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے۔لیکن موضوع کی ضرورت کے تحت مزید تشریح و توضیح کے لیے ثانوی مصادر و مراجع سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔
- ❖ مقالہ کو معیاری اور سلیس اردو میں تحریر کیا گیا ہے۔ تمام عربی، فارسی اور انگریزی عبارات کا اردو ترجمہ بھی تحریر کیا گیا ہے۔
- ❖ تمام ضروری معلومات حوالہ جات کے طور پر حواشی میں دے دی گئی ہیں۔
- ❖ مقالہ میں آنے والے غیر معروف اسماء و اماکن وغیرہ کا مختصر تعارف بھی حواشی میں دیا گیا ہے۔

- ❖ احادیثِ نبویہ کے حوالے میں کتاب کا نام، مصنف کا نام، ناشر، مقام اشاعت، سن اشاعت، طبع، کتاب اور باب کا نام، حدیث نمبر اور آخر میں جلد اور صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔
- ❖ دیگر کتب کے حوالہ جات میں کتاب کا نام، مصنف کا نام، ناشر، مقامِ اشاعت، سن اشاعت، طبع، اور آخر میں جلد اور صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔
- ❖ ایک کتاب کا دوبارہ حوالہ آنے کی صورت میں کتاب کا نام، جلد اور صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔
- ❖ مقالہ کے آخر میں ضروری فہارس پیش کر دی گئی ہیں۔
- ❖ مصادر و مراجع کی فہرست میں سب سے پہلے اردو کتب، پھر اردو کتب، ان کے بعد انگریزی زبان کی کتابوں اور آخر میں رسائل و جرائد اور ویب سائیٹس کی فہارس پیش کی گئی ہیں۔

باب اول

فقر وافلاس کا مفہوم اور اس کا تاریخی پس منظر

فصل اول: فقر کا لغوی و اصطلاحی مفہوم

فصل دوم: فقر کی اقسام اور اس کا تاریخی پس منظر

فصل سوم: موجودہ دور میں فقر وافلاس-اعداد و شمار کی روشنی میں

فصل اول

فقر کا لغوی و اصطلاحی معنی

مسئلہ فقر و افلاس کے اسباب و علل اور پھر اس کے اثرات و نتائج کو موضوعِ بحث بنانے سے قبل لفظ "فقر" اور "افلاس" کے لغوی و اصطلاحی معنی واضح کرنا زیادہ مناسب ہے تا کہ اس کی روشنی میں اس مسئلے پر سیر حاصل گفتگو کی جا سکے اور فقر و افلاس کے خاتمے کے لیے ممکنہ تجاویز اور حل کی نشاندہی ممکن ہو سکے۔

فقر کا لغوی مفہوم

فقر افعال صحیح میں سے ہے اور اس کے حروف اصلی (ف-ق-ر) پر مشتمل ہیں۔ یہ فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ استعمال ہوتا ہے یعنی "فَقر" اور "فُقر" دونوں اعراب کے ساتھ پڑھا جاتا ہے، البتہ اس کو ضمہ کے ساتھ پڑھنا عربی لغت میں متروک ہو چکا ہے۔[1]

فقر کا استعمال ثروت مندی اور امارت کے بر خلاف تنگدستی اور غربت کے معانی میں ہوتا ہے۔

علامہ زبیدی رقمطراز ہیں:

"الفقر ضد الغنى وقد يضم مثل ضَعف و ضُعف"[2]

ترجمہ: فقر غنا کی ضد ہے۔ اس کو کبھی ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے جیسا کہ ضعف اور ضعف (کہ یہ دونوں الفاظ بھی فتحہ اور ضمہ دونوں کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں)

فقر اپنے قریب المعنی دیگر مفاہیم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "الحاجة"[3] اور "الضيقة"[4] یعنی تنگدستی اور حاجت مندی کے معنی میں۔ بلکہ سمین الحلبی معتقد ہیں کہ فقر کا مصداق وہ حالات ہیں جو ضروریات زندگی کے حوالے سے شدید اور بدترین احتیاج و حاجت مندی کی صورت میں منتج ہوتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"الفقر هو الحاجة الضرورية، بل هو اشد الحاجة"[5]

---

[1] لسان العرب، محمد ابن مکرم ابن منظور افریقی، دار صادر، بیروت، طبع اول 1376ھ، 60/5

[2] تاج العروس من جواہر القاموس، محمد مرتضی حسینی الزبیدی، دار الہدایہ، بیروت، 1965ء، 7/ 354

[3] تہذیب اللغۃ، محمد بن احمد بن الازہری، دار القومیہ العربیہ للطباعۃ، طبع اول 1964ء، 113/9

[4] جمہرۃ اللغۃ، ابو بکر محمد بن الحسن بن درید، دار العلم الملایین، بیروت، طبع اول 1973ء، 910/2

[5] عمدۃ الحفاظ فی تفسیر اشرف الالفاظ، احمد بن یوسف بن عبد الدائم المعروف بالسمین الحلبی، عالم الکتب، بیروت، طبع اول 1973ء، 287/3

ترجمہ: فقر یعنی ضروریات زندگی کے لیے محتاج ہونا۔ بلکہ یہ لفظ شدید ترین حاجت مندی کے لیے بولا جاتا ہے۔

لہذا جب عربوں میں مشہور مقولہ (وشکی الیہ فقورہ)[1] بولا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے کہ فلاں نے اپنی حاجت کو فلاں شخص کے سامنے بیان کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ عربوں کے درمیان رائج دستور کے مطابق جب بھی لفظ فقیر بولا جائے تو اس کا مطلب محتاج ہوتا ہے، امام قرطبی آیہ کریمہ ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ﴾ [2] ترجمہ: اے لوگو! تم (سب) اللہ کے محتاج ہو، کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

" ای المحتاجون الیه فی بقائکم و کل احوالکم" [3]

ترجمہ: اللہ کی طرف فقیر ہونے کا معنی یہ ہوا کہ تم اپنی بقا اور زندگی کے تمام دیگر معاملات میں اللہ کی طرف محتاج ہو۔

یہ سب معانی اگرچہ فقر کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں لیکن اگر دقت نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم یوں ہوتا ہے کہ اس کا اولین استعمال درج ذیل تین معانی میں ہوتا تھا۔ اور پھر رفتہ رفتہ دیگر معانی میں بھی سرایت کر گیا۔ اس لیے کہ ان ابتدائی ترین معانی اور ذکر شدہ دیگر معانی کا آپس میں گہرا ربط اور تعلق پایا جاتا ہے۔

الف: لفظ فقر اور فقیر دراصل (فقرت البعیر) سے ماخوذ ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے اونٹ کی ناک چھید کر اس میں مہار ڈالنا۔ اسماعیل بن عماد لفظ "فقر" کے اس معنی کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

" والفقر ان یحز انف البعیرحتی یخلص الی العظم او قریب منه، ثم یوضع علیه جریر و علیه وتر ملوی یذلل به الصعب ،ومنه قیل عمل به فاقرة "[4]

---

[1] تہذیب اللغۃ، 9/113

[2] سورۃ فاطر: 35/ 15

[3] الجامع لاحکام القرآن، محمد بن احمد بن ابی بکر القرطبی، دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، طبع اول 1952ء، 4/ 215

[4] المحیط فی اللغۃ، الصاحب اسماعیل ابن عباد، عالم الکتب، بیروت، 1994ء، 5/ 402

ترجمہ: اونٹ کی ناک کو چھید کر اور ناک کے نتھنوں کی درمیان والی ہڈی نما دیوار سے ایک رسی کو گزار کر اس کو اپنا مطیع کر دینے کا نام فقر ہے، اسی عمل کے بعد کہا جاتا ہے کہ عمل بہ الفاقرۃ یعنی اونٹ کو مہار پہنا دی گئی۔

گویا جس طرح مہار اونٹ کو پابند کر کے اس کو مالک کی قید میں دے دیتی ہے اسی طرح تنگدستی بھی انسان کو سخت اور دشوار و گزار حالات میں مقید کر دیتی ہے اسی لیے انسان کے سخت مالی حالات کو فقر سے موسوم کیا گیا ہے۔ لہذا جب ناک چھید دی جائے یا کاٹ دی جائے یا رگڑ دی جائے یا زمین کے ساتھ لگا دی جائے تو یہی عالم فقر یعنی عالم غربت ہوتا ہے۔

الازہری انہی معانی کو "فقر" سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

" فاذا حز الانف حزا فذلک الفقر "[1]

ترجمہ: جب ناک چھید دی جائے تو یہی حالت فقر کہلاتی ہے۔

ب: فقر یعنی درخت کاشت کرنے کی غرض سے زمین میں گڑھا کھودنا۔ علامہ جوہری لکھتے ہیں:

" الفقیرحفیریحفرحول الفصیلۃاذاغرست"[2]

ترجمہ: فقیر اس گڑھے کو کہتے ہیں جو درخت لگانے یا کھجور کاشت کرنے کے لیے زمین میں کھودا جاتا ہے۔

بلکہ بعض اوقات فقر کا اطلاق اس سے وسیع تر مفہوم یعنی کسی بھی چیز کے کشادہ ہونے، اس میں شگاف پڑنے یا اس کے پھٹ جانے کے معنی میں عام ہوتا ہے۔

ابن فارس رقم طراز ہیں کہ:

"الفقر یدل علی انفراج فی شئ من عضو او غیر ذلک، من ذلک فقار الظھر، سمیت للحزوز والفصول التی بینھا"[3]

---

[1] تہذیب اللغۃ، 9/115

[2] الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیہ، اسماعیل ابن حماد جوہری، دار العلم الملایین، بیروت، 1410ھ، 2 /783

[3] معجم مقاییس اللغۃ، ابو الحسین احمد بن فارس ابن زکریا، مکتب الاعلام الاسلامی، قم، ایران، 1404ھ، 4 /443

ترجمہ: فقر کسی بھی چیز میں شگاف پڑنے یا پھٹ جانے پر دلالت کرتا ہے، فرق نہیں پڑتا کہ وہ شگاف اعضاء میں ہو یا غیر اعضاء میں۔ اسی سے لفظ فقار الظہر یعنی کمر ٹوٹ جانا ماخوذ ہے۔ (کمر ٹوٹ جانے کو)فقار الظہر مہروں میں پڑ جانے والے شگاف یا باہمی فاصلے کی بنا پر کہا جاتا ہے۔

اسی طرح کسی جگہ سے پانی کے نکلنے کے لیے موجود شگاف کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہے چنانچہ جوہری کہتے ہیں کہ:

"الفقير مخرج الماء من القناة "[1]

یعنی کھالے سے پانی باہر نکلنے کی جگہ فقیر کہلاتی ہے۔

"فقیر" یا" فقر" کے اس معنی سے موجودہ معانی میں بدل جانے کی وجہ فقیر شخص کی زندگی کا بھی شگاف اور فاصلوں سے بھرا ہوا ہونا ہے، جس کو بھرنے کے لیے اس کو مال و دولت دستیاب نہیں ہوتا بلکہ اس کی ضروریات زندگی کا بھنور وسیع سے وسیع تر ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی مماثلت کی وجہ سے شاید یہ لفظ اس معنی میں مستعمل ہوا۔

ج: فقر انکسار الظہر یعنی کمر کے ٹوٹ جانے کے معنی کے طور پر بھی مستعمل ہے۔ اگر اس لفظ کو حروف اصلی یعنی (ف-ق-ر) کی بنیاد پر اس کو عربی معاجم میں دیکھا جائے تو اصل میں اس مادہ کا اطلاق ریڑھ کی ہڈی میں موجود مہروں پر ہوتا ہے۔ لہذا اس ضمن میں لفظ الفقار جو کہ فقر سے ہی ماخوذ ہے کے بارے میں عربی کے مشہور لغت دان خلیل ابن احمد الفراہیدی لکھتے ہیں کہ:

"الفقار منضد بعضه ببعض من لدن العجب الى قحفة الراس"[2]

ترجمہ: انسان کی کھوپڑی سے نیچے کی طرف تہ بہ تہ اور ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہڈی کے مہروں کو فقار کہتے ہیں۔

لہذا فقیر وہ شخص ہوتا ہے کہ: "من كسر فقار ظهره"[3] ترجمہ: جس کی ریڑھ کی ہڈی یا اس کے مہرے ٹوٹ گئے ہوں۔

جوہری نے بھی اس معنی کو ذکر کیا ہے: "الفقير : المكسور فقار الظهر"[4] ترجمہ: فقیر وہ ہوتا ہے کہ جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

---

[1] الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیہ، 2/ 783

[2] کتاب العین، خلیل ابن احمد الفراہیدی، سازمان اوقاف وامور خیریہ، قم، ایران، طبع دوم 1383ھ، 5/150

[3] جمہرۃ اللغۃ، 2/ 784

[4] الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیہ، 2/783

یہیں سے اس ربط کو سمجھا جا سکتا ہے جو "کمر ٹوٹنے" اور "غربت و تنگدستی" کے درمیان پایا جاتا ہے۔ فقیر کا جو معنی اشتقاق کیا گیا ہے وہ دراصل ایسا شخص ہے کہ جس کے اقتصادی حالات ومشکلات اور اس کی غربت و تنگدستی نے اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دی ہو اور معاشرے میں عزت و سربلندی کے ہمراہ کھڑا ہونا اس کے لیے محال بنا دیا ہو۔

ابن فارس بھی اس ربط کے قائل ہیں اور لفظ فقیر کو اسی سے ماخوذ سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"الفقير :المكسور فقار الظهر، و قال اهل اللغة: منه اشتق اسم الفقير و كانه مكسور من ذلته و مسكنته"[1]

ترجمہ: فقیر وہ ہوتا ہے جس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو، اہل لغت کے مطابق اسی سے (یعنی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹنے کے معنی سے) فقیر مشتق ہوا ہے، شاید یہ اس وجہ سے ہے کہ فقیر کی مسکینی اور ذلت کیوجہ سے گویا اس کی کمر ٹوٹ چکی ہوتی ہے۔

انسان اپنی عادی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کے سہارے اور اس میں موجود مہروں کی بدولت حرکت کرنے اور کھڑے ہونے پر قادر ہوتا ہے۔ اگر اس کی ریڑھ کی ہڈی یا مہرے کسی وجہ سے ناکارہ ہو جائیں تو وہ نہ صرف زمین پر کھڑا ہونے میں دقت محسوس کرتا ہے بلکہ بعض اوقات سرے سے حرکت کرنے سے ہی محروم ہو جاتا ہے، اس لیے کہ اس کے مہرے ہی کھڑا ہونے اور حرکت کرنے میں اس کے معاون ہوتے ہیں، لہذا جب مہرے ناکارہ ہو جائیں تو جسم کی حرکت میں مسائل آ جاتے ہیں۔

المکسور فقارۃ الظہر اور فقیر کے درمیان ربط کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ فقیر وہ شخص ہے جس کے فقارۃ الظہر یعنی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے ناکارہ ہو گئے ہوں اور وہ اپنی کمر سیدھی نہ کر سکے اور اپنا بوجھ اٹھا سکنے کے قابل بھی نہ رہے۔

فقیر کے اسی معنی کو ابن منظور افریقی منتخب کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں

:"فالفقير هوالذى نزعت فقره من ظهره ،فانقطع صلبه من شدة الفقر"[2]

ترجمہ: فقیر وہ ہے جس کی کمر کی ہڈی کے مہرے ٹوٹ گئے ہوں اور فقر کی شدت سے اس کا صلب منقطع ہو گیا ہو۔

---

[1] معجم مقاییس اللغۃ، 4/443

[2] لسان العرب، 5/60

اس بنا پر انسان کی اقتصادی و مالی بد حالی کو بیان کرنے اور اس کی غربت و تنگدستی پر دلالت کرنے کے لیے فقیر سے زیادہ دقیق تر اور بہتر لفظ عربی زبان میں موجود نہیں ہے۔

علامہ علی مشکینی کے مطابق لفظ فقیر ان تمام معانی میں استعمال حقیقی رکھتا ہے البتہ اس کا ایک ایسا معنی بھی ہے کہ جس میں ابتدائی طور پر یہ لفظ کنایۃً استعمال ہوا البتہ بعد میں کثرت استعمال کی وجہ سے اس میں بھی "حقیقت" بن گیا ہے۔ اور وہ معنی ہے "ایسا شخص جو مال و دولت نہ رکھتا ہو"۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"والفقر يستعمل فى اللغة والعرف والشرع فيمن لا مال له - و هذا معنى كنائى بالنسبة الجميع معانى لكنها لم تلاحظ الآن فى الاستعمالات لصيرورة اللفظ حقيقة فيه"[1]

ترجمہ: فقیر لغت، عرف اور شرع میں ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کے ہاں (کفایت بھر) مال نہ ہو۔ فقیر کا یہ معنی اس کے باقی تمام معانی کی نسبت کنایہ تھا۔ البتہ اب اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا اس لیے کہ اب فقیر کا لفظ اس معنی میں بھی (سرایت کر گیا ہے اور) استعمال حقیقی رکھتا ہے۔

اب تک بیان کی گئی تمام معروضات سے معلوم ہوا کہ عربی زبان میں مالی ابتری اور اقتصادی بد حالی کے لیے کئی ایک الفاظ مستعمل ہیں جن میں سے کچھ ان معانی میں حقیقت ہیں تو کچھ کنایۃً استعمال ہوتے ہیں، البتہ ان میں سے جب بھی کوئی لفظ ذکر ہو تو تو وہ غربت و تنگدستی پر ہی دلالت کرتا ہے۔

علامہ ہمدانی فقر کے معنی میں استعمال ہونے والے متعدد الفاظ بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"والفقر والعيلة والعالةوالخصاصةوالاملاق والعدم والحاجة والفاقة والمسكنة والمترية واحد"[2]

ترجمہ: فقر، عیلہ، عالہ، خصاصہ، املاق، عدم، حاجۃ، فاقۃ، مسکنہ اور متریہ (عربی زبان کے یہ تمام الفاظ) ایک ہی معنی میں مستعمل ہیں۔

---

[1] مصطلحات الفقہ، علی مشکینی، موسسہ دار الحدیث العلمیہ والثقافیہ، قم، ایران، طبع 1434ھ، ص407

[2] کتاب الفاظ الاشباہ والنظائر، عبد الرحمان ابن عیسی ہمدانی، دار المعارف، قاہرہ، 1981ء، ص130

فقر کا اصطلاحی مفہوم

فقر اور فقیر دونوں کی گوناں گوں اور متعدد تعریفات مختلف دانشوروں اور علماء کی طرف سے وارد ہوئی ہیں۔ شائد اس کی ایک وجہ زمان و مکاں کے بدلنے کی وجہ سے انسان کے تصورات فقر کا بدل جانا ہے۔ لہذا جتنے اور جس قدر تصورات فقر اس دنیا میں موجود تھے اسی قدر اور اتنی ہی مختلف قسم کی تعریفیں وجود میں آئی ہیں۔ البتہ بیان کی گئی ان تمام تعریفوں میں باہم تضاد نظر نہیں آتا بلکہ بعض تعریفیں بعض دیگر کا تکملہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ اور ان کا ظاہری اختلاف صرف اس وجہ سے نظر آتا ہے کہ مختلف شخصیات نے مسئلہ فقر کو مختلف پہلوؤں اور جہات سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، مثلاً کسی کی نظر اقتصادی ہے تو کسی کی سیاسی، کچھ لوگوں نے اس کو اجتماعی و معاشرتی نگاہ سے دیکھا ہے تو بعض دیگر ثقافتی مسئلے کے طور پر اس کی تعریف بیان کی ہے۔ البتہ یہ سب تعریفات فقر کے ظاہری معنی و مفہوم کے گرد ہی گھومتی ہیں اور اسی پر مرتکز ہیں۔

ذیل میں ان میں سے مہم بعض تعریفیں بیان کی جاتی ہیں۔

علامہ جرجانی رقم طراز ہیں کہ:

" الفقر: عبارة عن فقد ما يُحتاج إليه؛ أما فقد ما لا حاجة إليه فلا يسمى فقرًا "[1]

ترجمہ: فقر کا مطلب ہے کہ انسان کے پاس وہ چیزیں ناپید ہوں کہ جن کی طرف وہ محتاج ہوتا ہے۔ البتہ ان چیزوں کا ناپید ہو جانا کہ جن کی طرف وہ محتاج ہی نہیں، فقر نہیں کہلاتا۔

فقر کا معنی معلوم ہو جانے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ فقیر اسی سے ماخوذ ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے ایسا ضرورت مند جو روحانی یا دنیاوی اعتبار سے محتاج ہو۔[2]

علامہ شبلی کا قول ہے کہ:

"الفقير من لا يستغنى بشىء دون الله"[3]

ترجمہ: فقیر ہے جو خدا کے سوا اور کسی ذریعہ سے مستغنی نہیں ہوتا۔

---

[1] کتاب التعریفات، علی ابن محمد جرجانی، دارالکتاب المصری، بیروت لبنان، 1991ء، ص73

[2] اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور، طبع 1988ء، 2/1089

[3] اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، طبع اول 1975ء، 15/442

فقر کے اصطلاحی مفہوم کو جاننے کے لیے علم الاجتماع کی قوامیس کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فقر ضرورت مندی اور حاجت مندی کی تمام اشکال اور صورتوں کو شامل ہے اور کسی فرد یا معاشرہ کی ایسی حالت پر فقر کا مفہوم منطبق ہوتا ہے کہ جس میں وہ اپنی ضروریات زندگی (بشمول غذا، ملبس اور مطعم وغیرہ) کے حصول سے عاجز آجائیں کہ جس سے اس کا ذاتی عزت و احترام بھی مجروح ہو اور اس کی معنوی و روحانی زندگی بھی۔ چنانچہ ابراہیم مذکور لکھتے ہیں:

"وهذه الحالة (ای الاحتیاج)سواءکانت فی المادیات اوالمعنویات، قد یکون فی المال او فی الثقافة او المعرفة- واذا احتیاج الانسان الی ای شیء یکمل به النفس یشعر به الحرمان والقلة فهو فقیر فی هذاالشیءاو مفتقر الیه"[1]

ترجمہ: انسان چاہے مادی حوالے سے محتاج ہو یا معنوی حوالے سے اس کی یہ احتیاج کبھی مال و دولت میں ہوتی ہے اور کبھی ثقافت و معرفت میں۔ لہذا جب بھی انسان کسی ایسی چیز کا محتاج یا ضرورت مند ہو جس سے اس کی مالی بدحالی ختم ہو سکے اور اس کی محرومیت کا بھی خاتمہ ہو سکے تو (ایسی حالت کے بارے میں) کہا جائیگا کہ وہ فلاں چیز کے فقر میں مبتلا ہے اور اسی حوالے سے فقیر بھی کہلائے گا۔

لہذا فقیر ایسا شخص ہوا کہ جس کو اپنی مالی حالت سنوارنے اور اپنی حوائج و ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کسی غیر کی طرف دیکھنا پڑے اور اس کی مدد کی بھی ضرورت پڑے اور ایسے افراد نہ ملنے کی صورت میں وہ

خود آزاد اور خود مختار حیثیت میں اپنی حالت کے بدلنے پر قادر نہ ہو، چنانچہ ابن عمارہ فقیر کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ:

"والفقیر هوالذی تتوقف ذاته، او تتوقف هیئات متمکنة فی ذاته، او تتوقف هیئات کمالیة له فی ذاته علی غیره- و ذلك بخلاف الغنی الذی لا تتوقف ذاته ولا یتوقف کماله علی غیره لغناه عن الغیر"[2]

ترجمہ: فقیر وہ ہوتا ہے جس کی ذات یا اس کی ذات میں پائی جانے والی تمام ممکنہ خصلتیں اور خوبیاں یا اس کی ذات کے تمام کمالات و اختیارات اس کی بجائے کسی غیر پر منحصر و موقوف ہوں بخلاف غنی شخص کے کہ اس کی ذات اور اس میں پائی جانے والی خصلتیں اور کمالات آزاد ہوتے ہیں اور کسی غیر پر موقوف نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ وہ دوسروں سے بے نیاز ہوتا ہے۔

---

[1] معجم العلوم الاجتماعیہ، ابراہیم مذکور، الهیئة العامة للکتاب، 1975ء، ص433

[2] قاموس الاصطلاحات الاقتصادیة فی الحضارة الاسلامیہ، محمد عمارہ، دارالشرف، بیروت، طبعہ اولی 1993ء، ص435

فقر کے لغوی معانی ہوں یا اصطلاحی، اکثر و بیشتر حضرات نے اس کا معنی "حاجتمندی" یا "احتیاج" کے ساتھ کیا ہے۔ علامہ راغب اصفہانی نے فقر کے ضمن میں موجود حاجت کی خوبصورت، بہترین اور مدلل تشریح بیان کی ہے۔ ان کے نزدیک فقر اپنے اندر احتیاج کے چار مختلف پہلوؤں کو شامل ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"الفقر يستعمل على اربعة اوجه"[1]

ترجمہ: فقر کا استعمال چار طرح سے ہوتا ہے۔

الف: وجود الحاجة الضرورية۔ یعنی زندگی کی بنیادی ترین ضروریات کا نہ پایا جانا اور ان میں بھی حاجت مند ہونا۔ اس اعتبار سے نہ فقط انسان بلکہ کائنات کی ہر چیز فقیر ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ **يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ** ﴾[2]

ترجمہ: اے لوگو! تم (سب) اللہ کے محتاج ہو۔

(ب): عدم المقتنيات۔ یعنی ضروریات زندگی کا کماحقہ پورا نہ ہونا۔

(ج) فقر النفس: یعنی فقر روحی یا مال کی ہوس۔ چنانچہ اسی بارے میں اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا:

((كاد الفقر ان يكون كفرا))[3]

ترجمہ: کچھ تعجب نہیں کہ فقر کفر تک پہنچا دے

اس کے مقابل میں غنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((الغنى غنى النفس))[4]

ترجمہ: غنیٰ تو نفس کی بے نیازی کا نام ہے۔

(د) الفقر الى الله۔ یعنی اللہ کی طرف احتیاج، ایک اور قرآنی دعا میں یوں دعا مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔:

---

[1] المفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، قدیمی کتب خانہ کراچی، ص385

[2] سورۃ فاطر:15/35

[3] حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، احمد ابن اسحاق حافظ ابونعیم اصفہانی، السعادۃ-بجوار محافظۃ مصر،1394ھ،53/3

[4] صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل بخاری، دار طوق النجاۃ، 1422ھ، کتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس، حدیث نمبر6446، ص95/8

﴿ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ ﴾[1]

ترجمہ: پروردگارا تمہاری طرف سے جو نعمتیں اور اچھائیاں مجھ پر نازل ہوتی ہیں میں ان سب کا محتاج ہوں۔

اللہ کی طرف یہ محتاجی جب خالقِ کائنات کی احتیاج کے ساتھ ساتھ دنیا سے بے نیازی کے رویے میں بدل جائے تو اس کے لیے بھی "فقر" کی اصطلاح استعمال کی کی جاتی ہے، خاص کر اقبال نے اس اصطلاح کو اپنی شاعری میں جابجا استعمال کیا ہے اور بعض اوقات اس کے لیے "درویشی" اور "قلندری" جیسے الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ وہ فقر جو خدا کا محتاج بندا تو بنائے لیکن اس کی مخلوقات اور جو کچھ اُن کے ہاتھوں میں ہے اس سے بے نیاز کردے وہ یقیناً قابلِ ستائش ہے۔ چنانچہ اقبال لکھتے ہیں:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری
اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری
اک فقر ہے شبیری، اُس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانیؑ سرمایہ ءشبیری[2]

اقبال اس "فقر یا فقیری" کو انسان کی بلندی کی معراج کے طور پر پیش کرتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

فقر کے ہیں معجزات، تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر، فقر ہے شاہوں کا شاہ[3]

وہ فقر جس کو اقبال یا صوفیاء قابلِ ستائش کہتے ہیں اس سے مراد ترکِ دنیا اور دنیوی وسائل و اسباب سے دوری نہیں بلکہ اپنے دل کو دنیا کی محبت سے خالی کرنا اور اس سے بے نیاز ہو جانا ہے۔ اپنے فارسی کلام میں لکھتے ہیں:

---

[1] سورۃالقصص:24/28

[2] کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، محمد اقبال، مکتبہ دانیال، لاہور، طبع و سن ندارد، ص:377

[3] کلیاتِ اقبال، بالِ جبریل، محمد اقبال، ص:309

فقرِ مومن چیست؟ تسخیرِ جہات
بندہ از تاثیرِ اُو مولیٰ صفات
فقر بر کرّوبیاں شب خوں زَنَدُ
بر نوامیسِ جہاں شب خوں زَنَدُ[1]

چنانچہ دنیوی معاملات اور بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم ہونا اوران لیے دست نگر ہو جانا نہ تو مقصد ہے اور نہ ہی قابلِ ستائش نہیں، بلکہ اس فقر و تنگدستی کا ادراک اور پھر اس کا تدارک ضروری ہے تا کہ تمام محرومیوں سے نکل کر شرفِ انسانیت کے رستے پر چلا جاسکے اور خدا کے در پر جھکا جاسکے۔ جیسا کہ تیسرے باب میں اس پر تفصیل سے بات ہو گی۔

علامہ ابن تیمیہ نے فقر کی تعریف کرتے ہوئے اس کے ضمن میں معاشرے میں رائج فقیر کو ظاہری حلیے اور شکل وشباہت کے ذریعے پہچاننے کے طریقے کو ایک غلط روش قرار دیا ہے اور اس کو رد کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"الفقير الشرعی المذكور فی الكتاب والسنة اللذی يستحق من الزكاة والمصالح و نحوهما ليس هو الفقير الاصطلاحی اللذی يتقيد بلبسة معينة و طريقة معينة، بل كل من ليس له كفاية تكفيه و تكفی عياله -فهو من الفقراء والمساكين"[2]

ترجمہ: فقیر شرعی، جس کا کتاب و سنت میں تذکرہ ہوا ہے اور جو زکاۃ اور دیگر مصالح اسلامی کا مستحق ہوتا ہے، کا اطلاق اس فقیر اصطلاحی پر ہرگز نہیں ہوتا جس کو خاص لباس اور مخصوص وضع قطع کی بدولت فقیر کہا جاتا ہے بلکہ فقیر شرعی وہ ہوتا ہے کہ عائلہ کی ضروریات کی تکمیل کی خاطر کفایت بھر دولت کا مالک نہیں ہوتا۔ لہذا ایسا شخص فقراء اور مساکین میں سے شمار ہو گا (نہ کہ ظاہری حلیے اور شکل وشباہت والا)۔

اس کے بعد ابن تیمیہ فقیر و مسکین میں امتیاز کے باب میں اس بات پر تاکید کرتے ہیں کہ افراد کی ظاہری شکل وشباہت پر ہرگز حکم فقر کا اطلاق نہ کیا جائے بلکہ اگر کوئی شخص ظاہرا اچھا لباس ہی کیوں نہ زیب تن کیے ہوئے ہو لیکن اگر وہ اپنی حالت کے عین مطابق اور مناسب کسب پر قادر نہ ہو تو ایسا شخص بھی فقیر کہلائے گا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] کلیاتِ اقبال فارسی پس چہ باید کرد، فقر، محمد اقبال، ص:147

[2] مجموع الفتاوی، احمد ابن عبد الحلیم بن تیمیہ، مجمع الملک فهد لطباعة المصحف الشریف، المدینة النبویة، المملكة العربية السعودية، 1995ء، 28/569

"وقد تنازع العلماء :هل الفقير اشد حاجة او المسكين- اوالفقير من يتعفف والمسكين من يسال- على ثلاثة اقوال؛ واتفقوا على ان من لا مال له و هو عاجز عن الكسب فانه يعطى ما يكفيه- سواء كان لبسه لبس الفقير الاصطلاحی او لباس الجند والمقاتلة"[1]

ترجمہ: علماء کی آراء میں اس بارے میں اختلاف وارد ہوا ہے کہ فقیر زیادہ شدید محتاج ہوتا ہے یا مسکین؟ اور کیا فقیر وہ ہوتا ہے جو ضرورت کے باوجود سوال نہ کرے جب کہ مسکین اپنا ہاتھ سوال کے لیے پھیلا دیتا ہو؟ اس بارے میں تین اقوال موجود ہیں۔ لیکن تمام علماء اس بارے میں متفق ہیں کہ جس کے ہاں (کفایت بھر) مال میسر نہ ہو نیز وہ (اپنی ضروریات کی مقدار کے برابر) مال کمانے سے بھی عاجز ہو تو اس کو اس کی ضروریات کی مقدار کے برابر عطا کیا جائے گا چاہے اس کا لباس ظاہری فقراء جیسا ہو یا لباس الجند والمقاتلہ ہو۔

فقر کے معنی اور مفہوم کے مسئلے میں علامہ قسطلانی کی رائے بھی ابن تیمیہ کی رائے کے موافق نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"فانه (يعنى الفقير)الذى لا مال له اصلا او يملک ما لا يقع موقعا من كفايته، كثلاثة من عشرة"[2]

ترجمہ: فقیر ایسا فرد ہوتا ہے کہ جو سرے سے کسی قسم کی مال و دولت کا مالک نہ ہو، یا وہ اتنے مال کا مالک ہو جو اس (کی ضروریات زندگی) کے لیے کفایت نہ کرتا ہو۔ مثلاً اس کی ضرورت دس (درہم) ہو جب کہ اس کے پاس صرف تین ہوں۔

البتہ ان کے برخلاف طبری کے نزدیک فقراء کے مصادیق کے لیے ایک شرط ضروری ہے، یہی شرط فقراء اور مساکین کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے اور یوں ان دونوں میں واضح فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

چنانچہ طبری رقم طراز ہیں کہ:

---

[1] مجموع الفتاوی، 570/28

[2] ارشاد الباری شرح صحیح البخاری، شہاب الدین احمد بن محمد القسطلانی، دار الفکر، بیروت، طبع 1990ء، 688/3

"المراد بالفقير المحتاج المتعفف عن المسئلة- والمسكين :المحتاج السائل [1]-كما قال تعالی فی شان الیهود ﴿ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ﴾ [2]

ترجمہ: فقیر سے مراد ایسا شخص ہے جو محتاج ہو مگر لوگوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔ جبکہ مسکین ایسا شخص ہے جو محتاج ہو اور لوگوں سے سوال کرے۔ جیسا کہ اس آیہ کریمہ میں پروردگار یہود کی بابت فرماتا ہے:" اور (انجام کار) ان پر ذلت وخواری اور افلاس وناداری مسلط ہو گئی۔

علماء اور محدثین کی تعاریف میں ایک لفظ "یقع موقعا من کفایتہ" قابل توجہ بھی ہے اور وضاحت طلب بھی۔

اس کا معنی یہ ہے کہ فقراء ایسے افراد ہوتے ہیں کہ جن کی کل ملکیت میں اپنے اور اپنے واجب النفقہ تمام افراد کے مقام و منصب کے لائق کھانا، پینا، لباس، مکان اور اپنی تمام دیگر ضروریات کے لیے مال موجود ہو نہ ہی کوئی ذریعہ معاش، البتہ تمام اخراجات میں نہ تو فضول خرچی کرتا ہو اور نہ ہی کوتاہی۔ مثلاً ایک شخص کہ جس کی یومیہ ضرورت دس ریال ہو مگر وہ دو تین یا چار ریال ہی کما پائے۔

معلوم ہوا کہ فقر وغربت ایک نسبی یا اضافی امر ہے جس کا تعلق ہر شخص سے اس کے مقام ومرتبہ اور اس کے منصب کے حساب سے ہے۔ ان اکائیوں کے بدلنے کی وجہ سے مختلف اشخاص اور مختلف زمان و مکان میں اس کا معیار الگ ہو جاتا ہے۔ لہذا عین ممکن ہے کہ مثلاً ایک شخص کی کل ملکیت ایک لاکھ روپے مالیت پر مشتمل ہو اور یہ ایک لاکھ روپیہ اس کے مقام کے لحاظ سے اس کی تمام ضروریات کے لیے ناکافی ہو لہذا اسی وجہ سے وہ فقیر شمار ہو۔ جب کہ اس کے قریب ہی رہنے والا دوسرا شخص اسی قدر مالیت کا مالک ہے اور یہ مال اس کی حاجات کے لیے کافی ہے لہذا اس کا شمار فقراء میں سے نہ ہو، یہی " یقع موقعا من کفایتہ" کے الفاظ کی تفسیر ہے۔

یا بالفاظ دیگر افراد معاشرہ کی حیثیت کے مطابق ان کے پاس وسائل کا موجود نہ ہونا فقر کہلائے گا۔ درج ذیل تعریف اسی مطلب کی طرف اشارہ کرتی ہے:

---

[1] جامع البیان فی تاویل القرآن، محمد ابن جریر طبری، موسسۃ الرسالۃ، طبعہ اولی 1420ھ، 14/305

[2] سورۃ البقرۃ:2/61

"ان الفقر يعنى الحرمان على اشده .بحيث لا يمكن الحصول على الحاجات الاساسيةللعيش الا نادرا"[1]

ترجمہ: فقر یعنی شدید ترین محرومی، اس حد تک محرومی کہ چند ایک اشیاء کے علاوہ زندگی کی بنیادی اور اساسی ضروریات کا حصول بھی ناپید و ناممکن ہو جائے۔

مذکورہ تمام تعریفوں کا مرکزی نکتہ روٹی، کپڑا اور مکان یا پھر زیادہ سے زیادہ اساسی اور بنیادی ضروریات زندگی تھا لیکن مشہور محقق و دانشور حسین عبدالحمید رشوان فقر کو فقط بھوک و پیاس اور ننگ و عار ہی میں منحصر نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک فقر کا دائرہ کار اس کی نسبت کہیں زیادہ وسیع اور اس کے اثرات و نتائج اس سے بڑھ کر بھیانک اور خطرناک ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"الفقر هو العوذ والحاجة، فمن الناس من لا يملک الا اقل القوت، فالفقر ليس الجوع الى الماکل والعرى الى الکسوى فقط،ولکنه کذلک القهر- فهو وسيلة لازلال الروح وقتل الحب وزرع البغضاء"[2]

ترجمہ: فقر احتیاج و حاجت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لوگوں میں سے ایسے افراد بھی ہیں جن کے پاس مال کی نہایت قلیل مقدار ہے، لہذا فقر فقط کھانے کی بھوک اور تن ڈھانپنے کے لیے کپڑوں کی احتیاج پر ہی منحصر نہیں بلکہ اس کے علاوہ یہ عذاب و قہر بھی ہے اور روح انسان کی تذلیل و تحقیر کا وسیلہ اور سبب بھی، محبت و اخوت کے اٹھ جانے اور نفرتوں کی ایجاد کی وجہ بھی یہی فقر ہے۔

مذکورہ تعریف زندگی کی بنیادی ضروریات یعنی روٹی کپڑا مکان کے علاوہ دیگر حاجات مثلاً صحت، تعلیم اور امن عامہ کے ساتھ ساتھ تعقل اور تفکر و تدبر کی عدم موجودگی کو بھی فقر سے تعبیر کرتی ہے۔ ڈاکٹر رشوان ہی نہیں بلکہ ہمارے معاصر دانشور اور ماہر معاشیات ڈاکٹر محمد شحاتیت قائل ہیں کہ فقر کی تعریف کے حوالے سے ہمارے پاس کوئی متفق علیہ تعریف اور اس کو جاننے کا کوئی خاص طریقہ موجود ہی نہیں ہے کہ جس پر سب علماء اور دانشوروں کا اتفاق ہو لیکن وہ خود فقر کی جس تعریف کو پیش کرتے ہیں اس کا دائرہ کار بھی عبدالحمید رشوان کی تعریف کی طرح تمام جہات فقر کو شامل ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

---

[1] خصائص الفقر والازمات الاقتصادیہ فی العالم الثالث، علی وہب، دار الفکر، بیروت، 1996ء، ص140

[2] اضواء علی الحیاۃ الاجتماعیہ، حسین عبدالحمید رشوان، المکتب الجامعی الحدیث، الاسکندریہ، 1999ء، ص94

"الفقر هو عدم الحصول على الغذاء الكافي، و ارتفاع وفيات الاطفال الرضيع،و انخفاض المعدل الحياة،و قلة فرص التعليم، و عدم توافر مياه الشراب آمنة، و عدم كفاية الرعاية الصحية، و سو ء ظروف المسكن والحياة"[1]

ترجمہ: فقر غذا کی قلت کا نام ہے،اس کے علاوہ دودھ پینے والے بچوں کی شرح اموات میں اضافہ،معیار زندگی کا گر جانا، تعلیمی اداروں اور تعلیم کے مواقع کا (مطلوبہ تعداد سے) کم ہونا،صاف پانی کی عدم دستیابی، صحت کی مناسب سہولتوں کا فقدان، اچھی اور مناسب رہائش کا مہیہ نہ کر سکنا یہ سب فقر کا ہی دوسرا نام ہیں۔

ان تمام تعریفات میں تامل و تفکر اور غور و فکر کرنے کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ ایسی حالت جس میں انسان کے پاس باعزت زندگی گزارنے کے وسائل اور مواقع میسر نہ ہوں اور اس کے پاس مال و دولت کی وہ کم ترین مقدار بھی موجود نہ ہو کہ جس سے اس کی روزمرہ زندگی اور معیشت چلتی رہے، فقر کہلاتی ہے۔ اور ایسا شخص جو ان حالات سے گزر رہا ہو فقیر کہلائے گا۔

انگلش میں "فقر" کے لیے "Poverty" کے لفظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا مطلب بھی عربی زبان کے معانی سے میل کھاتا ہے۔ چنانچہ Encyclopedia Britannica میں Poverty کی تعریف کو یوں بیان کیا گیا ہے:

"Poverty, The state of one who lacks a usual or socially acceptable amount of money or material posessions. Poverty is said to exist when people lack the means to satisfy their basic needs."[2]

ترجمہ: بھی شخص کی ایسی مالی حالت میں جس میں وہ معاشرے کے دیگر افراد کی نسبت معمول سے کم مال و دولت، آمدن اور ملکیت کا حامل ہو جو اس کی روزمرہ زندگی کی سہولیات اور ضروریات کو میسر کرنے کے لیے ناکافی ہوں۔ غربت (کی وجوہات) کے بارے یہ کہا جا سکتا ہے کہ غربت معاشرے میں تب ظاہر ہوتی ہے جب لوگوں کے پاس اپنی بنیادی ضروریات زندگی کے پورا کرنے کے لیے عوامل ناکافی ہوتے ہیں۔

---

1 موشرات الفقر فی الاردن، ڈاکٹر محمد شحاتیت، جامعہ الامیرہ سمیہ، طبع ندارد، ص4

2 Encyclopedia Britticana, USA Chicago, 15th Edition 2005, vol 9, pg 652

اس تعریف کے مطابق کسی بھی شخص کے ذرائع آمدن کا اس کی غربت میں بنیادی طور پر عمل دخل ہوتا ہے، لہذا اگر اس کی آمدن کے وسائل وذرائع اگر اس کی بنیادی انسانی ضروریات کا بوجھ اٹھانے کے لیے ناکافی ہوں تو ایسا شخص "فقیر وغریب" افراد کے زمرے میں آئے گا۔ The World Book Encyclopedia کے مطابق فقر یعنی Poverty کی تعریف کچھ یوں ہے:

> "Poverty is the lack of enough income and resources to live adequately by community standards. Many poverty stricken people cannot afford the food, shelter, clothing and medical care they need."[1]
>
> ترجمہ: سماج اور معاشرے کے معیار کے مطابق مناسب طرز زندگی اور رہن سہن کے لئے وسائل کی کمی اور ناکافی آمدن کا ہونا فقر و غربت کہلاتا ہے۔ پس غربت سے متاثرہ افراد غذا، لباس، صحت اور رہائش کا ناکافی سہولیات سے متاثرہ ہیں۔

اس تعریف کے مطابق ناکافی آمدن ہی غربت کی وجہ اور اس کی ایک نشانی ہے۔ جب افراد کے پاس ان کی ضروریات کے مطابق وسائل اور آمدن موجود نہیں ہوتی تو ان کی ضروریات ایک ایک کرکے ادھوری رہنا شروع ہو جاتی ہیں، ان کی غذا تعلیم، صحت، رہائش غرضیکہ تمام ضروریات زندگی سے محرومی بڑھنے لگ جاتی ہے جس کی وجہ سے غربت و افلاس کے سائے مزید گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

بلاشبہ غربت ایک تکلیف دہ امر ہے، صرف اس لیے نہیں کہ اس کی وجہ سے افراد بھوک و افلاس، سردی و بیماری وغیرہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں بلکہ اس وجہ بھی سے کہ فقر و افلاس افراد کو احساس کمتری میں دھکیل دیتا ہے اور ان کی خود اعتمادی اور شخصیت کو بری طرح اثر انداز کرتا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ ان کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اخلاقی احساسات و جذبات کی تھیوری میں موجودہ معیشت کے بانی سمجھے جانے والے ایڈم سمتھ (Adam Smith) کا کہنا ہے کہ ایک انسان ہونے کے ناطے ہم سب کی خواہش ہوتی ہے کہ معاشرے کے تمام افراد ہماری طرف متوجہ رہیں اور ہمیں احترام و اکرام سے پیش آئیں۔ انسانی معاشرے کے یہی احساسات و جذبات وجہ بنتے ہیں کہ ہم دولت کی پیروی کرتے ہیں دولت مند بننا پسند کرتے ہیں اور غربت سے بچنا چاہتے

[1] The World Book Encyclopedia, Scott Fetzer Company, Chicago, vol:15, p.721

ہیں، چونکہ غربت کی وجہ سے غربت زدہ افراد کو معاشرے میں نہ صرف دھتکار دیا جاتا ہے بلکہ عزت وتوقیر کے معاملے میں بھی وہ عام افراد کے برابر نہیں سمجھے جاتے۔

جدید معاشیات کے بانی سمجھے جانے والے ایڈم سمتھ (Adam Smith) نے دو سو سال قبل اپنی کتاب میں غربت کے بارے میں لکھا کہ غربت فقط ایک ایسی حالت کا ہی نام نہیں جس میں انسان کے پاس بنیادی ضروریات کے لیے کچھ بھی میسر نہیں ہوتا بلکہ ان کے نزدیک کسی بھی معاشرے کی روایات کو پورا نہ کرسکنے کی حالت فقر و غربت کہلاتی ہے۔ وہ اپنی مشہور زمانہ کتاب Wealth of Nations میں لکھتے ہیں کہ:

"A linen shirt, for example, is, strictly speaking, not a necessary of life. The Greeks and Romans lived, I suppose, very comfortably, though they had no linen. But in the present times, through the greater part of Europe, a creditable day-laborer would be ashamed to appear in public without a linen shirt, the want of which would be supposed to denote that disgraceful degree of poverty, which, it is presumed, nobody can well fall into without extreme bad conduct."[1]

حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھیں تو نفیس سوتی قمیض زندگی کی اشد ضروریات میں شمار نہیں ہے، مثال کے طور پر یونانیوں اور رومیوں نے بہت آرام دہ اور پر سکون زندگی گزاری اگرچہ ان کے پاس نفیس سوتی لباس نہ تھے۔ لیکن موجودہ دور میں یورپ کے اکثر و بیشتر علاقوں میں ایک مزدور کے لیے بھی نفیس سوتی لباس زیب تن کیے بغیر عوام میں جانا شرمندگی کا سبب ہوتا ہے، کیونکہ (اچھا اور نفیس سوتی لباس نہ پہن سکنا غربت کی علامت ہے اور) وہ غربت کی وجہ سے پیش آنے والے غیر محترمانہ رویے سے بچنا چاہتا ہے، لہذا انتہائی برے حالات کے علاوہ کوئی بھی اس (فقر و غربت) کا سامنا کرنے کو تیار نہیں ہے۔

گویا کہ مذکورہ مثال میں ایڈم سمتھ (Adam Smith) نے غربت کی تعریف ایک مثال کے ذریعے کی ہے۔ پس حالیہ دنوں میں ایڈم سمتھ کی سوتی شرٹ ممکنہ طور پر ایک موبائل فون، مناسب کپڑے اور جوتے، رہائش کے لیے مناسب گھر اور پیغام رسانی کی جدید ٹیکنالوجی تک رسائی ہو سکتی ہے۔ چونکہ موجودہ معاشرے میں ان اشیاء کے بغیر رہنے والا شخص محروم طبقے میں شمار ہوتا ہے اور محروم طبقے میں شمار ہونے کی وجہ سے اس کو معیاری زندگی گزارنے اور مناسب کام کے حصول کے لیے بہت ساری رکاوٹیں اور مشکلات پیش آسکتی ہیں۔

---

[1]An Inquiry Into the Nature and Causes of the Wealth of Nations, Adam Smith, Lincoln & Gleason Printers, 1804, Volume 2, pp 296

اگرچہ ایسے افراد کے پاس زندہ رہنے کے لیے خوراک، اور رہنے کے لیے رہائش تو موجود ہے لیکن چونکہ وہ معاشرے کی ان روایات اور اقدار کو پورا کرسکنے کی قدرت اور طاقت نہیں رکھتے جس کی معاشرے کے افراد کو ان سے توقع ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ یہ افراد خود کو دیگر افراد کی نسبت کم تر محسوس کرتے ہیں۔ گویا کہ ایڈم سمتھ کے نزدیک غربت اقتصادی حوالے سے عدم مساوات کا نتیجہ ہے اور اس کی موجودگی ان معاشروں میں زیادہ ہوتی ہے جہاں عدم مساوات کے مسائل زیادہ ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ سمتھ غربت کے علاج، تدارک اور سدباب کے لیے انہی چیزوں کے اندر سے حل تجویز کرتا ہے، چونکہ غربت کی وجہ یہی مسائل ہیں۔ چنانچہ ایڈم سمتھ غربت کا حل فقراء و غرباء کی صلاحیتوں کے اندر دیکھتا ہے۔

فقر کی تعریف فقہاء کی نظر میں

فقہاء کے مابین فقر کی تعریف میں اختلاف واقع ہوا ہے اور فقراء کے مصداق کے بارے ان میں متعدد آراء پائی جاتی ہیں۔ ان کے اختلاف کی بنیاد قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جو صدقہ اور انفاق وغیرہ کا مستحق فقراء اور مساکین کو قرار دیتی ہیں۔ چنانچہ فقہاء کے درمیان "فقراء اور ان کی حدود کے تعین" میں اختلاف رونما ہوا ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾[1]

ترجمہ: ترجمہ: صدقات (مالِ زکوٰۃ) تو اور کسی کے لئے نہیں صرف فقیروں کے لئے ہے مسکینوں کے لئے ہے اور ان کارکنوں کے لئے ہے جو اس کی وصولی کے لئے مقرر ہیں۔ اور ان کے لئے ہے جن کی (دلجوئی) مطلوب ہے۔ نیز (غلاموں اور کنیزوں کی) گردنیں (چھڑانے) کے لئے ہے اور مقروضوں (کا قرضہ ادا کرنے) کے لئے ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لئے ہے اور مسافروں (کی مدد) کے لئے ہے یہ اللہ کی طرف سے فرض ہے اور اللہ بڑا جاننے والا، بڑا حکمت والا ہے۔

اب اس آیہ اور اس طرح کی دیگر آیات کے حوالے سے فقہاء میں فقراء (جو کہ مستحق صدقات ہیں) اور اغنیاء (جو صدقہ وغیرہ کے مستحق نہیں ہیں) کی تعریف میں اختلاف آراء سامنے آتا ہے۔ اس اختلاف کا ثمرہ صدقہ کے ابواب اور صدقہ کے مستحقین کے ابواب میں ظاہر ہوتا ہے۔

---

[1] سورۃ التوبہ:9/60

لہذا فقراء کی تعریف اور ان کے وصف کے حوالے سے فقہاء میں چند آراء موجود ہیں۔

احناف کی نظر میں فقر کا مفہوم

احناف قائل ہیں کہ فقیر وہ ہوتا ہے کہ:

"من له ادنی شیء ای دون النصاب او قدرالنصاب غیر تام، مستغرق فی الحاجة"[1]

ترجمہ: فقیر وہ ہے جس کے پاس تھوڑی سی یعنی نصاب زکاۃ سے کم تر اشیاء موجود ہوں۔ اور اس کا مال نصاب کی مقدار تک نہ پہنچا ہو۔ اور شدید احتیاج کی حالت میں ہو۔

بظاہر تو یہ تعریف بہت سادہ ہے مگر دقت نظر سے مشاہدہ کیا جائے تو احناف کے نزدیک فقیر کون ہے اور فقر کیا ہے اس بات کو جاننے کے لیے فقہ حنفی میں نصاب زکاۃ کو جاننا ہو گا کہ جس کی عدم موجودگی پر کوئی شخص فقیر کہلانے کا اہل ہوتا ہے۔

کتب فقہ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ احناف کے نزدیک نصاب زکاۃ دو سو درہم چاندی یا بیس مثقال سونے کی ملکیت کا ہونا ہے۔[2]

جب کہ ایک گرام چاندی کا وزن (عند الحنفیہ) 3.125 گرام ہے[3]۔ لہذا 625=3.125*200

اس طرح حنفی مسلک کے نزدیک چاندی کا نصاب کہ جس پر زکاۃ واجب ہو جاتی ہو 625 گرام ہوا۔

جب کہ ایک مثقال سونا 4.25 گرام کے مساوی ہوتا ہے[4]۔ لہذا 85=4.25*20

اس طرح حنفی مسلک کے نزدیک سونے کا نصاب کہ جس پر زکاۃ واجب ہو جاتی ہے 85 گرام سونا ہوا۔

اب یہاں پہنچ کر تفصیلی نتیجہ لیا جا سکتا ہے کہ احناف کے نزدیک فقیر ایسا شخص ہے کہ جو 625 گرام چاندی یا 85 گرام سونے یا ان کے برابر کی مالیت کی کسی چیز کا مالک نہ ہو۔ ایسے شخص کو فقیر سمجھا جائے گا اور وہ مستحق زکاۃ ہو گا۔ یہی شخص ہمارا موضوع گفتگو ہے۔

شوافع کی نظر میں فقر کا مفہوم

---

[1] الدر المختار شرح تنویر الانوار و جامع البحار، محمد بن علی بن محمد الحنفی الحصکفی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ص137

[2] المبسوط، شمس الدین السرخسی، دار المعارف، بیروت، طبعہ ثانی، 2/191

[3] المکائیل والموزون الشرعیہ، علی جمعہ محمد مفتی الدیار، القدس للاعلان والنشر، قاہرہ، طبعہ ثانیہ، ص19

[4] ایضاً، ص19

امام شافعی فقر کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

"الفقير من لا مال له ولا حرفة تقع منه موقعا، زمنا-اى عاجز-كان او غير زمن، سائلا كان او متعففا"[1]

ترجمہ: ایسے افراد فقیر کہلاتے ہیں جن کے پاس نہ تو ان کی ضروریات کے مطابق مال موجود ہو اور نہ کوئی ایسا پیشہ ہو جو ان کے اخراجات پورے کر سکے، چاہے وہ (کسی معذوری وغیرہ کی وجہ سے) عاجز ہو یا عاجز نہ ہو۔ اور چاہے لوگوں کے سامنے اپنا دست سوال پھیلاتا ہو یا نہ، ہر دو حالات میں وہ فقیر ہی کہلائے گا۔

امام نووی فقیر کی بابت قائل ہیں کہ:

"هوالذى لا يقدر على ما يقع موقعا من كفايته بمال ولا كسب"[2]

ترجمہ: ایسا فرد فقیر ہے جس کی ذاتی ملکیت میں ضرورت بھر اخراجات کے لیے نہ تو کوئی مال موجود ہو اور نہ ہی کوئی ایسا ذریعہ آمدنی۔

شوافع کی طرف سے کی گئی مذکورہ دونوں تعریفوں کے ضمن دو طرح کے افراد فقیر کہلائیں گے۔ (الف)۔ ایک وہ جس کے پاس سرے سے مال ہو نہ ذریعہ معاش۔ (ب)۔ جبکہ دوسرا وہ شخص جس کے پاس اصل مال یا ذریعہ معاش تو ہے مگر اپنی تمام ضروریات زندگی بشمول روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم وصحت وغیرہ کو اپنے معیار کے مطابق پورا نہ کر سکے۔

مکتب شافعی کے نزدیک یہ دونوں اشخاص غریب کہلائیں گے۔

امام مالک کی نظر میں فقر کا مفہوم

مالکی حضرات کے نزدیک فقیر وہ ہوتا ہے جو اس قدر کم مال رکھتا ہو کہ جو اس کے اخراجات کو پورا نہ کر سکے۔ چنانچہ علامہ شہاب الدین لکھتے ہیں:

"الفقير هو الذى يملك الشيء اليسير الذى لا يكفيه لمعيشته"[3]

---

[1] الام، امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس الشافعی، درالافکارالدولیہ، بیروت، ص282

[2] المجموع شرح المہذب، ابوزکریا محی الدین بن شرف النووی، دارالفکر، بیروت، 190/6

[3] الذخیرہ، احمد بن ادریس المالکی، دار الغرب الاسلامی، بیروت، طبع اول 1994، ص 143/3

ترجمہ: فقیر وہ ہوتا ہے کہ جو اس قدر تھوڑی ملکیت رکھتا ہے کہ جس سے اس کی معیشت کا پہیہ نہ چل سکتا ہو۔

فقہ مالکی ہی سے تعلق رکھنے والے علامہ خرشی المالکی اس تعریف میں ایک اضافہ کرتے ہیں کہ فقراء کے پاس سال بھر کے اخراجات نہیں ہوتے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"بانه من له بلغة لا تكفيه لعيش عامه"[1]

ترجمہ: یعنی ایسا شخص جس کے پاس اس کے سال کی معیشت کے اخراجات نہ ہوں۔

حنابلہ کی نظر میں فقر کا مفہوم

حنابلہ کے نزدیک فقیر کی تعریف یہ ہے کہ:

"هوالذى لا يجد ما يقع موقعا من كفايته"[2]

ترجمہ: فقیر وہ ہو گا جو کفایت بھر مال و اسباب سے بھی محروم ہو۔

دیگر فقہاء کے نزدیک فقر کا مفہوم

اسلام نے امیر اور غریب کے درمیان فرق کے لئے واضح لائن مقرر کی ہے،، اور امیری یا غریبی کا معیار مؤونہ سنویہ یا سالانہ اخراجات کو قرار دیا ہے۔ لہذا سال بھال کے اخراجات میں خوراک، لباس، مکان، تعلیم اور صحت کے علاوہ تمام ضروری معاملات جیسا کہ سفر کے لیے زاد راہ، مہمانوں کی مہمان نوازی، اپنی اولاد کی شادیاں کرنا اور ضروری تحفے تحائف وغیرہ کے اخراجات بھی سالانہ اخراجات میں شامل ہیں۔ البتہ ان تمام چیزوں میں افراد کی ذاتی حیثیت و مقام، علاقہ، اور عرف وغیرہ کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

پس جو افراد اپنے سال بھر کے اخراجات اپنے پاس نہیں رکھتے فقیر اور مسکین کہلاتے ہیں۔

چنانچہ صاحب جواہر لکھتے ہیں:

"الفقراء والمساكين :وهم الذين تقصر اموالهم فى مئونة سنتهم"[3]

---

[1] حاشیہ الخرشی علی مختصر سیدی خلیل، امام محمد بن عبد اللہ بن علی الخرشی المالکی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، طبعہ اولی 1997، ص 2/506

[2] المبدع فی شرح المقنع، ابن مفلح الحنبلی، مکتب الاسلامی، بیروت، طبع اول 1994، ص 2/413

[3] جواہر الکلام فی شرح شرائع الاسلام، محمد حسن نجفی، دار الاحیاء التراث العربی، 1413ھ، 15/295

ترجمہ: فقراء اور مساکین وہ لوگ ہیں کہ جن کے اموال ان کے سال بھر کے اخراجات کے لیے ناکافی ہوں۔

واضح رہے کہ سال بھر کے اخراجات میں وہ خود اور اس کے اہل و عیال بھی شامل ہیں، نہ صرف یہ بلکہ ان کے سال بھر کے اخراجات کا حساب ان کی حیثیت اور ان کے رتبے کے لحاظ سے لگایا جائے گا۔

چنانچہ سید علی حسینی سیستانی لکھتے ہیں:

"وکلاهما(ای الفقیر والمسکین) من لا یملک مئونة سنته اللائقة بحاله، له و لعیاله"[1]

ترجمہ: فقیر اور مسکین وہ ہوتے ہیں جو اپنے رتبے اور مقام کے حساب سے اپنے لیے اور اپنے اہل و عیال کے لیے سال بھر کے اخراجات نہ رکھتے ہوں۔

علامہ زین الدین العاملی المعروف بشہید ثانی کے نزدیک اہل و عیال سے مراد وہ تمام لوگ ہیں کہ جن کے اخراجات اور نان ونفقہ کو پورا کرنا شریعت اسلامی کے اعتبار سے اس کے اوپر واجب ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"ویشملهما(ای الفقیر والمسکین) من لا یملک مئونة سنة–فعلاً ولا قوةً–له و لواجبی النفقة بحسب حاله فی الشرف وما دونه"[2]

ترجمہ: فقراء اور مساکین کا مفہوم ان تمام افراد کو شامل ہے جو اپنے رتبے اور مقام کی حیثیت سے اپنے لیے اور اپنے واجب النفقہ عیال کے لیے سال بھر کے اخراجات نہ رکھتے ہو، نہ تو فعلاً اور نہ ہی قوةً۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ (مئونہ) یعنی اخراجات میں کون کون سی چیزیں شامل ہیں۔ آیا تمام ضروریات زندگی مئونہ کے حکم میں آتی ہیں یا صرف ابتدائی اور اساسی ترین ضروریات زندگی؟ اس سوال کے جواب میں شہید ثانی لکھتے ہیں کہ:

"والدار والخادم، اللائقان بحال مالکهما کمیة و کیفیة، من المئونة ، ومثلهما ثیاب التجمل و فرس الرکوب و کتب العلم و ثمنها لفاقدها"[3]

---

[1] منہاج الصالحین، السید علي الحسیني السیستاني، دار المؤرخ العربي، بیروت، طبع رابعة عشر، 2008ء، 1/265

[2] الروضة البهیة في شرح اللمعة الدمشقیة، زین الدین العاملی الشهید الثاني، منشورات مؤسسة الاعلمي للمطبوعات، الطبعة: الأولى، 2/312

[3] ایضاً، 2/312

ترجمہ: گھر اور ملازم، جو کہ اپنے مالک کی حیثیت و طاقت کے مطابق ہوں، مئونہ میں شامل ہیں۔اسی طرح خوبصورت اور دیدہ زیب لباس، سواری، علمی کتابیں وغیرہ(یہاں تک کہ ان کی قیمت بھی) مئونہ میں شامل ہیں

لہذا جس کے پاس اپنا گھر نہ ہو یا اپنی سواری نہ ہو اسی طرح گھریلو ملازم، کتابیں، یہاں تک کہ کپڑے سب مئونہ میں شامل ہیں۔یعنی ان کے فاقد کو فقیر کے ضمن میں زکاۃ ادا کی جاسکتی ہے۔بشر طیکہ اس کی حیثیت اور مقام کے اعتبار سے یہ اشیاء اس کے لیے ضروری شمار ہوتی ہوں۔

البتہ یہاں ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ فقیر کے عنوان سے خارج ہونے کے لیے کیا سال بھر کے اخراجات کا مالک ہونا نقداًاور فعلاً ہونا ضروری ہے یا بالقوۃ بھی سال کے اخراجات پر قادر ہونے سے انسان فقیر نہیں رہتا۔

صاحب عروۃ الوثقی علامہ کاظم یزدی لکھتے ہیں کہ سال بھر کے اخراجات کا مالک شخص(چاہے بالفعل ہو یا بالقوۃ) فقیر نہیں کہلاتا لہذا مستحق زکاۃ بھی نہیں۔وہ یوں رقم طراز ہیں:

"فمن كان عنده ضيعة او عقار او مواش او نحو ذلک تقوم بكفايته و كفاية عياله فی طول السنةلا يجوز له اخذ الزكوة"[1]

ترجمہ: جس کے پاس پراپرٹی، جائداد یا حیوانات وغیرہ کی صورت میں اشیاء موجود ہوں کہ جس سے اس کا اور اس کے اہل وعیال کا سال بھر کا خرچہ نکل آتا ہو تو ایسے شخص کے لیے زکاۃ لینا شرعاً درست نہیں ہے(اگرچہ ان کے ہاں پورے سال کے برابر مال بالفعل موجود نہیں ہوتا)۔

یعنی ایسا شخص جس کے پاس مذکورہ اشیاء موجود ہوں وہ فقیر نہیں ہے۔

شیخ مفید کے نزدیک ان شروط کے علاوہ جب تک مستحق افراد پر دو عنوانات منطبق نہ ہو جائیں ان کے لیے زکاۃ لینا جائز نہیں ہے چونکہ وہ فقیر کے مصداق نہیں رہتے۔

(الف): ان یکون مفتقرا الیها بزمانة تمنعه من الاکتساب۔یعنی وہ مال زکاۃ کا اس لیے محتاج ہو کہ معذوری وغیرہ کی وجہ سے کمانے سے عاجز ہو۔

---

[1] العروۃ الوثقی فیما تعم بہ البلوی، سید محمد کاظم طباطبائی یزدی، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، لبنان، طبع ثانیہ 1409ھ، 2/306

(ب)او عدم معیشة تغنیه عنها فلیلتجئ الیها للحاجة والاضطرار۔ یعنی اس کے پاس (اپنے واجب النفقہ افراد کے اخراجات پورے کرنے کے لیے) کوئی ذریعہ موجود نہ ہو لہذا وہ مجبوری کی وجہ سے سوال کرنے پر اور ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو۔[1]

لہذا کسی ایسے ذریعے کی موجودگی میں کہ جو اس کے سال بھر کے اخراجات پورے کر سکتا ہو وہ فقیر نہیں کہلائے گا پس مستحق زکاۃ بھی نہیں ہو گا۔

فقہاء میں موجود اس اختلاف کو اس انداز سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ احناف کے نزدیک فقیر وہ ہے کہ جس کی کل ملکیت نصاب زکاۃ سے کم مالیت پر مشتمل ہو، اس لیے کہ جس کے پاس نصاب زکاۃ موجود ہو اس پر تو زکاۃ ادا کرنا واجب ہے نہ کہ اس کو مستحق زکاۃ سمجھ کر زکاۃ دی جائے گی۔ جب کہ باقی آئمہ کے نزدیک فقر اور غربت کا معیار "مِلک" نہیں بلکہ "حاجت" ہے، یعنی جو محتاج نہیں ہے وہ فقیر نہیں ہے اگرچہ اس کی ذاتی ملکیت نصاب زکاۃ سے کم ہی کیوں نہ ہو اس لیے کہ اس کو مزید کی حاجت نہیں ہے۔ جب کہ اس کے بالعکس جو بھی محتاج ہو گا اگرچہ اس کے پاس زکاۃ کے تمام نصاب پورے ہوں لیکن چونکہ وہ ابھی بھی محتاج ہے لہذا وہ فقیر ہے کیونکہ

"لان الفقر معناه الحاجة"[2]

ترجمہ: فقر کا معنی محتاج ہونا ہے۔

لہذا جو بھی محتاج نہیں ہے وہ فقیر نہیں ہے۔

فقہاء کی طرف سے کی گئی مذکورہ تعریفوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ امام ابو حنیفہ کے مطابق فقر و غربت کا معیار "عدم ملک النصاب" یعنی کسی شخص کے پاس نصاب زکاۃ کا موجود نہ ہونا ہے۔ جبکہ دیگر آئمہ فقہاء (یعنی امام احمد ابن حنبل، امام مالک، امام شافعی اور فقہ جعفریہ) کے نزدیک فقر و غربت کا معیار "عدم ملک الکفایہ" یعنی کفایت بھر مال و اسباب کا موجود نہ ہونا ہے چاہے وہ نصاب کی حد سے متجاوز ہوں، کیونکہ اگرچہ مال نصاب کے مقرر کردہ حد سے زیادہ ہے مگر اس شخص کی ضروریات کے کے واسطے ناکافی ہے لہذا اس مال کی موجودگی کے باوجود بھی امام ابو حنیفہ کے علاوہ دیگر آئمہ کے نزدیک یہ شخص فقیر شمار ہو گا۔

---

[1] المقنعہ، محمد ابن نعمان الشیخ مفید، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، لبنان، ص 141

[2] الفقہ علی المذاہب الخمسہ، محمد جواد مغنیہ، سازمان اوقاف و امور خیریہ، قم، ایران، طبع ہفتم 1982ء ص 177

فقر کا معنی و مفہوم بین الاقوامی اداروں کی نظر میں

اقوام متحدہ کی نظر میں غربت موجودہ دنیا کا دن بدن پھیلتا ہوا اور خطرناک حد تک بڑھتا ہوا مسئلہ ہے۔ انسانی معاشروں میں جابجا ایسے بہت سے عوامل موجود ہیں جو غربت کو پیچیدہ اور کثیر جہتی مسئلہ بنا رہے ہیں۔ عموماً غربت کی تعریف میں یہ کہا جاتا ہے کہ غربت ان سہولیات کے ناپید ہونے کا نام ہے جو انسانی مادی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ البتہ یہ مسئلہ صرف اس حد تک محدود نہیں ہے بلکہ غربت ان تمام وسائل کی کمی سے عبارت ہے جو انسان کی جسمانی و نفسیاتی احساس کمتری اور محرومی کا سبب بنتی ہیں۔ اقوام متحدہ کی طرف کی گئی تعریف غربت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اقوام متحدہ کے نزدیک غربت کی تعریف یہ ہے کہ:

> "Fundamentally, poverty is a denial of choices and opportunities, a violation of human dignity. It means lack of basic capacity to participate effectively in society. It means not having enough to feed and cloth a family, not having a school or clinic to go to, not having the land on which to grow one's food or a job to earn one's living, not having access to credit."[1]

ترجمہ: بنیادی طور پر غربت معاشی و اقتصادی مواقع کی عدم دستیابی اور انسانی عظمت و وقار کے مجروح ہونے سے عبارت ہے۔ غربت یہ ہے کہ انسان کے پاس وہ وسائل و ذرائع ناپید ہوں کہ جن کہ وجہ سے معاشرے کی بہتری میں فعال کردار ادا کرنے سے قاصر ہو جائے۔ یعنی اس کے پاس اتنے وسائل نہ ہوں کہ جن کے ساتھ وہ اپنے خاندان کو مناسب غذا اور لباس فراہم کر سکے، تعلیم کے لیے سکول اور صحت کے لیے کلینک جا سکے، اتنی زمین نہ رکھتا ہو کہ جس پر اپنی فصلیں اگا سکتا ہو اور نہ ہی کوئی ایسی ملازمت یا مواقع میسر ہوں کہ جن سے اپنے معاش کو پورا کر سکے۔

انسانی حقوق کے پس منظر میں فقر و افلاس کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غربت ایک کثیر الجہتی اثرات و اسباب کا حامل عمل ہے۔ جو آپس میں باہمی طور پر متصل اور مربوط عوامل کا نتیجہ

---

[1] Programme of Action of the World Summit for Social Development, World Summit for Social Development, United Nations Organisations, 14 March 1995, pg.10
http://www.un.org/documents/ga/conf166/aconf166-9.htm

ہوتے ہیں۔ کوپین ہنگن کے مقام پر 1995ء میں سماجی ترقی کے موضوع پر ہونے والی عالمی سربراہی اجلاس میں، بین الاقوامی برادری نے غربت کی کثیر جہتی تعریف کو قبول کیا اور اس کی توثیق کی۔ اس بات پر تمام ممالک کے نمائندوں کا اتفاق قرار پایا کہ فقر و افلاس عمومی طور پر عالمی برادری کو درپیش ایک ایسا مسئلہ ہے جو کثیر الاسباب بھی ہے اور کثیر الجہات بھی، یعنی اس کے اسباب بھی گوناں گوں قسم کے ہیں اور اثرات بھی متعدد جہات کے حامل ہیں۔

اقوام متحدہ کے زیر اہتمام منعقدہ اس اجلاس میں جس کے اندر 118 سربراہان مملکت نے شرکت کی اور اقوام عالم کو درپیش مسائل پر اپنے آراء کا اظہار کیا گیا، اس اجتماع نے غربت، اس کی تعریف اور اس کے ابعاد کو بھی زیر بحث لایا گیا، اس اجلاس میں غربت کو ناقابل قبول عنصر کے طور پر متعارف کرایا گیا، نیز اس کے تدارک کے واسطے تجاویز، آراء اور حل پیش کیے گئے۔

اقوام متحدہ کے اس اجلاس میں غربت یا فقر کی تعریف یوں کی گئی ہے:

> "Absolute poverty is a condition characterized by severe deprivation of basic human needs, including food, safe drinking water, sanitation facilities, health, shelter, education and information. It depends not only on income but also on access to social services."[1]
>
> ترجمہ: فقر مطلق ایک ایسی صورت حال ہے کہ جس میں انسان کو خوراک، پینے کے صاف پانی، حفظان صحت کی سہولیات، مناسب رہائش اور تعلیم سمیت بنیادی انسانی ضروریات کی شدید محرومی اور قلت کا سامنا ہوتا ہے۔ کسی بھی انسان کی ایسی صورت حال کا انحصار صرف اس کی آمدنی پر ہی نہیں بلکہ سماجی و معاشرتی خدمات تک اس کی رسائی پر بھی منحصر ہے۔"

درحقیقت فقر و افلاس اور غربت و تنگدستی ایک بیماری کی مانند ہے، جس کے ہوتے ہوئے زندگی کی سبھی خوبصورتیاں اور رنگینیاں رخصت ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غربت کو وسائل و ذرائع کی کثیر الجہتی کمی کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ غربت ایسے حالات کا پیش خیمہ بن جاتی ہے کہ جن میں جسمانی، سماجی و معاشرتی اور نفسیاتی سکون حاصل کرنے کے لیے تمام ممکنہ وسائل و اسباب ناپید ہوتے ہیں جس کی وجہ سے غربت کے اثرات بھی کثیر الجہتی ہوتے ہیں اور خطرناک محرومی پر منتج ہوتے ہیں۔

---

[1] Programme of Action of the World Summit for Social Development, World Summit for Social Development, United Nations Organisations, 14 March 1995, pg.10 www.un.org/documents/ga/conf166/aconf166-9.htm (retrived: 03 Nov 2016)

اقوام متحدہ کے اس بین الاقوامی اجلاس کے مطابق دینا میں پائی جانے والی غربت کی متعدد اقسام اور اشکال موجود ہیں۔اس رپورٹ میں لکھا گیاہے کہ عادی یاعام فقر و افلاس کی معاشرے میں کئی شکلیں اور قسمیں ہیں، جس میں افراد کے پاس اپنے معاشی حالات کو مستحکم اور پائیدار رکھنے کے لیے آمدن اور پیداواری وسائل کی کمی، غذائیت کی کمی اور بھوک، صحت کی ناکافی سہولیات، تعلیم و تعلم کے وسائل کانہ ہوناعلاوہ ازیں دیگر بنیادی ضروریات زندگی کاناپید ہونا، بیماریوں کی وجہ سے شرح اموات میں بڑھتاہوااضافہ، رہائش کی ناکافی سہولیات اور مناسب گھروں کانہ ہونا، غیر محفوظ ماحول اور سماجی امتیازی سلوک وغیرہ سب شامل ہیں۔صرف یہی نہیں بلکہ اس کی نمایاں خصوصیات میں مذکورہ بالا وجوہات کی وجہ سے سماجی و معاشرتی اور ثقافتی سرگرمیوں نیز اجتماعی معاشرتی فیصلوں میں عدم شرکت بھی شامل ہے۔

غربت کی یہ مختلف شکلیں قریب قریب دنیاکے تمام ممالک میں موجود ہے۔جیسا کہ دیکھا جاسکتاہے کہ ترقی پذیر ممالک میں بڑے پیمانے پر غربت موجود ہے۔صرف انہی ممالک ہر موقوف نہیں بلکہ ترقی یافتہ سمجھے جانے والے ملکوں میں بھی جہاں لوگوں کے پاس وسیع پیمانے پرمال و دولت میسر ہے وہاں بھی غربت کوڈیرے لگائے دیکھا جاسکتاہے۔روزمرہ زندگی میں دیکھا جا سکتاہے کہ کیسے ملکی معیشت کے بیٹھ جانے کی وجہ سے افراد خط غربت سے نیچے گرجاتے ہیں۔باہمی تنازعات یاقدرتی آفات کے نتیجے میں اچانک نمودار ہونے والی غربت، آمدن کی کمی کی وجہ سے طاری ہونے والی غربت اور ان افراد کی مفلسی،ناداری اور محتاجی جو خاندان کے افراد اور معاشرتی اداروں کے عدمِ تعاون کے باعث غربت کا افلاس سے نکلنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو پاتے، کچھ کم نہیں ہے۔

<u>**فقر و غربت عالمی بینک(World Bank) کی نظر میں**</u> غربت انسانی زندگی کے فقط معاشی و اقتصادی پہلو کو متاثر نہیں کرتی بلکہ یہ غریب کی زندگی کے ہر پہلو پر منفی اثر ضرور چھوڑتی ہے۔انسانی غربت کا اشاریہ (The Human Poverty Index)بنی نوع انسان کے معاشروں پر غربت کے پڑنے والے غیر معاشی و غیر اقتصادی اثرات کو باقاعدہ طور پر نوٹ کرتا ہے جیساکہ افراد کی اوسط زندگی، بالغ افراد میں موجود شرح خواندگی، پینے کے پانی کی کیفیت اور کم وزن بچوں کی پیدائش جیسے مسائل اور معاملات کافقر وافلاس سے تعلق کوبغور دیکھتاہے اور پھراس حوالے سے اپنی آراء کوپیش کرتاہے۔

عالمی بنک(World Bank) یاعالمی بنک گروپ جو کہ اپنی ذیلی کل پانچ عالمی تنظیموں پر مشتمل ہے، جن کا بنیادی کام رکن ممالک کو معاشی ترقی اور غربت کے خاتمے کے لیے قرضہ فراہم کرنا یااس مقصد کے لیے انہیں مشورے دیناہے۔اس کا قیام بریٹن وڈز کے معاہدے کے تحت 27دسمبر 1945 عمل میں آیا تھا۔اس نے 25جون 1946 کوباقاعدہ کام شروع کیا۔عالمی بنک

کے کام کا زیادہ تعلق ترقی پذیر ممالک کی ترقی خصوصاً انسانی زندگی کو بہتر بنانے، تعلیم، زراعت کو ترقی دینے اور ذرائع رسل و رسائل کو ترقی دینے کے ساتھ ہے۔

اگست 2005 میں ورلڈ بینک کی طرف سے چھاپے گئے Poverty Mannual کے مطابق فقر و افلاس یا Poverty کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"Poverty is pronounced deprivation in well-being."[1]

ترجمہ: غربت اچھی حالت کے نہ ہونے اور کھلم کھلا محرومی کا نام ہے۔

ورلڈ بینک نے پہلی مرتبہ انسانی تاریخ میں غربت کی حد کو جانچنے اور ماپنے کے لیے فقر و افلاس کی تعریف میں "خط غربت" کو باقاعدہ شامل کیا ہے۔یعنی فقر اور عدم فقر کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی ہے کہ جس سے نیچے والے افراد فقیر جب کہ اس کے اوپر کے افراد غیر فقیر کہلاتے ہیں۔ فقر و افلاس کی یہ لکیر درحقیقت اس امر کا انکشاف کرتی ہے کہ محرومی اور و محتاجی اور فقر و افلاس کا آغاز کس جگہ سے ہو رہا ہے۔ غربت کی اس لکیر یا Poverty Threshold کو مقرر کرنے کی کئی ایک ممکنہ وجوہات ہیں۔

پہلا سبب یہ ہے کہ اس خط یا لکیر کے ذریعے غربت اور مفلسی کو ایسی پہچان اور شناخت دے دی جاتی ہے کہ جس کے بعد اقوامِ عالم کے لیے اس مسئلے سے چشم پوشی ممکن نہیں رہتی اور فقر و افلاس اور اس کے حدود و قیود سب کے سامنے واضح اور عیاں رہتے ہیں۔اس کے علاوہ اگر کبھی بھی افراد، ادارے یا ممالک غربت کے خاتمے اور اس کی روک تھام کے لیے کچھ اقدام کرنا چاہیں تو عالمی بینک کی طرف سے قائم کی گئی غربت کی یہ لائن یا خط غربت ان کو غریب افراد، خاندانوں اور ممالک تک پہنچنے میں مدد کرتی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ تمام منصوبے اور پالیسیاں جو غریبوں کے لیے بنائے جا رہے ہیں ان کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے لیے یہی ایک طریقہ کار میسر ہے کہ کس منصوبے اور پالیسی کے ذریعے کتنے افراد کو خط غربت سے نکال کر خوشحالی اور فراخی کی زندگی کی طرف جانے میں مدد دی جاسکی ہے۔یوں ان اداروں کی کارکردگی اور مؤثریت کو بھی جانچنے میں مدد ملتی ہے۔[2]

غربت کی اس لکیر کے بارے میں عالمی بینک لکھتا ہے:

[1] Introduction to Poverty Analysis, World Bank Institute 2005, pp 8

[2] Introduction to Poverty Analysis, World Bank Institute 2005, pp 8

"The poverty threshold, poverty limit or poverty line is the minimum level of income deemed adequate in a particular country."[1]

ترجمہ: خط غربت یا غربت کی لکیر، کسی بھی ملک، علاقے یا خطے میں بسنے والے افراد کی آمدن کی وہ کم سے کم مقدار ہے جو اس کی روزمرہ ضروریات زندگی کو پورا کرنے کے لیے کافی سمجھی جائے۔

غربت کی یہ لائن علاقہ، خطہ اور افراد کے بدل جانے سے بدل جاتی ہے۔اور عملی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں غربت کی لائن ترقی پذیر ممالک کی نسبت بلند ہوتی ہے۔غربت کی حد کا تعین عام طور پر تمام ضروری وسائل کی مجموعی لاگت کو تلاش کر کے کیا جاتا ہے جو ایک سال کے دوران ایک عام انسان کو اپنے ضروری اخراجات کی صورت میں خرچ کرنا پڑتے ہیں۔پھر ان سالانہ اخراجات کو ماہانہ اور یومیہ بنیادوں پر تقسیم کر کے غربت کی حد کو معین و مشخص کیا جاتا ہے۔

2005ء میں عالمی بینک نے فقر و افلاس کی لائن کو مہنگائی اور افراط زر کی مقدار میں ہوتے اضافے کے سبب، بڑھا کر یومیہ 1.25 ڈالر کر دیا، جو کہ اس سے پہلے صرف ایک ڈالر تھی۔[2] اکتوبر 2015ء میں ایک بار پھر ورلڈ بینک نے غربت کی بین الاقوامی لکیر کو بڑھا کر ایک اعشاریہ نو صفر (1.90) ڈالر یومیہ تک بڑھا دیا۔یوں غربت کی لکیر جو کہ ایک ڈالر یومیہ سے شروع ہوئی تھی 2015ء تک 1.90$ یومیہ تک پہنچ گئی۔اگرچہ غربت کی لائن کو باقاعدگی سے بڑھایا جا رہا کہ ہے لیکن ابھی بھی بہت سارے معیشت دان یومیہ مذکورہ مقدار کو افراد کی یومیہ ضروریات کے لیے ناکافی سمجھتے ہیں جیسا کہ 2015ء میں غربت کی نئی لائن متعارف کرائے جانے کے فوراً بعد جیسن ہائیکل (Jason Hickel) نے اس مقدار کو بھی افراد کے لیے ناکافی قرار دیا تھا۔[3]

---

[1] Poverty Comparisons: A Guide to Concepts and Methods, Living Standards Measurement Papers, Martin Ravallion, The World Bank, 1992, p.25

[2] Dollar a day revisited, Martin Ravallion, Shaohua Chen and Prem Sangraula, The World Bank conomic Review, June 2009,Vol. 23, p. 163–184

[3] Could you live on $1.90 a day? That's the international poverty line, Jason Hickel, The Guardian, ISSN 0261-3077(Retrieved 10 January 2017)

افلاس کا لغوی و اصطلاحی معنی

افلاس کا لفظ (ف-ل-س) سے ماخوذ ہے۔ابتداءً آنے والا الف اضافی ہے اور صیرورۃ یعنی ہو جانے کے معنی کو بیان کر رہا ہے۔[1] پس افلاس کا مطلب یہ ہو گا کہ کوئی شخص صاحب ثروت و مال ہونے کے بعد صاحب فلوس یعنی حاجت مند ہو گیا۔[2]

فلس قدیم زمانے میں رائج نقدی تھی جو کہ سونے اور چاندی کے علاوہ دیگر کم قیمت دھاتوں سے بنتی تھی،اس کی قدر و قیمت درہم کے چھٹے حصے کے برابر تھی۔[3] اس ضمن میں مفلس کے معنی کے بیان میں زبیدی رقم طراز ہیں :

ای صار ذا فلوس بعد ان کان ذا دراهم[4]

یعنی مفلس وہ شخص ہے جو درہم و دینا کا مالک تھا لیکن اب صرف فلس ہی بچا ہو۔

معاشرے میں افلاس کا اطلاق ایسے افراد پر ہوتا ہے جن کے پاس فلس یعنی مال و دولت نہیں رہتا۔علامہ زمخشری لکھتے ہیں۔

افلس الرجل ،ای :صار مفلسا[5]

کسی کے مفلس کا معنی اس کے پاس مال و دولت کا ختم ہو جانا ہے۔

پس معلوم ہوا کہ افلاس کا معنی کسی کی حالت کا ابتری کی صورت میں یوں بدل جانا ہے کہ وہ مال وثروت کی کثرت ، قیمتی اشیاء نیز درہم اور دینار سے مالا مال ہو اور پھر مالی طور پر کمزور ہو جائے اور اس کے پاس صرف کم قیمت چیزیں ہی بچیں۔

فقہی اصطلاح میں بھی افلاس اس کے قریب معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ابن عابدین لکھتے ہیں :

افلس: ای صار الی حال لیس له فلوس، و بعضهم قال:صار ذا فلوس بعد ان کان ذا دراهم، والمراد حکم الحاکم بتفلیسه [6]

---

[1] شذا العرف فی فن الصرف، الحملاوی، احمد الحملاوی، مکتبۃ النہضۃ العربیۃ، بغداد، سن ندارد، ص:39

[2] لسان العرب، ابن منظور، 6/156

[3] الکافی، الباشا، محمد الباشا، شرکۃ المطبوعات، بیروت، طبع اول، 1412ھ، ص:762

[4] تاج العروس، الزبیدی، 16/344

[5] اساس البلاغہ، الزمخشری، محمد ابن عمر، دار الصادر، بیروت، طبع 1399ھ، ص:481

[6] رد المختار علی الدرر المختار (حاشیہ ابن عابدین)، محمد امین ابن عمر ابن عابدین، دار الفکر، بیروت، طبع ثانی 1992ء، 6/446

کسی شخص کے مفلسی یہ ہے کہ کہ اس کے ہاتھوں میں دولت باقی نہ رہے، جب کہ بعض لوگوں کے نزدیک افلاس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص غنی ہو لیکن بعد میں حاجتمند ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ حاکم ایسے لوگوں کی تفلیس یا حاجتمند ہونے کا حکم لگائے۔

جب کہ ابن رشد کے مطابق افلاس کے دوم معانی اور دو حالتیں ہو سکتی ہیں۔

1۔ کوئی شخص اس حد تک مقروض ہو جائے کہ اس کے پاس قرض کو اتارنے کے لیے مطلوبہ مقدار میں مال و دولت موجود نہ ہو۔

2۔جب کہ دوسری حالت جس پر افلاس کا اطلاق ہوتا ہے اس مقدار میں اجناسِ ضروریہ کا میسر نہ ہو سکنا کہ جس سے وہ اپنی ضروریات وحاجات کو پورا کر سکے۔[1]

نتیجہ کلام:

مذکورہ بالا لغوی و اصطلاحی ابحاث سے واضح ہوا کہ فقر و افلاس ایک ایسی صورت حال کا نام ہے کہ جس میں انسان کو خوراک، پینے کے صاف پانی، حفظان صحت کی سہولیات، مناسب رہائش اور تعلیم سمیت بنیادی انسانی ضروریات کی شدید محرومی اور قلّت کا سامنا ہوتا ہے۔اور نہ ہی اس کے پاس وہ وسائل و ذرائع موجود ہوں کہ جن سے وہ بنیادی ضروریات زندگی کو فراہم کر سکے۔ایسے اشخاص جو اس طرح کی صورتحال سے دوچار ہوں وہ فقیر، نادار اور مفلس افراد کہلاتے ہیں۔

---

[1] بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، ابن رشد، محمد ابن احمد، دارالفکر، بیروت، طبع ندارد، 2/213

فصل دوم

فقر کی اقسام اور اس کا تاریخی پس منظر

بنیادی طور پر تو فقر و افلاس بنیادی و اساسی ضروریاتِ زندگی کے ناپید ہونے سے عبارت ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ غربت ایک ایسا کثیر الجہتی تصور ہے، جس میں ممکنہ طور پر سماجی، اقتصادی اور سیاسی عناصر شامل ہوتے ہیں۔ بایں وجہ فقرا اپنے وجود اور بقاء کے حوالے متعدد اقسام پر منقسم ہے۔ اسی طرح فقراء کی کئی اقسام ہیں۔ کچھ فقراء تو ایسے ہیں جو امیر یا صاحب حیثیت افراد کے قریب تر ہوتے ہیں۔ جبکہ دوسری طرف ایسے غریب افراد بھی ہوتے ہیں جن کو غربت تباہی و ہلاکت کے دہانے تک دھکیل چکی ہوتی ہے۔ اسی طرح سے کچھ غریب لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جو حال ہی میں غربت کا شکار ہوتے ہیں جب کہ فقراء کا ایک طبقہ وہ بھی ہے کہ جو فقیر پیدا ہوتا ہے، حالت فقر میں ساری زندگی گزارتا ہے اور غربت ہی میں مر جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ فقر کی متعدد اقسام اور انواع معاشرے میں موجود ہو سکتی ہیں۔

فقر کی اقسام

علم الاقتصاد کے مطابق ویسے تو معاشرے میں فقر کی متعدد اقسام موجود ہو سکتی ہیں، البتہ فقر کی تمام اقسام کو دو مختلف بنیادوں کی اساس پر تفصیل سے یوں ذکر کیا جاسکتا ہے

1 : فقر کی اقسام بلحاظ مدت فقر

2 : فقر کی اقسام بلحاظ شدتِ فقر

فقر کی اقسام بلحاظ مدتِ فقر

غربت کی مذکورہ قسم، مدت فقر کے کم یا زیادہ ہونے کے اعتبار سے ہے۔ فقر کا یہ عنوان کو مزید تین قسموں پر منقسم ہے۔

الف) عارضی فقر

اس کو فقر مؤقت سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ یہ قسم مخصوص اقتصادی، عسکری، سیاسی یا طبیعی حالات سے عارضی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ اور تکافل اجتماعی یا افراد و ملل کے باہمی تعاون سے مختصر عرصے میں اس پر قابو پالیا جاتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کتنی مدت پر مشتمل فقر عارضی اور کتنی مدت والا دائمی یا مستمر فقر کہلائے گا۔

"اذ استمر الفقر ملازما للفرد مدة سنة او اقل يكون الفقر موقتا واما اذا استمرت حالة الفقر اكثر من السنة كان الفقر فقراً مستمراً "[1]

---

[1] من اسباب الفقر والحرمان فی العالم، محمد حسینی شیرازی، مؤسسۃ المجتبی، بیروت، 1424ھ، ص71

ترجمہ: اگر کسی شخص کا فقر سال یا اس سے کم عرصے پر محیط ہو تو وہ عارضی فقر کے زمرے میں آئے گا جبکہ ایک سال سے زیادہ مدت تک جاری رہنے والا فقر مستمر (یعنی فقر دائمی) کہلائے گا۔

قدرتی آفات اور حادثات وواقعات کی صورت میں طاری ہو جانے والا فقر غربت کی اسی قسم کی ایک مثال ہے۔ علاوہ ازیں کوئی بھی ایسی انہونی چیز یا حادثہ یا ایسی کوئی بھی صورت حال جس کا رونما ہونا عموما اور نارمل حالات میں متوقع نہ ہو اسی قسم میں شامل ہے۔ البتہ یہ حالات وواقعات کبھی سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں اور کبھی خالصتا اقتصادی طرز کے۔۔۔ مثلا 1973 کا پٹرول بحران اس کی بڑی مثال ہے کہ جس کی وجہ سے تمام اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئی تھیں اور مہنگائی کا طوفان برپا ہوا تھا۔ اس طرح کے حالات میں ہوتا یہ ہے کہ اشیاء خورد ونوش کی قیمتیں بلند ہو جاتی ہیں اور دیگر تمام اجناس بھی مہنگی ہو جاتی ہیں۔ نتیجۃ لاکھوں بلکہ کروڑوں لوگوں کی قوت خرید جواب دے جاتی ہے اور یوں وہ صرف چند دنوں میں ہی اچانک خط غربت سے نیچے چلے جاتے ہیں۔

غربت کی اس قسم کے ضمن میں زمانہ حال کے 2008 اور 2009 کے عالمی اقتصادی بحران کی مثال پیش کی جاسکتی ہے کہ جس کے دوران صرف ایشیا اور یورپ کے اندر 25 ملین افراد بے روزگار ہو گئے تھے اور عالمی سطح تک اس کے اثرات دیکھنے میں آئے تھے۔

موسمی فقر بھی اسی قسم کا حصہ ہے جو مخصوص موسم سے متعلق ہوتا ہے اور اس موسم کے جاتے ہی زائل ہو جاتا ہے۔ مثلا بعض ممالک میں موسم سردیوں کا موسم شروع ہوتے ہی ان کے نسبتا ٹھنڈے اور برف باری والے شہروں میں لوگ عارضی طور پر غذا اور لباس کی کمی کا سامنا کرتے ہیں اور ان کے لیے ایسے حالات میں باہر نکلنا اور کام کرنا دشوار بلکہ بعض حالات میں تو ناممکن ہو جاتا ہے۔ البتہ واقع ہونے والی غذائی اور اجناس کی یہ قلت عارضی ہوتے ہے اور آمد ورفت کے رستوں کے بحال ہونے کے ساتھ ہی حالات معمول پر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

ب) دائمی فقر یا فقر مستمر

اس کا اطلاق عارضی فقر کے متضاد معانی میں ہے، یعنی غربت کا وہ دائرہ کار سال یا اس سے بیشتر مدت پر محیط ہوتا ہے۔

"الفقر الذی یبقی علی مدار فصول السنة"[1]

ترجمہ: یعنی وہ فقر جو (کم از کم) سال کے بارہ مہینے باقی رہے۔

---

[1] الفقر التعریف ومحاولات القیاس، الطیب لحلیح، محمد جصاص، ابحاث اقتصادیہ وادار یہ، العدد السابع جوان 2010، ص 9

دنیا میں دائمی غربت کے شکار افراد عارضی غربت میں مبتلا افراد کی نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ اور ان کے شب وروز اور ایام حیات کہیں زیادہ کٹھن اور مشکل حالات سے دوچار ہوتے ہیں۔

دائمی غربت کے بارے میں سید حسینی شیرازی لکھتے ہیں:

"اذا استمرت حالة الفقر اكثر من السنة كان الفقر فقراً مستمراً "[1]

ترجمہ: جب غربت ایک سال سے زیادہ عرصے پر محیط ہو جائے تو اس کو فقر مستقر یا دائمی فقر کہا جائے گا۔

غربت کی اقسام بلحاظِ شدتِ فقر

غربت کی اس تقسیم میں غرباء کو اس اعتبار سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے کہ ان پر طاری ہونے والے فقر کی شدت اور حدت کس قدر زیادہ ہے۔ قدرتی سی بات ہے کہ غربت سبھی لوگوں پر یکساں درجے کی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ بہت زیادہ غریب ہوتے ہیں تو کچھ قدرے کم غریب اور کچھ معمولی غریب۔۔۔ لہذا غربت کو اس کی شدت کے حساب سے تین اقسام میں منقسم کیا گیا ہے۔

i) فقر لمطلق یا فقر مدقع (Absolute Poverty)

ii) فقر نسبی (Relative Poverty)

فقر مطلق یا فقر مدقع (Absolute Poverty)

یہ غربت کی شدید ترین شکل ہے۔ "مدقع" اس اونٹ کو کہتے تھے جو بھوک کی وجہ سے گھاس اور جڑی بوٹیوں کو مٹی کے اندر جڑوں تک کھالے۔[2]

حالانکہ عادتا اونٹ دراز قد ہونے کی وجہ سے بلند قامت درختوں اور پودوں کو کھاتا ہے۔ اور زمین کی جڑی بوٹیوں اور گھاس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، لیکن جب وہ بھوک کی شدت کی وجہ سے ایسی جڑی بوٹیوں سے پیٹ بھرنے پر مجبور ہوتا ہے تو ایسی حالت میں اس پر مدقع کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح ایسے افراد کو بھی مدقع کا مفہوم شامل ہے جن کی ناک مشکل حالات کی وجہ سے زمین پر جالگے۔[3]

---

[1] من أسباب الفقر والحرمان في العالم، محمد حسینی شیرازی، مؤسسۃ المجتبی، بیروت، 1424ھ، ص 71

[2] المعجم الوسیط، ابراہیم مصطفی، احمد الزیات، حامد عبد القادر، محمد النجار، دار الدعوۃ، سن ندارد، 1/ 290

[3] مختار الصحاح، زين الدين محمد بن ابي بكر بن عبد القادر الرازي، المكتبة العصرية، بيروت، طبع خامسہ 1420ھ، ص:106

فقر المدقع، غربت کی وہ شکل ہے کہ جس میں دیگر ضروریات زندگی تو درکنار انسان اپنی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کا متحمل بھی نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ حمدی عبد العظیم اس فقر کی اس قسم کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"و هو الحالة التی لا یستطیع فیها الانسان بدخله الوصول الی اشباع حاجاته الاساسیة المتمثلة بالغذاء والمسکن والملبس والتعلیم والصحة والنقل"[1]

ترجمہ: وہ حالت کہ جس میں انسان بنیادی انسانی ضروریات مثلاً غذا، لباس، گھر، تعلیم، صحت وغیرہ کو اپنی محدود آمدنی کی وجہ سے اپنے لیے میسر نہ کر سکے۔

اقوام متحدہ کی ذیلی تنظیم UNESCO کے مطابق فقر المدقع یا Absolute Poverty کی تعریف یوں کی جائے گی:

"Absolute poverty measures poverty in relation to the amount of money necessary to meet basic needs such as food, clothing, and shelter."[2]

ترجمہ: Absolute Poverty یا فقر المدقع کے تصور کا تعلق کسی بھی شخص کی آمدن کی اس مقدار سے ہے جو اس کی بنیادی انسانی ضروریات جیسا کہ خوراک، کپڑے اور رہنے کے لیے گھر وغیرہ کے لیے ضروری ہو (یعنی اس مقدار کے برابر آمدن نہ رکھنے والا شخص غریب یا فقیر کہلائے گا)۔

ان تعریفوں کے مطابق فقر المدقع، انتہائی غربت یا شدید مفلسی و ناداری سے مراد کسی بھی انسانی معاشرے میں افراد کی ایسی حالت ہے جس میں وہ تمام بنیادی ضروریاتِ زندگی جیسے خوراک، لباس، مکان اور گھر وغیرہ کو مہیا کرنے والے تمام لازمی وسائل سے مکمل طور پر محروم ہوں۔ اقوام متحدہ کے اعلامیہ World Summit on Social Development کے مطابق Absolute Poverty فقر مطلق بنیادی انسانی ضروریات سے نہایت محرومی اور شدید محتاجی کا نام ہے۔ کہ جس میں خوراک، پینے کا صاف پانی، حفظانِ صحت کی تمام سہولیات، تعلیم کی فراہمی اور اپنا ذاتی گھر سمیت زندگی کی تمام ضروری اشیاء اس میں شامل ہیں۔

عالمی بینک نے Abslute poverty یا Extreme Poverty کی تعریف نہایت جامع اور مدلل انداز میں کی ہے۔ ورلڈ بینک کے مطابق:

"A condition so limited by malnutrition, illiteracy, disease, squalid surroundings, high infant mortality, and low life

---

[1] فقر الشعوب بین الاقتصاد الوضعی والاقتصاد الاسلامی، حمدی عبد العظیم، اکادمیۃ العلوم الاداریۃ، مصر، 1995، ص15

[2] www.unesco.org. Retrieved 14-11-2016

expectancy as to be beneath any reasonable definition of human decency."[1]

ترجمہ: Absolute Poverty یا Extreme Poverty ایک ایسی حالت کا نام ہے جس میں افراد معاشرہ میں غذائیت کی کمی، جہالت، بے روزگاری، بیماری، آلودگی، بچوں کی بلند شرح اموات اور شرح زندگی کا کم ہوتا ہوا دورانیہ وغیرہ شامل ہیں جو کسی طور بھی انسانی عظمت و وقار اور حیثیت کے مناسب نہیں ہیں۔

ان تعریفوں سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ فقر مطلق یا Absolute Poverty کا شکار ہونے والے افراد شدید احساس کمتری، محرومی، خرابی صحت، غم والم اور قبل از وقت موت کا سبب بنتا ہے۔ اس کا معاملہ بنیادی انسانی ضروریات کی کمی اور محرومی سے شروع ہوتا ہے اور پھر ایک لاینحل مسئلے کے طور پر پورے سماج کو اپنی ہولناکی سے متاثر کرتا ہے۔

2008ء میں عالمی بینک کی طرف سے جاری کیے گئے اعداد و شمار کے مطابق مطلق فقر یا Extreme Poverty کی بین الاقوامی حد ایک اعشاریہ پچیس ڈالر (1.25$) یومیہ آمدنی کو قرار دیا گیا۔ جب کہ اس سے قبل یہ حد ایک امریکی ڈالر یومیہ تھی۔ دنیا میں بدلتے ہوئے اقتصادی حالات کے پیش نظر اس حد کو 2015ء میں ایک اعشاریہ نو صفر (1.90$) ڈالر قرار دیا گیا۔

الفقر النسبی یا نسبی غربت (Relative Poverty)

کسی بھی انسان کا اپنے مجتمع اور معاشرے کے دیگر افراد کی نسبت مالی حوالے سے کمزور و ناتواں ہونا فقر نسبی کہلاتا ہے۔ یعنی دوسروں کی نسبت فقیر ہونا نہ کہ فقیر اصلی۔

"یشیر الفقرالنسبی الی حالة التخلف وراء معظم الآخرین فی المجتمع المحلی"[2]

ترجمہ: کسی بھی فرد کا اپنے ارد گرد رہنے والی اکثریت کے مقابلے میں اقتصادی طور پر پیچھے رہ جانا فقر نسبی کہلاتا ہے۔

اس قسم میں داخل فقراء اپنی بنیادی انسانی ضروریات کو پورا کرنے سے ہر گز عاجز نہیں ہوتے۔ البتہ معاشرے کے دیگر افراد کی طرح سے ضروریات وسہولیات زندگی سے اتنا استفادہ نہیں کر پاتے جتنا کہ معاشرے کے دیگر افراد کرتے ہیں۔

---

[1] Monitoring Global Poverty, Report of the Commission on Global Poverty, World Bank Group, p.12

[2] المجتمع والتاریخ، مرتضی مطہری، وزارة الارشاد الاسلامي جمهورية ايران الإسلامية، طبع اولی 1987ء، ص:24

لہذا اس فقر کو بنیادی ضروریات زندگی کی عدم دستیابی والا فقر نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں وہ افراد شامل ہیں کہ جن کی کل آمدنی معاشرے کے متوسط طبقہ کے افراد کی نسبت کم ہو۔ یعنی یہ لوگ متوسط طبقہ کی نسبت فقراء ہیں۔ محمد جصاص لکھتے ہیں:

"ان الشخص الذی یقل دخله عن متوسط دخل الفرد فی المجتمع یعتبر فقیرا فقرا نسبیا"[1]

ترجمہ: کسی بھی معاشرے میں موجود متوسط طبقہ کی آمدن سے کم تر آمدنی والے افراد (اس طبقہ کی نسبت) غریب کہلاتے ہیں اور ان کی غربت فقر نسبی کہلاتی ہے۔

اس غربت کو ماپنے کا کوئی مقرر پیمانہ نہیں ہے بلکہ ہر معاشرے میں اسی معاشرے کے تناسب سے ہوتی ہے۔ موسوعہ علم الاجتماع کے مطابق:

"یتعلق بالفروق فی مستویات الموارد المادیة ، ای عدم مساوات فی توزیع تلک الموارد فی المجتمع"[2]

ترجمہ: فقر نسبی کا تعلق مادی و مالی امور میں لوگوں کے درمیان پائے جانے والے تفاوت سے ہے۔ یعنی کسی مجتمع یا معاشرے میں مالی حوالے سے پائے جانے والی عدم مساوات فقر نسبی کہلائے گی۔

گویا کہ لوگوں کی آمدنیوں میں پایا جانا والا تفاوت اور فرق اس معاشرے کے فقراء نسبی کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور یہ اس معاشرے کے وہی لوگ ہوتے ہیں کہ جن کی آمدنی دوسرے افراد کی نسبت کم اور نتیجۃً ان کے سہولیات زندگی بھی نسبتاً محدود ہو جاتی ہیں ان اسباب کی بابت متوسط طبقہ کی نسبت یہ لوگ غریب کہلاتے ہیں۔

فقر و غربت کا تاریخی پسِ منظر:

تاریخی اعتبار سے غربت کا باب اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسان کی تاریخ۔ اگرچہ خالق کائنات نے زمین و آسمان کی وسعتوں میں انسانوں کی ضروریات کے مطابق تمام نعمتوں کو فراہم کیا ہے لیکن مسئلہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسانی مفادات باہم آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔ جیسا کہ آج کے دور میں بھی میں بنیادی مسئلہ وسائل کی کمیابی کا نہیں بلکہ ان کی عادلانہ تقسیم کا ہے۔

---

[1] الفقر: التعریف و محاولات القیاس، الطیب الحلیح، محمد جصاص، ص10

[2] موسوعہ علم الاجتماع، جوردون مارشالی، (مترجم: احمد عبد اللہ)، مکتبہ بستان المعرفۃ للطباعۃ والنشر والتوزیع، طبع اول 2000ء، 2/1081

جوں جوں انسانی آبادی میں اضافہ ہوا، انسانی وسائل پر قبضے اور تسلط کی انسانی خواہش میں اسی قدر اضافہ ہوتا گیا۔ انسانی معاشروں کے فسادات کی بنیاد بھی قدرت کی طرف سے خلق کیے گئے وسائلِ زندگی اور ان پر قبضے کے مسائل ہی تھے۔ ان رنجشوں اور اختلافات کی بنیاد انسان کی معاشی و اقتصادی فکر تھی کہ دیگر افراد ان سے قبل ان وسائل و ذخائر پر قبضہ نہ کر لے اور وہ اور اس کی قبیلہ اور اس کی مستقبل کی نسلیں خالی ہاتھ محروم نہ رہ جائیں۔[1]

تاریخی طور پر، غربت آمدنی سے منسلک ہے، جیسا کہ آج کے تصور غربت و فقر کی بنیاد بھی یہی ہے۔ اگرچہ خود "آمدن" کا تصور اور اس کے مسائل بھی "فقر و افلاس" کے مسائل سے کچھ کم مشکل نہیں ہیں۔ لہذا فقر و افلاس کے ضمن میں آمدن کو زیر بحث لاتے ہوئے ضروری ہے کہ آمدنی کے علاوہ دیگر انسانی وسائل جیسا کہ اثاثہ جات، عوامی خدمت کے زمرے میں ملنے والی سبسڈیز اور ملازمت کے ضمن میں پیسے کے علاوہ حاصل ہونے والی دیگر خدمات، جیسا کہ تعلیم اور صحت کے شعبے میں حاصل سہولیات وغیرہ، کو آمدنی کے درست اور جامع پیمانے تک پہنچنے کے لیے ضرور مد نظر رکھا جائے۔

پس کسی بھی شخص کو اس وقت غریب یا فقیر کہا جائے گا جب وہ مستقل آمدنی اور زندگی کی آسائشات اور ضروریات کو حاصل کرنے کے لیے ان تمام ضروری وسائل سے محروم ہو جائے جو کہ انہیں نہ صرف ضروریات زندگی فراہم کرتے ہیں بلکہ دیگر معاشرتی ذمہ داریوں جیسا کہ معاشرتی تعمیر و ترقی میں حصہ ڈالنا، اپنی معاشرتی ذمہ داریوں کو ادا کرنے اور معاشرے کے تعلقات اور رسوم میں حصہ لینے کے قابل بناتے ہیں۔[2]

آج کی دنیا میں عالمی بینک (World Bank) غربت کے اعداد و شمار اور اس کے حقائق جاننے کا مستند ترین ذریعہ ہے۔ اس بینک کی بنیاد 1945ء میں پڑی، اس سے قبل دنیا میں پائی جانے والی غربت، اس کے اعداد و شمار اور اسباب و اثرات کے حوالے سے مکمل طور پر جاننا نہایت پیچیدہ امر ہے۔ عالمی بینک بھی صرف 1981 کے بعد مطلق غربت کے اعداد و شمار کو شائع کرتا ہے، البتہ محققین نے ماضی قریب میں پائی جانے والی غربت اور اس کے اسباب و اثرات کے حوالے مفید معلومات جمع کی ہیں۔ اس حوالے سے ابتدائی تحقیق Bourguignon اور Morrison کی جانب سے 2000ء میں منظر عام پر آئی۔[3] اگرچہ ان سے پہلے معاشیات پر تو بہت کچھ لکھا جا چکا تھا البتہ فقر و غربت کو بطور خاص ایک موضوع کے ابھی تک لکھا نہیں گیا تھا۔ اپنی ریسرچ میں

---

[1] العدالۃ الاجتماعیۃ وضوابط توزیع الثّروۃ في الاسلام، ڈاکٹر زہیر الاعرجي، سازمان اوقاف وامور خیریہ، قم، ایران، طبع اول، ص:27

[2] المجتمع والتاریخ، ص:129

[3] https://ourworldindata.org/extreme-poverty (Retrived on 15 April 2017)

دونوں محققین نے انیسویں، بیسویں اوتر اکیسویں صدی کی غربت کو موضوع بحث بنایا ہے اور انیسویں صدی کے فقراء و غرباء کے اعداد و شمار کو اکٹھا کیا۔ اس ریسرچ میں گذشتہ دو صدیوں کے اندر لوگوں کے درمیان وسائل کی تقسیم کے معیار اور طریقہ کار پر جانکاری کی گئی اور بتایا گیا کہ آمدنی کی عالمی تقسیم کی عدم مساوات کی صورتحال 19 ویں صدی کے آغاز سے ہی بدترین ہو چکی تھی۔ البتہ اس کے بعد دنیا بھر کی توجہ اس مسئلے کی طرف ہو جانے کی وجہ سے اس میں غربت کی بڑھتی ہوئی رفتار میں نسبتا کمی ہوئی اور دنیا کی مجموعی معاشی صورتحال بھی نسبتا مستحکم ہوئی۔ اس ریسرچ کے مطابق انیسویں صدی کے آغاز تک معاشرے میں موجود معاشی عدم مساوات، ممالک کے اندر بسنے والے افراد کے فرق کی وجہ سے تھی جب کہ اس کے بعد کی معاشی عدم مساوات کی وجہ ممالک کے درمیان معاشی فرق کا ہونا ہے۔

"Inequality Among World Citizens: 1820-1992" کے مطابق 1820ء میں، بہت زیادہ لوگ غربت میں رہتے تھے اور صرف ایک چھوٹا سا اشرافیہ زندگی کے اعلی معیار کا لطف اٹھاتا تھا۔ چونکہ ایک ایسی دنیا میں جہاں اقتصادی ترقی نہ ہو رہی ہو، آبادی میں اضافہ کا مطلب مزید غربت اور پھر اس سے بھی زیادہ غربت ہی ہو سکتا ہے۔[1]

گذشتہ صدیوں میں جا کر ان میں افراد کی آمدنی اور اخراجات کو معلوم کرنا اور پھر انہیں موجودہ اعداد و شمار کی عادی دنیا سے موازنہ کرنا تقریبا ایک ناممکن کام ہے، چونکہ مختلف اوقات میں دستیاب وسائل، اشیاء اور آمدن بلکل مختلف رہے ہیں یہاں تک کہ بعض اوقات تو ان میں ایسی تبدیلی رونما ہوتی ہے کہ ایک زمانے کی اشیاء کو دوسرے کسی زمانے سے موازنہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے بالخصوص جب وہ موازنہ معاشی و اقتصادی میدان میں ہو کہ جس میں ہر لحظہ تغیر اور تبدیلی عیاں رہتی ہے۔

[1] Inequality Among World Citizens: 1820-1992, Bourguignon, François and Christian Morrisson, American Economic Review, Vol. 92, No. 4, p. 727

فصل سوم

موجودہ دور میں فقر و افلاس - اعداد و شمار کی روشنی میں

غربت کے اعداد و شمار

ایک غیر سرکاری سروے کے مطابق 1981ء میں دنیا کی کل آبادی کا 44 فیصد حصہ خط غربت سے نیچے گزر بسر کر رہا تھا۔ اس کے بعد دنیا کی اس مسئلے کی طرف بھرپور توجہ اور کوشش کی وجہ سے واضح اور تیز رفتار کمی واقع ہوئی ہے۔ تاریخی حقائق بتلاتے ہیں کہ اگرچہ آج بھی تمام خطہ ہائے ارضی میں غربت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں لیکن گذشتہ دو سو سالوں میں غریب خاندان میں پیدا ہونے اور اسی غربت میں مر جانے کے مواقع میں ڈرامائی حد تک کمی آئی ہے۔

درج ذیل چارٹ میں دنیا میں گذشتہ دو صدیوں کے دوران انسانی معاشرے میں پائی جانے والی غربت کے اعداد و شمار اور اس کی سنگینی کی صورتحال کو دیکھا جا سکتا ہے۔ 1970ء تک غربت کے اعداد و شمار کے لیے Bourguignon اور Morrison کی ریسرچ "Inequality Among World Citizens: 1820-1992" سے مدد لی گئی ہے البتہ 1980ء کے بعد والوں سالوں کے لیے عالمی بینک کے اعداد و شمار پر بھروسہ کیا گیا ہے۔

1820ء میں دنیا کی کل آبادی ایک اعشاریہ ایک بلین (1.1 Billion) تھی، جس میں سے ایک ارب سے بھی زائد انسان انتہائی غربت میں رہتے تھے۔ یہی حال اگلے ڈیڑھ سو سالوں میں بھی رہا کہ دنیا کی اکثر و بیشتر آبادی خط غربت سے نیچے رہی چونکہ غربت کے خاتمے کے اقدامات اتنے جاندار نہ تھے کہ بڑھتی ہوئی آبادی میں اس کی تعداد کو واضح طور پر کم کیا جا سکتا پس اس ڈیڑھ صدی کے دوران آبادی کے اضافے کے ساتھ ہی غریب اور غیر غریب ہر دو طرح کے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہ 1970ء کی دہائی تھی کہ جس میں تاریخ انسانی میں پہلی بار، غیر غریب افراد کی تعداد میں اضافہ جب کہ مفلس و فقیر افراد کی تعداد میں کمی ہونا واقع ہوئی۔[1]

مذکورہ چارٹ کے مطابق 1970ء میں دو اعشاریہ دو بلین (2.2 Billion) یعنی دو ارب سے بھی زیادہ لوگ انتہائی غربت میں زندگی گذار رہے تھے جب کہ سال 2015ء میں دنیا کی آبادی کئی گنا بڑھ جانے کے باوجود مفلس و نادار لوگوں کی تعداد مزید بڑھنے کی بجائے کم ہو کر صرف 705 ملین رہ گئی ہے۔ گویا کہ اب غریب لوگوں کی تعداد کل آبادی کے تناسب کے حساب سے 1970ء کی نسبت تین گنا کم ہو چکی ہے۔[2]

---

[1] Global Extreme Poverty, Max Roser and Esteban Ortiz-Ospina, March 27, 2017, Published online at OurWorldInData.org.

[2] World Bank, 2006 World Development Report, Equity and Development

غربت کو کم کرنے میں ترقی کے باوجود، عالمی سطح پر انتہائی غربت میں رہنے والوں کی تعداد ناقابل قبول حد تک زیادہ ہے، جس کی وجہ سے عالمی بینک اور دیگر اداروں کی طرف سے انتہائی غربت کے ختم کرنے کے ہدف کے لیے دی گئی ڈیڈ لائن یعنی 2030ء تک غربت کا خاتمہ ممکن نظر نہیں آتا۔ عالمی بینک کی طرف سے دیے گئے 2013ء کے تخمینے کے مطابق دنیا کی کل آبادی کے (10.7٪) 10ء7 فیصد لوگوں (یعنی 767 ملین لوگوں) کی کل یومیہ آمدنی ($ 1.90) ایک اعشاریہ نوے ڈالر سے بھی کم ہے۔ جس کا معنی یہ ہوا کہ دنیاوی آبادی کا ایک معتدبہ حصہ آج بھی فقر و افلاس کی نظر ہے۔[1]

دنیا کی انتہائی غریب آبادی کا نصف براعظم افریقہ میں رہتا ہے، جہاں 2013ء کے ایک سروے کے مطابق 389 ملین افراد یومیہ 90ء1 ($1.90) ڈالر سے کم آمدنی کا حامل ہے۔ براعظم افریقہ کے ان انتہائی غریب ترین افراد کی تعداد پوری دنیا میں پائے جانے والے غریبوں اور مفلسوں سے زیادہ ہے۔[2]

دنیا کے غربت زدہ افراد کی اکثریت دیہاتی علاقوں میں آباد ہے اور وہ غربت کے ساتھ تعلیمی محرومی کا شکار بھی ہیں۔ فقر و افلاس کا شکار ان افراد کی اکثریت اٹھارہ سال سے کم عمر ہے اور ان میں سے زیادہ تر افراد زراعت کے شعبے سے وابستہ ہیں۔

دنیا میں سالانہ ہونے والی اموات کا ایک تہائی یعنی سالانہ 18 ملین لوگوں کی موت غربت یا اس سے متعلقہ مسائل کے سبب واقع ہوتی ہے، ان اموات کی اکثریت کا تعلق بچوں اور خواتین سے ہے۔ غذائی قلت کے مسائل کی وجہ سے ہر سال گیارہ ملین بچے پانچ سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ روزانہ آٹھ سو (800) ملین لوگ رات کو بھوکا سونے پر مجبور ہوتے ہیں۔[3]

غربت کے خلاف جنگ ابھی اپنے زوروں پر ہے، جس میں ابھی بہت سارے چیلنجز سے نبٹنا باقی ہے۔ غربت کے خلاف لڑا جانے والا یہ محاذ غربت زدہ افراد کی اکثریت کے دور دراز اور دشوار گزار علاقوں میں ہونے کی وجہ سے مزید مشکل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ غربت کا شکار ایسے علاقوں میں اچھے اسکولوں میں تعلیم کی فراہمی، صحت کی مناسب دیکھ بھال، بجلی، شفاف پانی اور دیگر اہم خدمات تک رسائی بہت سے لوگوں کے لئے محض ایک خواب کی طرح ہے۔ غربت کے شکار افراد کے لیے اکثر سماجی اقتصادی حیثیت، صنف، قومیت اور جغرافیہ کی طرف سے مقرر کردہ حدود مزید مشکلات کا سبب بنتی ہیں۔ جو لوگ خود کو غربت و افلاس کے چنگل سے آزاد کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ان کی یہ ترقی و خوشحالی بھی عارضی ثابت ہوتی ہے اور اکثر و بیشتر موسمیاتی تبدیلیاں،

---

[1] http://www.worldbank.org/en/topic/poverty/overview

[2] https://ourworldindata.org/extreme-poverty/#extreme-poverty-in-a-historical-perspective

[3] http://www.poverty.org.uk/summary/social%20exclusion.shtml

معاشی واقتصادی بحران اور غذائی قحط وقلت وغیرہ جیسے حالات ان کی کامیابوں کو ان کے لیے عارضی ثابت کرتے ہیں اور دوبارہ ان کو غربت وافلاس کے گڑھے کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

2015ءتک تین سو ملین ایسے افراد بھی غربت کا شکار تھے جو روزانہ اپنے گھر سے کام کے لے نکلتے اور دن بھر کی کمائی کے باوجود اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو غربت کے دائرے سے باہر نکالنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ کے مطابق 1990ءسے لے کر 2015ءتک دنیا کے ایک ارب سے زیادہ انسانوں کو غربت کے دائرے سے باہر نکالا گیا ہے۔اگرچہ آج بھی دنیا میں آٹھ سو ملین سے زیادہ لوگ انتہائی غربت کا شکار ہیں۔[1]

غربت کے اعداد وشمار کا صحیح اندازہ اس صورت میں سامنے آتا ہے جب دنیا میں دولت وثروت کے انبار اکٹھے کرنے والوں کے ساتھ ایک غریب کے احتیاج وضرورتمندی کا تقابل سامنے آتا ہے۔اعداد وشمار کے مطابق

- 2012 میں دنیا کے 100 امیر ترین افراد کی 240 بلین ڈالر کی آمدنی ہوئی جو کہ شدید غربت کو چار مرتبہ ختم کرنے کے لیے کافی تھی۔(یعنی صرف ان افراد کی آمدن ہی دنیا بھر سے غربت کو چار مرتبہ ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔[2]
- معاشی ناہمواریوں کی ایک مثال لاطینی امریکہ سے ہے، ایک رپورٹ کے مطابق لاطینی امریکہ کے 113 امیر ترین افراد کی سالانہ آمدن 25 ملین افراد کو خطِ غربت سے نکالنے کے لیے کافی تھی۔[3]
- ورلڈ بینک کی طرف سے 2001 کی جاری کی گئی ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق دنیا کے امیر ترین ایک فی صد لوگ دنیا کی کل دولت کے ۵۹ فی صد کے مالک تھے۔بالفاظ دیگر 5 کروڑ امیر لوگوں کی دولت 2 ارب 70 کروڑ لوگوں کی دولت کے مساوی تھی

---

[1] http://www.un.org/millenniumgoals/poverty.shtml

[2] The cost of inequality: how wealth and income extremes hurt us all, OXFAM MEDIA BRIEFING, 18 January 2013
https://www.oxfam.org/en/pressroom/pressreleases/2013-01-19/annual-income-richest-100-people-enough-end-global-poverty-four

[3] Latin America and the Caribbean: kingdom of the elites, published 2 April 2014
https://www.oxfam.org/en/pressroom/pressreleases/2014-04-

اور اس میں امراء کا حصہ بڑھتا جارہا تھا[1]۔ یعنی دنیا کے ایک فیصد امیر ترین لوگوں کے پاس بقیہ پوری دنیا کی مجموعی دولت کی مقدار سے زیادہ مال و دولت موجود ہے۔

- 2015 میں 62 افراد باقی دنیا کی آدھی آبادی یعنی 3.6 بلین (تین ارب ساٹھ کروڑ) لوگوں جتنی دولت کے مالک تھے۔ 2010 سے 2015 تک کے پانچ سالوں میں دنیا کے امیر ترین 62 لوگوں کی آمدنی میں 45 فیصد اضافہ ریکارڈ کیا گیا تھا۔ جبکہ اسی دوران میں دنیا کی نچلی سطح کی نصف آبادی کی آمدن میں 38 فیصد گراوٹ ہوئی تھی۔ حیرت انگیز طور پر پچھلی ایک صدی میں دنیا کی مجموعی دولت میں جو اضافہ ہوا اس میں سے دنیا کی نصف غریب ترین آبادی کو صرف ایک فیصد کا حصہ ملا ہے، جبکہ اس مجموعی اضافے کا نصف حصہ دنیا کے ثروت مند ترین افراد کے پاس ہے۔ دنیا کی غریب ترین دس فیصد آبادی کی آمدن میں گزشتہ پچیس سال کے دوران صرف سالانہ تین ڈالر سے بھی کم کا اضافہ ہوا۔[2]

---

[1] Decomposing world income distribution: Does the world have a middle class, Branko Milanvovic, The World Bank: Development Research Group Poverty and Human

[2] AN ECONOMY FOR THE 1٪, 210 OXFAM BRIEFING PAPER, published on 18 Jan 2016, https://www-cdn.oxfam.org/s3fs-public/file_attachments/bp210-economy-one-percent-tax-havens-180116-en_0.pdf

باب دوم
فقر و افلاس کے اسباب

فصل اول: سیاسی اسباب

فصل دوم: معاشی اسباب

فصل سوم: انفرادی و اجتماعی اسباب

غربت کی تعریف اور اس کی انواع کے ابواب میں بیان ہو چکا ہے کہ غربت ایک نسبی امر ہے اور اس کا معیار و مقساط معاشرے اور منطقے کے بدلنے سے بدلتا رہتا ہے لہذا بدیہی بات ہے کہ اس کے عوامل و اسباب بھی مختلف معاشروں اور منطقوں میں انہی کے تناسب سے مختلف ہوتے ہیں اور بدلتے رہتے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ ترقی پذیر ممالک میں جو عوامل غربت کا سبب اور وجہ بنتے ہیں وہ ان عوامل و اسباب سے مختلف ہوں جو ترقی یافتہ ممالک اور معاشروں کے درمیان غربت کی وجہ اور علت ہیں۔ محمد رشید رضا غربت کے اسباب کو کثیر بتلاتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

> **"وللفقر اسباب كثيرة منها الضعف والعجز عن الكسب،ومنها اخفاق السعى،و منها البطالة والكسب، ومنها الجهل بالطرق الموصلة، ومنها ما تسوقه الاقدار من نحو حركات الرياح و اضطراب البحار و احتباس الامطار و كساد التجارة ورخص الاسعار"[1]**

> ترجمہ: غربت کے کئی اسباب ہیں ان میں سے چند ایک کمانے سے عاجز ہونا، ذخیرہ اندوزی، کاہلی و سستی ، آمدنی کی صحیح تقسیم نہ کر سکنا۔۔ ان میں سے بعض قدرتی آفات وحادثات کی صورت میں ہوتی ہیں مثلا ہواؤں اور طوفانوں کا چلنا، سمندروں کے پانی کا اضطراب (سیلاب وغیرہ) قحط سالی ،کساد بازاری اور مہنگائی وغیرہ۔

غربت کے اسباب کے حوالے سے بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا بھی اس بات بارے اتفاق ہے کہ غربت ایک کثیر الجہتی مسئلہ ہے، اور اس کے اسباب ایک سے زیادہ اور متعدد ہیں۔ لہذا اس کے حل کے طور پر جب تک ان تمام مسائل کو زیر بحث نہیں لایا جائے گا اس وقت تک اس کا کوئی بھی عملی حل ممکن نہیں ہو گا۔ چنانچہ ورلڈ بینک کی 2006ء کی ترقیاتی رپورٹ میں اس بات کا اعتراف موجود ہے۔ رپورٹ کے مطابق

> "Poverty is a process. Its essential root causes are embedded in inequality, insecurity, vulnerability, discrimination and exclusion. Thus the ways to attack poverty are related to more equal opportunities, decent work, economic and social security,

---

[1] تفسیر المنار، محمد رشید رضا، الهيئة المصرية العامة للكتاب، قاہرہ، طبع 1973ء، ج2 ص368

non-discrimination, empowerment and making social and economic institutions more fair and accountable."[1]

ترجمہ: غربت بتدریج آگے بڑھنے والا عمل ہے۔اس کے اہم اور مرکزی اسباب میں مالی عدم مساوات، مالی و اقتصادی معاملات کے بارے میں پایا جانے والا عدم تحفظ، ریاست و حکومت کا افراد کے ساتھ امتیازی سلوک نیز افراد یا حکومتوں کا اپنے آپ کو بین الاقوامی معاشی دھارے سے الگ تھلگ کر دینا وغیرہ شامل ہیں۔لہٰذا اس پسِ منظر میں غربت و افلاس کا حل جن باتوں میں مضمر ہے ان میں کام کرنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع، اقتصادی و سماجی تحفظ، (صارف و آجر ہر دونوں کے ساتھ) غیر امتیازی سلوک، سماجی اور معاشی اداروں کو زیادہ منصفانہ اور بااختیار بنانا شامل ہیں۔

اس طرح غربت پر حملہ کرنے کے طریقے زیادہ مواقع، مہذب کام، اقتصادی اور سماجی تحفظ، غیر امتیازی سلوک، بااختیار بنانے اور سماجی اور معاشی اداروں کو زیادہ منصفانہ اور احتساب کرنے سے متعلق ہیں۔مشہور زمانہ ماہر معاشیات والٹر ولیمز (Walter Williams) غربت، اس کی تاریخ اور اسباب کے بارے میں کہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی ماہر اقتصادیات غربت کے اسباب و عوامل کے بارے میں کچھ بھی یقینی طور پر بیان نہیں کر سکتا کہ فقر و غربت کے اسباب مثلاً فقط یہی اور اتنے ہیں۔بلکہ غربت کے اسباب کو جاننے اور جانچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ان اسباب کو ڈھونڈا جائے جو انسانی معاشروں کو غربت کے چنگل سے آزاد کرانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں، اور جو ترقی یافتہ ممالک کے ارتقاء کا سبب بنے ہیں۔والٹر ولیمز کے مطابق عوامل ارتقاء کا جائزہ لینے کے بعد غربت کے تین ممکنہ اسباب ہو ان کی سمجھ میں آئے ہیں، وہ رقمطراز ہیں کہ:

Poverty has been man's condition throughout his history. The causes of poverty are quite simple and straightforward. Generally ,individual people or entire nations are poor for one or more of the following reasons:

1) They cannot produce many things highly valued by others;

2) They can produce things valued by others but they are prevented from doing so; or

3) They volunteer to be poor.[2]

---

[1] World Bank, 2006 World Development Report, Equity and Development

[2] https://fee.org/articles/poverty-is-easy-to-explain/(Retrived on 16-7-2017)

ترجمہ: پوری تاریخ انسانی میں غربت اور انسان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ انسانی معاشروں میں پائی جانے والی غربت کے اسباب نہائت سادہ اور سیدھے سے ہیں۔ عموماً افراد یا اقوام و ممالک درج ذیل اسباب میں سے کسی ایک یا ایک سے زیادہ اسباب کی وجہ سے غربت کا شکار ہوتے ہیں۔

1: یا تو وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ مالی طور پر مستحکم افراد اور اقوام کی طرف سے جن اشیاء کو بہت اہمیت دی جاتی ہے انہیں یہ پیدا کر سکیں (اور یوں ان افراد کی طلب کو پورا کر کے اپنے لیے روزی کا بندوبست کر سکیں)

2: یا پھر دوسروں کے لیے اہمیت رکھنے والی اشیاء کو یہ پیدا تو کر سکنے کی حالت میں ہیں لیکن انہیں ایسا کرنے کوئی نہیں دیتا

3: یا پھر یہ خود غریب ہی رہنا چاہتے ہیں۔ (اور اپنی غربت و افلاس کو ختم کرنے کے خواہش مند ہی نہیں ہیں)

غربت و افلاس انتہائی تکلیف دہ اور مصیبت ترین سماجی مشکل ہے جو ہمیشہ انسانی معاشرے کے دامن گیر رہی ہے۔ مسلسل کی جانے والی جد جہد اور مختلف کوششوں کے باوجود یہ سماجی اور اقتصادی مشکل حل نہیں ہو سکی اور اس کا مکمل خاتمہ نہیں کیا جاسکا ہے۔ عالمی ادارہ صحت کی نظر میں غربت مہلک ترین بیماری ہے، کیونکہ انسان کو ہر بیماری سے زیادہ غذائی کمی سے دوچار کر دیتی ہے، برائی پیدا کرتی ہے، نفسیاتی مسائل پیدا کرتی ہے اور لوگوں کی ہلاکت کا سبب بنتی ہے۔ ہر روز صبح کو ایک ارب سے زیادہ افراد سو کر اٹھتے ہیں تو انھیں اپنے پیٹ کی فکر ہوتی ہے، اور رات کو سوتے ہیں تو زندگی کے کم سے کم امکانات سے محروم ہوتے ہیں یہ ایک ارب افراد معمولی کھانا کھا کر سو جاتے ہیں اور اس دردناک مصیبت کو محسوس کرتے ہیں، مناسب غذا ہر انسان کی جسمانی توانائی، سماجی اور اقتصادی سرگرمیوں کے لئے ایک اہم ضرورت ہے اور زندگی کی ابتدائی ضروریات میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان کی فکری نشو نما اور معاشرے میں زندگی گذارنے، ترقی وپیشرفت اور تحرک کے لئے غذا کی مناسب اور کافی مقدار کی ضرورت ہے۔

گذشتہ چند ایک برسوں میں اشیائے خورد و نوش کے ساتھ ساتھ زندگی کی روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتیں کافی بڑھ گئی ہیں جس کے متعدد اسباب بتائے جاتے ہیں اس حوالے سے غیر مناسب آب و ہوا، غلط پالیسیوں اور بر آمدات کی راہ میں پیدا کی جانے والی رکاوٹوں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ غربت کئی پہلوؤں پر مبنی ایک مسئلہ ہے جس کی شناخت کے لئے صرف ایک عامل کو سبب نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ غربت کے اسباب کی بات ہو یا اثرات کی یا پھر اس مسئلے کے حل کے لیے پیش کیا جانے والا لائحہ عمل ہر ایک حوالے سے غربت کے یہ تمام پہلو نسبی امر رکھتے ہیں۔ یعنی افراد اور علاقے نیز زمان و مکان کے بدلنے کے ساتھ یہ ساری چیزیں بدلتی رہتی ہیں۔ ممکن ہے کسی ایک شخص کی غربت میں جو چیزیں دخیل ہوں ان کا ایک اور شخص کی غربت و افلاس سے دور کا

تعلق بھی نہ ہو۔اس بات کے بھی بہت زیادہ امکانات ہیں کہ کسی ایک قوم یا ملک کی غربت کے اسباب و علل اور اثرات دوسروں ممالک سے یکسر مختلف اور جداگانہ پہلو کے ہوں۔

یہ امر بدیہی اور واضح ہے کہ غربت کے اسباب کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ اور علت تو ہو گی۔یعنی ان اسباب کے معاشرے میں وجود اور بقاء کے حالات بالاخر کسی اور وجہ سے ہی پیدا ہوتے ہوں گے اور نتیجۃً ان اسباب کی بقاء اور ارتقاء بھی بعض افراد معاشرہ کی ہی مرہون منت ہو گی۔لہذا غربت کے خاتمے کے لیے صرف اس کے اسباب کی نشاندہی اس کا علاج ثابت نہیں ہو سکتی۔بلکہ ان اسباب کے پیچھے کار فرما عوامل تک پہنچ کر ان کا وہیں سے سد باب کرنا اور وہاں سے ان کا راستہ روکنا ضروری ہے۔مثلاً غربت کی بہت ساری وجوہات کا تعلق اس معاشرے میں رائج معاشی نظام اور معاشی ضوابط و اصول و قوانین سے ہوتا ہے۔اسی طرح ممکن ہے کہ کچھ وجوہات کا سبب اس معاشرے کا سیاسی نظام یا اس کی پالیسیاں ہوں۔یا غربت کی وجوہات کا ذمہ دار وہ معاشرہ ہو جس میں غرباء کی بڑی تعداد موجود ہو۔یا عین ممکن ہے کہ غرباء طبقہ کی اپنی ذاتی وجوہات ہی کا عمل دخل ان کی غربت کی سب سے بڑی وجہ ہو۔

لہذا غربت کے اسباب کی تقسیم میں ایک سوال پھر باقی رہ جاتا ہے کہ غربت کے کسی بھی سبب کو پیدا کرنے کے حوالے سے اور ختم کرنے کے لیے کن افراد کو ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔اور اس کی ذمہ داری کن افراد پر ڈالی جائے،یا یہ بھی کہ وہ سبب کس جہت سے پیدا ہوتا ہے اور کن اطراف اور جہات پر کام کر کے اس پر کنٹرول ممکن ہے۔

غربت کی ایسی تقسیم ضروری ہے جو اسبابِ غربت کی نشاندہی کے علاوہ ان اسباب کو پیدا کرنے والی وجوہات کی نشاندہی بھی کرے اور اس کے حل کے لیے مجوزہ طور پر معاشرے کے کچھ افراد کو اس کی ذمہ داری دے۔

ان چیزوں کے پیش نظر غربت کو درج ذیل تین فصول میں تقسیم کیا گیا ہے۔

الف)سیاسی اسباب

ب)معاشی اسباب

ج)انفرادی و اجتماعی اسباب

فصل اول

غربت کے سیاسی اسباب

غربت کے سیاسی اسباب

جب غربت کے سیاسی اسباب کی بات کی جا رہی ہو تو اس سے مراد ان تمام افراد، اقوام اور ممالک کی سیاست ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ لوگوں کے مالی حالات پر اثر انداز ہو رہی ہو، اور ان کی معاشی بدحالی کا سبب بن رہی ہو۔ لہذا غربت کے سیاسی اسباب کے ضمن میں بین الاقوامی سیاست کا کردار نہایت واضح اور اہم ہے۔

گلوبلائزیشن یا عالمگیریت کے عنصر کے ضمن میں یہ بات ایک ناقابلِ تردید حقیقت کی صورت میں سامنے آچکی ہے کہ افراد معاشرہ کی اقتصاد پر عالمی سیاست کے گہرے اور دقیق اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ویسے تو سیاست بالخصوص عالمی سیاست کے بہت سارے حوالے افراد کی معاشی زندگی پر اثر ڈالتے ہیں لیکن سیاست عامہ کے درج ذیل پہلو غربت کی ایک بہت بڑی وجہ ہیں۔

جنگیں

جنگیں نہ صرف امن عامہ کی دشمن ہیں بلکہ قیمتی انسانی جانیں اور ان کا خون ہی اس کا ایندھن ہیں۔ معاشرے کا ایک بڑا طبقہ انہیں کی بدولت خط غربت سے بھی نیچے دھکیل دیا جاتا ہے۔ جنگوں کے دو طرفہ اثرات معاشرے کی مالی بدحالی پر مترتب ہوتے ہیں اور یہ دو طرح سے معاشرتی غربت اور مالی عدم استحکام کو دعوت دیتی ہیں۔

ان کا پہلا اثر، جو بظاہر زیادہ واضح ہے، ان افراد اور اقوام پر پڑتا ہے جو جنگ میں دھونس دیے جاتے ہیں اور جن پر جنگ مسلط کر دی جاتی ہے۔ ان کے لیے جنگ ہر ہر پہلو سے ڈراؤنا خواب ہوتی۔ جنگ کے نتیجے میں قیمتی انسانی جانیں ضائع ہوتی ہیں۔ کنبے کے باروزگار افراد جنگ کا لقمہ بن جاتے ہیں اور باقی بچ جانے والے کسم پرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جنگ زدہ علاقوں، معاشروں اور ملکوں کے انفراسٹرکچر تباہ ہونے کی وجہ سے عوامی بہبود اور ترقی پر خرچ ہونے والا روپیہ پیسہ اور مالی بجٹ معاشرے کے انتظامی ڈھانچوں کی بار بار تعمیر پر خرچ ہوتا رہ جاتا ہے جس کی بدولت عوام دو وقت کی روٹی کو بھی ترس جاتے ہیں۔

ان ممالک پر بے گھر، بدحال اور غربت و افلاس کا شکار ہونے والے افراد کا بوجھ آن پڑتا ہے اور ساتھ ہی جنگی علاقوں کی ترقی و تعمیر اور جنگ زدہ افراد کے گھروں کی تعمیر نو حکومت کے لیے بڑا چیلنج بن کے سامنے آتے ہیں۔ یوں اس کی معیشت پر بوجھ بڑھتا چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے ملک مزید بدحالی کا شکار ہو جاتا ہے۔

غربت کے معاشرے پر پڑنے والے برے اثرات کی ایک مثال پہلی جنگ عظیم کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے، اردو وکی پیڈیا آزاد دائرۃ المعارف کے مطابق اس جنگ کے دوران جتنے افراد میدان جنگ میں مارے گئے اتنے ہی افراد غربت

وافلاس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ جس کا نتیجہ یوں سامنے آتا ہے کہ جنگ انسانی آبادی کو فقط گولی اور بارود کے ذریعے ہی ختم نہیں کرتی بلکہ اس کو فقر وافلاس اور بھوک وپیاس کی صلیب پر بھی چڑھادیتی ہے۔

اردو وکیپیڈیا کے مطابق: یہ جنگ (جنگ عظیم اول) انسانی تاریخ کی تباہ کن جنگ تھی جس میں تقریبا90 لاکھ مرد میدان جنگ میں ہلاک ہوئے اور اتنے ہی افراد غربت، بھوک اور بیماری کی نظر ہو گئے۔[1]

ثانیاجنگ کا دوسرا بڑا اثر اسلحے کی دوڑ کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ گولی بارود سے لے کر میزائل، ایٹم بم، ہائڈروجن بم اور اسلحے کے تمام ذرائع اس مقصد کے لیے استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا جاتا۔ زمان حال میں تو یہ خیال کیا جارہا ہے کہ اسلحے کی یہ تمام شکلیں کرہ ارض پر آباد پوری انسانی آبادی کے لیے خطرہ اور ان کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار ہیں۔

اسلحے کی دوڑ میں شامل ہونے کا یہ طرز عمل نہ صرف پوری دنیا کے امن عامہ کے لیے خطرہ ہے بلکہ ممالک و اقوام پر اقتصادی حوالے سے بھی بوجھ سے ہٹ کر کچھ نہیں۔

حال ہی میں عراق اور افغانستان کے خلاف لڑی گئی امریکی جنگوں کے مالی اخراجات نے امریکی معیشت کی کمر توڑ دی ہے اور یہ اخراجات نہ صرف امریکہ بلکہ دنیا بھر میں کئی دہائیوں تک اپنے برے اثرات کے حامل رہیں گے۔

ہارورڈ کینیڈی سکول، جو کہ ہارورڈ یونیورسٹی کا معتبر علمی ادارہ ہے، نے 2013 میں امریکی جنگی اخراجات پر ایک چشم کشا ریسرچ رپورٹ جاری کی تھی۔ اس رپورٹ میں عراق افغانستان جنگ میں امریکی جنگی اخراجات کے حوالے سے اعداد و شمار کے بہت بڑے حقائق سامنے لائے گئے ہیں۔ یہ رپورٹ اس سلسلے میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ رپورٹ کے مطابق عراق افغان جنگ امریکی تاریخ کی مہنگی ترین جنگ ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ

> The Iraq and Afghanistan conflicts, taken together, will be the most expensive wars in US history.[2]
>
> ترجمہ: عراق اور افغانستان دونوں میں لڑی گئی امریکی جنگ کو ملا کر دیکھیں تو یہ امریکی تاریخ کی سب سے مہنگی جنگ ہے۔

---

[1] http://ur.wikipedia.org/wiki/ /پہلی-جنگ-عظیم/

[2] The Financial Legacy of Iraq and Afghanistan: How Wartime Spending Decisions Will Constrain Future National Security Budgets, Linda J. Bilmes Harvard Kennedy

رپورٹ کے مطابق امریکہ کو عراق افغان جنگ کے لیے ابتدائی اندازوں سے کہیں زیادہ یعنی چار سے چھ ٹریلین ڈالر کی خطیر رقم خرچ کرنا پڑی ہے۔رپورٹ میں مزید بتایا گیا ہے کہ

"Totaling somewhere between $4 to $6 trillion. This includes long-term medical care and disability ompensation for service members, veterans and families, military replenishment and social and economic costs. The largest portion of that bill is yet to be paid."[1]

ترجمہ:اس جنگ کا تخمینہ تقریبا چار سے چھ ٹریلین ڈالر کا ہے۔کہ جس میں جنگ میں شرکت کرنے والے فوجیوں کے علاج معالجہ کے اخراجات،معذور افراد کی مالی معاونت کے اخراجات،سابق امریکی فوجیوں اور ان کے خاندان کی معاونت،فوجی ساز وسامان کی ذخیرہ کاری اور معاشرتی و معاشی اخراجات شامل ہیں۔اس بل کا سب سے بڑا حصہ تو ابھی ادا کرنا باقی ہے۔

آگے چل کر اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صرف یہی اخراجات نہیں بلکہ

"These benefits will increase further over the next 40 years. Additional funds are committed to replacing large quantities of basic equipment used in the wars and to support ongoing diplomatic presence and military assistance in the Iraq and Afghanistan region.[2]

ترجمہ: مستقبل میں سفارتی سطح پر اس جنگ کو زندہ رکھنے کے لیے،مزید اسلحے اور جنگی ساز وسامان کے لیے اور عراق و افغانستان میں دی جانے والی فوجی امداد کے لیے اضافی فنڈز کی بھی ضرورت ہو گی۔نہ صرف یہ بلکہ عراق افغانستان جنگ کی خاطر لیے گئے قرض کا اضافی ٹیکس اور سود تا دیر امریکی معیشت پر بوجھ رہے گا۔

ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اتنی بڑی اور خطیر رقم جو امریکی عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ ہونی تھی نہ صرف یہ کہ امریکی جنگ میں جھونک دی گئی بلکہ اس کے لیے قرض کے سود کا بوجھ بھی امریکی عوام پر ڈال دیا گیا ہے۔اس طرح یہ اعداد و

[1] The Financial Legacy of Iraq and Afghanistan: How Wartime Spending Decisions Will Constrain Future National Security Budgets, Linda J. Bilmes Harvard Kennedy

[2] Ibid

شمار یہ بات بخوبی واضح کرتے ہیں کہ جنگ کس طرح فلاح انسانی کے بجٹ کو اپنی آگ کی لپیٹ میں لے کر انسانیت کی بھوک، غربت اور تذلیل کا سبب بنتی ہے۔

صرف امریکہ کی بات کیونکر کی جائے پوری دنیا اس وقت اسلحے کی دوڑ میں شامل ہو چکی ہے۔ اور عوامی فلاح و بہبود کے وسائل بڑی بے رحمی سے اسلحے کی خریداری پر لگائے جا رہے ہیں۔ آنکھوں کو چکا چوند کر دینے والے حقائق کی ایک جھلک درج ذیل ہے۔

سال 2004 کے دنیا بھر کے عسکری اخراجات لگ بھگ ایک ہزار ملین ڈالر تھے۔ جب کہ یہی اخراجات سال 2006 میں دو ہزار آٹھ سو ملین ڈالر کو عبور کر چکے تھے۔[1]

عبداللہ عبدالرحمن رقم طراز ہیں:

"تؤکد کثیر من الشواهد الاحصائیة الحدیثة ان هناک تسابقا نحو التسلح، نتیجة عدم الاستقرار مما تجعل الدول المختلفه تزید من استیراد الاسلحة، فتزید نفقات التسلح من فقر هذه الدول و تخلفها و دیونها"[2]

ترجمہ: بہت سارے تازہ شواہد اس بات پر موجود ہیں کہ اسلحہ کی دوڑ معاشروں میں باقاعدہ موجود ہے۔ جس کے اثرات معاشی عدمِ استقرار کی شکل میں سامنے آتے ہیں، جس کے لیے مزید اسلحے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اسلحے پر کیے جانے والے اخراجات ان ممالک کے فقر، بیرونی قرضوں اور پسماندگی میں مزید اضافے کا سبب بنتے ہیں۔

معاشی ناہمواری اور من مانی حکومتوں کی تشکیل

ارتکاز دولت کا مطلب ہے دولت کا چند ہاتھوں میں مقید اور پابند ہو جانا۔ علم اقتصاد کے اصولوں کے مطابق دولت جس قدر گردش کرتی ہے اس قدر معیشت کا پہیہ حرکت میں آتا ہے اور عوام الناس اس مال و دولت سے تعامل کرتے ہیں اور نتیجۃً لوگوں کا اقتصاد ترقی کرتا ہے اور ان کے مالی حالات میں بہتری آتی ہے۔ ارتکاز دولت کا مطلب ہے اس پورے عمل کو روک لینا اور دولت

---

[1] استراتحیة مکافحة الفقر، السید مرتضی حسین الشیرازی، دارالامین، لبنان، بیروت، طبع اول 2012، ص 86

[2] علم الاجتماع الاقتصادی، عبداللہ عبدالرحمان، دارالمعرفة الجامعیة، مصر، 2003، ص 248

کو مرتکز و مقید اور پابند کر دینا۔ یہ ارتکاز و پابندی کسی بھی طرح معیشت کے لیے سود مند نہیں ہوتی بلکہ لوگوں کے مالی حالات کی ابتری اور غربت وافلاس کا سبب بنتی ہے۔

فی زمانہ اقتصاد عالم کو درپیش مشکلات میں سے ایک مشکل ارتکاز دولت ،یعنی امیر طبقے کا دولت کو اپنی دسترس میں محدود کر لینا اور غریب تک اس کی رسائی کو روک لینا، ہے۔ جس کی بدولت پیسے کا بہاؤ اور گردش امراء طبقے کے درمیان محدود اور مقید ہے۔ یہ طبقہ حاصل شدہ دولت کو جمع کر لیتا ہے اور دیگر افراد کو محرومی کی دنیا میں دھکیل دیتا ہے۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی معاشرے میں پھیلتے ہوئے اس ناسور کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:"دولت اور سرمایہ کاری کے وہ اصول قطعاناقابل تسلیم ہیں جن میں دولت کے اکتناز یا ارتکاز کا کوئی رستہ موجود ہو، اور جس سے دولت و کنز پھیلنے اور تقسیم ہونے کی بجائے سمٹ کر خاص حلقوں اور مخصوص طبقوں میں محدود ہو جائے اور اس طرح عام انسانی زندگی کو مفلوک الحال بنا دے"۔[1]

ارتکاز دولت کی بدترین صورتحال ان اعداد سے بخوبی واضح ہوتی ہے کہ جن کے بقول کسی بھی ملک میں ٪50 دولت پر ٪10 افرد کا قبضہ ہے جب کہ باقی ٪90 افراد کے لیے صرف ٪50 وسائل ہی بچتے ہیں۔ دنیا کے کل وسائل کے ٪85 پر صرف ٪10 افراد کا قبضہ اور اختیار ہے جب کہ باقی ماندہ ٪90 افراد صرف ٪15 وسائل کے ساتھ زندگی چلانے پر مجبور و مقہور ہیں۔ دنیا میں بڑھتی ہوئی معاشی ناہمواری اور ارتکاز دولت کے حوالے سے کی گئی ایک ریسرچ کے مطابق

> "A typical share of the top 10 per cent of wealth-holders within a country would be about 50 per cent, and the median Gini around 0.7, we have estimated that for the world as a whole the share of the top 10 per cent was 85 per cent in the year 2000."[2]

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام، محمد حفظ الرحمن سیوہاروی، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور، ص52،51

[2] The World Distribution of Household Wealth, James B. Davies, Susanna sandstorm, Anthony Shorrocks, Edward N. Wolff, Department of ecomomecs, University of

ترجمہ: اوسطاً کسی بھی ملک کے امیر لوگ اس ملک کے پچاس فیصد وسائل اور مال و دولت پر قابض ہیں جب کہ میڈیم Gini[1] کا تخمینہ 0.7٪ ہے۔ سال 2000 میں پوری دنیا کے مال دولت اور وسائل کی شرح یوں تھی کہ دنیا کا 10 فیصد امیر طبقہ اس کے 85 فیصد وسائل پر قابض اور مختار ہے۔

ارتکاز دولت کے اعداد و شمار اس مسئلے کی حساسیت اور خطرناک پہلو کو اجاگر تو کرتے ہی ہیں البتہ حل کرنے کو بھی ناگزیر حد تک ضروری بتلاتے ہیں۔ کینیڈین اخبار The Globe and Mail کی ویب سائٹ کے مطابق

"1% of richest adults own 40% of total global wealth. 2% of richest adults own 51% of total global wealth. 5% of richest adults own 71% of total global wealth. 10% of richest adults own 85% of total global wealth."[2]

ترجمہ: دنیا کے ایک فیصد امیر ترین افراد عالمی وسائل کے چالیس فیصد حصے پر قابض ہیں۔ جب کہ دو فیصد امیر ترین افراد کا عالمی وسائل کے اکیاون فیصد حصے پر قبضہ ہے۔ دنیا کے پانچ فیصد امیر ترین افراد اس کے اکہتر فیصد حصے پر قابض ہیں۔ جب کے دنیا کے صرف دس فیصد افراد کا اس کے پچاسی فیصد وسائل پر قبضہ ہے۔

آج کے عہد کا سب سے گہرا تضاد انتہا کو چھوتی ہوئی معاشی ناہمواری ہے۔ دنیا میں وسائل، سرمائے اور دولت کی تقسیم غیر مساوی اور غیر عادلانہ ہے، جس کا مزید تاریک پہلو یہ ہے کہ اس میں مسلسل اضافہ دیکھنے میں آرہا ہے۔

دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں غربت اور غیر مساوی تقسیم کی صورت حال روز بروز بدتر ہوتی جارہی ہے۔ غریب دنیا تو اس غیر عادلانہ تقسیم کا شکار ہے ہی مگر جدید اور ترقی یافتہ دنیا کا مرکز سمجھے جانے والے امریکہ کی مثال بھی ارتکاز دولت کے حوالے سے بدتر ہے۔ وکی پیڈیا آزاد دائرۃ المعارف کے مطابق "سال 2001 کے ایک جائزے کے مطابق امریکہ کے ایک فیصد امیر ترین

---

[1] میڈیم Gini کسی بھی ملک کے رہائشیوں کی آمدنی یا دولت کی تقسیم کے اعداد و شمار کی معلومات کے لیے ایک پیمائش ہے، اس کا زیادہ تر استعمال معاشرے میں پائی جانے والی معاشی عدم مساوات کے اعداد و شمار کو جاننے کے لیے کیا جاتا ہے۔

[2] www.theglobeandmail.com/news/world/the-rich-realy-do-own-the-world/article20417844 (Retrived on 8-11-16)

لوگوں کے پاس ٪38 فیصد دولت ہے۔اور دس فیصد لوگوں کے پاس ٪71 دولت ہے جب کہ ٪40 غریب مل کر صرف ایک فیصد دولت کے مالک ہیں۔"[1]

چشم کشا حقیقت کے طور پر یہی جان لینا کافی ہے کہ "دنیا کے 48 غریب ترین ممالک کی جی ڈی پی (سالانہ آمدنی) دنیا کے تین امیر ترین افراد کی دولت سے کم ہے۔"[2]

دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے دولت نچلے طبقے کی طرف منتقل نہیں ہو رہی،اس مسئلے کے بدترین اثرات میں سے کم سے کم اثر یہ پر رہا ہے کہ اس طبقے میں غربت اور احساس محرومی دونوں دن بدن بڑھتے جا رہے ہیں اور پھر اس مسئلے سے متاثرہ لوگوں کو انتہا پسندی، دہشت گردی اور جرائم کی دنیا میں دھکیلنے کا سبب بن رہے ہیں۔

---

[1] http://ur.wikipedia.org/wiki/تقسیم-دولت (Retrived at: 8-11-2016)

[2] www.javedch.com/special-features/2016/07/06/36304

فصل دوم

غربت کے معاشی اسباب

بے روز گاری

افراد کی معاشی حالت کو متاثر کرنے والے عوامل میں سے اہم ترین عامل بے روز گاری ہے کہ جس کا غربت کے ساتھ بہت گہرا واسطہ اور تعلق ہے۔ جب تعلیم یافتہ، مکمل جسمانی صحت کے حامل، پڑھے لکھے اور ہنر مند افراد کو بھی ملازمتوں کے مواقع میسر نہ ہوں تو ایسی صورت حال غربت و افلاس اور محرومیوں کے لیے مثالی ہوتی ہے اس لیے کہ لوگوں کے پاس جب کام کرنے کے مواقع ہی نہیں ہوں گے تو وہ پیسہ کہاں سے کمائیں گے اور جب وہ کما کر لانے سے عاجز ہوتے ہیں تو ان کے گھروں میں غربت و افلاس اور فاقہ کشی کا راج ہو تا ہے۔ ملازمتوں کے نہ ہونے کا نقصان فقط انہی بے روز گار افراد تک محدود نہیں رہتا بلکہ بہت سے باروز گار اور ملازمت پیشہ افراد بھی اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ کیونکہ جب بے روز گار طبقہ غربت و اافلاس کا شکار ہونے کی وجہ سے قوتِ خرید سے محروم ہو تا ہے تو اس کا اثر سرمایہ دار پر بھی پڑ تا ہے۔ جب لوگ سرمایہ دار یا تاجر کے سٹور پر موجود اشیاء کو کم خریدیں گے تو یہ چیز اس کے مالی حالات کو بھی متاثر کرے گی جس کی وجہ سے وہ اپنی فرم، فیکٹری، کارخانے یا دکان وغیرہ پر کام کرنے والے ملازمین کو کم کر کے اور ان کی تنخواہ کو بچا کے اپنے اخراجات پورے کرنے کی کوشش کرے گا جس سے مزید افراد بھی بے روز گاری کی بھینٹ چڑھ جائیں گے جس سے بے روز گاری اور غربت دونوں میں مزید اضافہ ہو جائے گا۔[1]

بے روز گاری کا مسئلے کو ٹیکنالوجی کی ترقی نے بھی مزید شدید تر بنا دیا ہے، اس لیے کہ جب کئی مزدوروں کی جگہ ایک مشین کام کے لیے لائی جا رہی تھی تو اس بارے میں توجہ نہ دی گئی کہ اس مشین کی وجہ سے جو لوگ بے روز گار ہو کر گھر جائیں گے ان کے معاش کا کیا بنے گا۔ بہتر یہ ہو تا کہ جوں جوں ٹیکنالوجی میں اضافہ ہو رہا تھا ویسے ہی اس سے متاثرہ افراد کے ایک متبادل پروگرام تشکیل دیا جاتا اور باقاعدہ حکمت عملی کے تحت ان افراد کو بے روز گار ہونے سے بچایا جاتا۔ بہر حال بے روز گاری کا مسئلہ بھی کئی ایک عوامل کا پیدا کر دہ ہے جو غربت و افلاس کے خلاف جنگ کو بری طرح متاثر کر تا ہے۔

دنیا میں دن بدن بڑھتی ہوئی غربت کی ایک وجہ بے روز گاری میں بہت تیزی سے ہو تا ہوا اضافہ ہے۔ بے روز گاری کی وجہ سے معاشرے میں پیدا ہونے والے منفی اثرات کا اندازا لگانا نہایت پیچیدہ امر ہے کیونکہ یہ افراد معاشرہ کی معیشت کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی نفسیات، تعلیم، صحت، رہن سہن غرضیکہ زندگی کے ہر پہلو پر منفی اثرات کی حامل ہے۔

ڈاکٹر مستفیض احمد علوی بے روز گاری اور اس جیسے لاحق دیگر معاشی مسائل کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] The World Book Encyclopedia, Scott Fetzer Company, Chicago, vol:15, p.723

"بے روز گاری ،ناقص معاشی منصوبہ بندی،مراعات یافتہ طبقے(جاگیر دار،صنعت کار،سیاست دان اور اعلی آفیسرز)،خود غرضی اور آبادی میں روز افزوں اضافہ کی وجہ سے معاشی زندگی اور اخلاقی روایات کا سفر منفی سمت میں جاری ہے۔ جس کا انجام گہرے کنویں (یعنی ہلاکت) کے سوا کچھ نہیں۔"[1]

بے روز گاری یعنی روز گار کے مواقع کا معدوم یا محدود ہونا۔لہذا روز گار کے مواقع نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ افرد معاشرہ اپنی مصروفیات کو جاری نہیں رکھ سکتے اور نتیجتاً انہیں بے کار ہو کر گھر بیٹھنا پڑتا ہے تو اس سے نہ صرف ان کی نفسیات پر برے اور منفی اثرات پڑتے ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی صحت اور ساخت بھی برے اثرات سے محفوظ نہیں رہتی۔ مگر زیادہ بڑا نقصان انسانی طاقتوں اور صلاحیتوں کے ضائع ہو جانے کی صورت میں نکلتا ہے۔

محمد غزالی رقم طراز ہیں

:"ان بطالة الفقراء تضييع لقدرة بشرية هائلة، و بعثرة مخزية لما اودعه الله من عضلات و اعصاب و افندة ، هذه الطاقات لو فجرت لغيرت وجه العالم، و احق الانظمة بالقبول و التشجيع ما وعى هذه الحقيقة و رتب عليها تعاليمه"[2]

ترجمہ: فقراء میں پائی جانے والی بے روز گاری انسان میں پائی جانے والی طاقتوں کو ضائع کر دینے اور ان کو استعمال لانے سے قبل بکھر جانے کے مترادف ہے۔چونکہ انسان کو طبیعی طور اللہ نے مضبوط اعضاء و جوارح اور قلب عطا فرمایا ہے تو اگر اللہ کی ان عطا کردہ نعمتوں کو (صحیح استعمال کرنے کے مواقع میسر آجائیں) تو دنیائے عالم کا نقشہ تبدیل ہو جائے۔ چاہیے کہ تمام نظام اس حقیقت کی حوصلہ افزائی کریں اور اس کے مطابق اپنے نظام کو مرتب کریں (تاکہ انسانی طاقت و قدرت کا ضیاع نہ ہو)۔

بے روز گاری فقط کسی فردِ خاص کے پاس مال و دولت کی کمی کا نام نہیں ہے بلکہ بے روز گاری کے سبب معاشرے کی تین اکائیاں بری طرح متاثر ہوتی ہیں۔

(i) فرد

(ii) خاندان اور

---

[1] تہذیب کا برزخ، مستفیض احمد علوی، یورپ اکادمی، اسلام آباد، طبع اول 2011ء، ص:82

[2] جد د حیاتک، محمد غزالی، دارالارقم، دمشق، سوریہ، طبع 2004، ص64

(iii) معاشرہ

فقر و افلاس کے معاشرتی اکائیوں پر اثرات کے بارے یوسف قرضاوی رقم طراز ہیں کہ:

"فالبطالة مشكلة اقتصادية و اجتماعية و انسانية، لها تاثيرها المباشر على الفرد و الاسرة والمجتمع - فخطرها على الفرد من الناحية الاقتصادية فقدان الدخل و من الناحية النفسية تؤدى الى الفراغ ، ومن الناحية الاجتماعية تورث الانتقام من الغير، اما خطر البطالة على الاسرة فيتمثل فى فقدان العائل و عدم الشعور بالاطمئنان والاستقرار والشعوربالقلق و التوتر والخوف من الغد المجهول، اما خطرها على المجتمع فيتجلى فى تعطيل الطاقات القادرة على الانتاج و هو ما يشكل خطرا على الاقتصاد ، و يؤدى الى اثارة نقمة البطالين على الفئات الاخرى،وهو ما يشكل خطرا على تماسک المجتمع، و خطرها على اخلاق المجتمع اشد ، فالفراغ يؤدى الى الجرائم والشرور"[1]

ترجمہ: بے روزگاری اقتصادی، انسانی اور اجتماعی پریشانیوں اور مشکلات کا سبب بنتی ہے۔ یہ بلا واسطہ فرد، خاندان اور معاشرے کو متاثر کرتی ہے۔ فرد اس سے یوں متاثر ہوتا ہے کہ اقتصادی طور پر اس کی آمدن مفقود ہو جاتی ہے اور نفسیاتی طور پر وہ فارغ اور نکما ہو جاتا ہے۔ بے روزگاری کا اجتماعی طور پر اثر یوں پڑتا ہے کہ بے روزگار افراد اپنی پریشانی، بے چینی اور الجھن کا انتقام دوسروں سے لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ افراد معاشرہ کی خاندانی اور عائلی زندگی کو اس طرح سے متاثر کرتی ہے کہ اس کی وجہ سے انسان اپنے خاندان کی کفالت سے عاجز آجاتا ہے اور اس کی طبیعت میں فکر و شعور اور ٹھہراؤ کی کیفیت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ بے چینی، کشیدگی، الجھن اور آنے والے کل کا خوف لے لیتے ہیں۔ معاشرہ اس سے یوں متاثر ہوتا ہے کہ انسانی معاشرے کی نتیجہ خیز طاقتیں اور صلاحیتیں بے روزگاری کی وجہ سے معطل پڑی رہ جاتی ہیں جو کہ اقتصاد عالم کے لیے خطرہ ہے اور جس کا نتیجہ بے روزگار افراد کی بے سکونی اور ہلچل کا دیگر افراد معاشرہ تک پھیل جانا اور معاشرتی عدم ہم آہنگی اور تفاوت کا سبب بنتا ہے۔ بے روزگاری کا سب سے زیادہ خطرہ معاشرتی اخلاقیات کو ہوتا ہے، کیونکہ فارغ البالی افراد معاشرہ کو جرائم اور شر انگیزی کی دنیا میں لے جاتی ہے۔

---

[1] دور الزکاۃ فی علاج مشکلات الاقتصادیۃ، یوسف قرضاوی، قراءات فی اقتصاد الاسلامی مرکز ابحاث الاقتصادی الاسلامی، کلیۃ الاقتصاد والادارۃ، جامعہ الملک عبدالعزیز، السعودیہ، طبع اول 1987، ص136

بیروزگاری کے اعداد و شمار کا گورکھ دھندہ انسانی ذہن کو چکرا کے رکھ دیتا ہے۔ World Employment and Social Outlook کے ایک سروے کے مطابق سال 2015 تک بے روزگار افراد کی تعداد 197.1 ملین تک پہنچ چکی ہے۔[1]

اس رپورٹ کے مطابق بے روزگار افراد کی تعداد کا مذکورہ بالا نمبر سے کہیں زیادہ ہونے کا خدشہ ہے بالخصوص لاطینی امریکہ، ایشیائی ممالک اور عرب ممالک میں اس کے اعداد و شمار انتہائی خطرناک ہیں۔

رپورٹ میں آگے چل کے مستقبل کے بارے میں یہ خدشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ

> "Based on the most recent growth projections, global employment is expected to rise by nearly 2.3 million in 2016 and by further 1.1 million in 2017."[2]

ترجمہ: غربت کے بڑھتے ہوئے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق 2016 میں دنیا کے بے روزگار افراد میں مزید 2.3 ملین اضافے جبکہ 2017 میں مزید 1.1 ملین افراد کے اضافے کا خدشہ ہے۔ یعنی 2015 کے بعد آنے والے فقط دو سالوں میں 3.4 ملین بے روزگار افراد کا اضافہ متوقع ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ 2017 تک دنیا کے 200.5 ملین افراد بے روزگاری اور غربت کا لقمہ بن چکے ہوں گے۔

انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن کے مطابق صرف بے روزگار افراد ہی غربت کا شکار نہیں ہو رہے بلکہ باروزگار نوجوانوں کی بڑی تعداد بھی درمیانے یا انتہائی درجے کی غربت میں اپنی زندگی گزار رہی ہے۔[3]

اس رپورٹ سے ایک بات تو قطعاً طے ہوگئی کہ بے روزگار افراد کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے پیدا ہونے والے دباؤ کے تحت فی زمانہ روزگار کے جو مواقع میسر بھی ہیں عالمی ادارے ان کی کارکردگی اور معیار سے مطمئن نہیں ہیں۔ بلکہ ملازمتوں کے غیر معیاری مواقع اور آسامیاں بذات خود ایک نیا مسئلہ بنتے جا رہے ہیں۔ خطرے سے دوچار اور غیر محفوظ روزگار میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ حالانکہ آج بھی دنیا بھر میں 1.5 ملین لوگ روزگار کی غیر تسلی بخش حالت سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔[4]

بے روزگاری میں لگاتار اور بے مہار اضافے اور باروزگار افراد کی حالت زار اس قدر مخدوش ہونے کی وجہ سے غربت و افلاس کے خلاف جنگ اور پیشرفت بری طرح متاثر ہو رہی ہیں۔

---

[1] World Employment and Social Outlook Trinds, Internarional Labor Office, Geneva, 2016, pg1

[2] Ibid

[3] Ibid, pg 19

[4] Ibid, pg 16

مہنگائی اور افراط زر

افراط زر (Inflation) معاشیات کی ایک اہم اصطلاح ہے۔ کسی ملک کا مرکزی بینک اگر مقررہ حد سے زیادہ کرنسی نوٹ چھاپ لے، نتیجتاً پیسہ کم قیمت جبکہ اشیاء زیادہ قیمت ہو جائیں، اس صورت حال کو افراط زر کہا جاتا ہے۔

یعنی "کسی بھی معیشت میں موجود اشیاء (خرید و فروخت کے مقصد سے تیار ہونے والی اشیاء) کی قیمت میں مسلسل اضافہ کی شرح کو افراطِ زر کہا جائے گا"۔ یاد رہے افراط زر میں مسلسل اضافہ کا رجحان مہنگائی کی صورت میں سامنے آتا ہے، سرمایا داری نظام معیشت میں افراط زر کی موجودگی کو ایک قدرتی امر سمجھا جاتا ہے جو عمومی سطح پر اوسطاً 5 سے 6 فیصد سالانہ بتائی جاتی ہے۔

تاہم دیوالیہ ہو جانے والی معیشتوں میں افراط زر ہزار فی صد سے بھی تجاوز کر جاتا ہے، اس کو معقول حد میں رکھنا ہر ملک کے مرکزی بینک کی بنیادی ذمے داری ہوتی ہے۔ افراط زر کی بنیادی وجہ ایک ہی ہوتی ہے یعنی حکومت کا اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے زیادہ نوٹ چھاپنا۔

افراط زر بھی مہنگائی کے اسباب و علل میں سے ایک ہے۔ کسی بھی معیشت میں چیزوں، اشیاء اور ان پر میسر کی جانے والی خدمات کی قیمت کی سطح میں ایسا مسلسل اضافہ کہ جس میں کرنسی کی ویلیو وہی رہے اور اس میں کوئی اضافہ نہ ہو لیکن اشیاء ضروریہ کی قیمتیں اس کے مقابلے میں لگاتار بڑھتی رہیں۔ پس کسی بھی معیشت میں موجود اشیا کی قیمت جب لگاتار اضافہ ہو رہا ہو تو اس کو افراط زر کہا جائے گا۔[1] افراط زر میں مسلسل اضافہ کا رجحان مہنگائی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

افراط زر یا مہنگائی کے معیشت پر ان گنت منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ افراط زر کے شکار معاشرے میں ذخیرہ اندوزی اور احتکار کی وارداتیں زیادہ ہو جاتی ہیں چونکہ جب لوگوں کو خدشہ ہوتا ہے کہ ان کی جیب میں موجود پیسے کی قیمت کم ہو رہی ہے، مطلب یہ ہوا کہ انہیں اشیاء خریدتے وقت زیادہ پیسے ادا کرنے پڑ سکتے ہیں تو وہ ان اشیاء کا ذخیرہ اپنے پاس محفوظ کر لیتے ہیں تا کہ اضافی پیسے کی ادائیگی اور مہنگی اشیاء کی خریداری سے بچ سکیں[2]۔

---

[1] Personal Savings and Anticipated Inflation, George Bulkley, The Economic Journal, Vol: 9, p.124–135

[2] Inflation and Real Interest, James Mundell, Journal of Political Economy, Vol. 15, p. 280–83

اشیاء کی قیمتوں میں اضافے اور پیسے کی قدر میں کمی کے باعث بھی تنخواہ دار طبقہ بالخصوص اور عوام الناس بالعموم افراط زر یا مہنگائی کا شکار بنتے ہیں۔ پس وہ لوگ جن کی آمدنی اشیاء کی قیمتوں کے تناسب سے بڑھ نہیں رہی ہوتی آہستہ آہستہ مختصر مدت میں ہی غربت کا شکار بن جاتے ہیں۔

سود اور سودی معاملات

سود کسی بھی معاشرے میں اقتصادی ومالی اور اخلاقی ونفسیاتی بیماریوں کی اہم وجہ ہے۔مالی حوالے سے سود کے مضمرات نہایت واضح اور مسلم ہیں۔ معاشرے میں ارتکاز دولت کا مسئلہ ہو، معاشری ناہمواری یا غربت کے ایشوز ہوں ان سب کی بنیادی وجوہات میں سے ایک وجہ سود اور سودی نظام ہے۔

سود (رب و) کے حروف اصلی پر مشتمل ہے۔ اہل لغت نے اس کا معنی "زیادتی" یا "بڑھوتری" بیان کیا ہے

علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"الربا:الزیادة علی الراس المال،لکن خص فی الشرع بالزیادة علی وجه دون وجه"[1]

ترجمہ: اصل مال پر ادا کی جانے والا اضافہ ربا ہوتا ہے، وہ اضافہ اگر مشروط ہے تو سود ہ اور اگر غیر مشروط ہو تو سود نہیں ہے۔

یعنی اگر شرط لگائی جائے کہ اصل مال پر اس قدر اضافی ادا کرنا ضروری ہو گا تو یہ معاملہ سود کہلائے گا لیکن شرط نہیں لگائی گئی تھی اور قرض دار خود سے اضافی رقم پلٹا دے تو وہ رقم لینا ممنوع نہیں اور وہ سود بھی شمار نہیں ہو گا۔

ماہرین اقتصادیات نے سود کی تعریف یوں کی ہے:

"بانها المبلغ الذی یدفعه المقترض فی مقابل استخدام نقود المقرض"[2]

ترجمہ: یہ وہ رقم ہوتی ہے جو قرض دار قرض خواہ کے نقود کو استعمال کرنے کے عوض اس کو ادا کرتا ہے۔

علامہ مودودی سود کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ "قرض میں دیے ہوئے راس المال پر جو زائد رقم مدت کے مقابلے شرط اور تعیین کے ساتھ لی جائے سود ہے۔"[1]

---

[1] المفردات فی غریب القرآن، ص:294

[2] نظام الاسلام الاقتصادی: مبادی و قواعد عامة، محمد المبارک، دار الفکر، بیروت، لبنان، طبع 1980، ص37

مزید لکھتے ہیں: ”راس المال پر اضافہ، اضافہ کی تعیین مدت کے حساب سے کیا جانا اور معاملہ میں اس کا مشروط ہونا یہ تین اجزائے ترکیبی ہیں جن سے سود بنتا ہے۔ اور ہر وہ معاملہ قرض جس میں یہ تینوں اجزاء پائے جاتے ہوں ایک سودی معاملہ ہے۔ قطع نظر اس کے کہ قرض کسی بار آور کام میں لگانے کے لیے لیا گیا ہو یا کوئی شخصی ضرورت پوری کرنے کے لیے اور اس قرض کا لینے والا آدمی غریب ہو یا امیر“[2]

ربا کے عنوان کے بارے میں اگرچہ فقہاء کے الفاظ الگ الگ اور ذرا مختلف ہیں مگر تمام تعریفوں کا مقصود یہ بنتا ہے کہ اصل مال سے زیادہ مال واپس لینا اور اس زیادتی کو وقت کے عوض قرار دینا سود ہے۔

سود کی اقسام

سود کی دو بڑی قسمیں ہیں۔

الف) ربا النسیۃ

یعنی ادھار کے طور پر دی جانے والی رقم پر سود۔ اس کی تعریف یوں کی گئی ہے:

”ان تکون الزیادۃفی مقابل تاخیر الدفع“[3]

ترجمہ: (قرض کی واپسی کے وقت) وصول کی جانے والی اضافی رقم جو وقت کے مقابل میں لی گئی ہو (ربا النسیۃ کہلاتی ہے)

اس کو ربا الجاھلیۃ یا ربا القرآن بھی کہتے ہیں۔ یعنی وہ ربا جو ایام جاہلیت میں رائج تھا اور جس کی حرمت قرآن مجید سے صراحت کے ساتھ بیان کی ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی کے مطابق: ”کسی فرد کے ذمے کوئی رقم واجب الادا ہو جس کی ادائیگی کے لیے کوئی مدت مقرر ہو (اور قرض دار کسی وجہ سے مقررہ مدت تک اپنا قرض واپس لوٹا نہ سکے) اور پھر ادائیگی کی مدت میں اضافہ کیا جائے اور مدت کے اس اضافے کے مقابلے میں کوئی اضافی رقم وصول کی جائے۔“[4]

---

[1] معاشیاتِ اسلام، مولانا سید ابو الاعلی مودودی، اسلامک پبلی کیشنز پرائیوٹ لمیٹڈ، لاہور، ص 231

[2] معاشیات اسلام، مولانا سید ابو الاعلی مودودی، ص 232

[3] معجم المصطلحات والالفاظ الفقہیۃ، د محمود عبد الرحمن عبد المنعم، دار الفضیلۃ للنشر والتوزیع والتصدیر، قاہرہ، سن طبع ندارد، 2/117

[4] محاضرات معیشت و تجارت، ڈاکٹر محمود احمد غازی، الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، لاہور، طبع 2010، ص: 268

گویا کہ وقت کی قیمت وصول کرنے کا نام ربا النسیۃ ہے۔

(ب) ربا الفضل

فضل اور تفاضل کی اصطلاح عربی زبان میں کمی بیشی کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ الفاظ سے جو ظاہر ہو رہا ہے اس کے مطابق ربا الفضل سود کی وہ قسم ہے جس کا تعلق اجناس کی کمی یا بیشی سے ہوتا ہے۔

علامہ مودودی اس کی تعریف میں لکھتے ہیں: "ربا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کے دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو"[1]

دراصل یہ ایک ہلکے قسم کا یا مخفی قسم کا ربا ہے اور اس قسم کو اصل ربا کا راستہ روکنے کی خاطر شریعت میں ممنوع ٹھہرایا گیا، اس کا موقع و محل اس وقت پیش آتا ہے جب ایک ہی جنس کی دو چیزوں کو بدلنے کی ضرورت پڑے۔ البتہ ایک ہی جنس سے تعلق رکھنے کے باوجود ان کی نوعیتیں مختلف ہوں مثلا کھجور کی اعلی قسم کو کھجور ہی کی کسی عام قسم سے بدلنا۔

ربا الفضل کو بارٹر سیل یا بارٹر سود بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس میں اشیاء کی اشیاء کے بدلے خرید و فروخت ہوتی ہے البتہ مقدار کی کمی بیشی کے ساتھ۔ دراصل ہم جنس چیزوں کو کمی بیشی کے ساتھ ایک دوسرے سے بدلنے کے نتیجے میں اس قسم کے ذہن کو پرورش پانے کا موقع ملتا ہے جو بعد میں سود خوری جیسے حرام کا مرتکب ہو اور اصلی سود والے معاملے سے بھی اجتناب کو ضروری نہ سمجھے۔ لہذا شریعت نے اس کو حرام قرار دے کر فی الحقیقہ سود خوری کی طرف جانے والے تمام رستوں کو بند کر دیا ہے۔

سود کی اس قسم کی حرمت کی مصلحت اور علت ابو سعید خدری کی روایت کے اندر رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود وضاحت کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ فرمایا:

((لا تبیعوا الدرهم بدرهمین،فانی أخاف علیکم الرما (والرما هو الربا))[2]

ترجمہ: یعنی ایک درہم کو دو درہموں کے عوض نہ فروخت کرو کیوں کہ مجھے خوف ہے کہ تم سود خواری میں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

عبادہ بن صامت کی روایت میں آپ ﷺ نے سود کی اس قسم کو تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں:

---

[1] سود، مولانا ابو الاعلی مودودی، اسلامک کیشنز پرائیوٹ لمیٹڈ، لاہور، سن ندارد، ص 165

[2] مسند الامام احمد بن حنبل، احمد بن محمد ابن حنبل، مؤسسۃ الرسالۃ، طبع اول 1421ھ، 2/109

((الذهب باالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير باالشعير والتمر با التمر والملح باالملح---))[1]

ترجمہ: سونے کا مبادلہ سونے سے اور چاندی کا چاندی سے اور گیہوں کا گیہوں سے اور جو کا جو سے اور کھجور کا کھجور سے اور نمک کا نمک سے اس طرح ہونا چاہیے کہ جیسے کا تیسا اور برابر برابر اور دست بدست ،البتہ اگر مختلف اجناس کی چیزوں کا ایک دوسرے سے مبادلہ ہو تو پھر جس طرح چاہو بیچو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو جائے۔

یوں شریعت اسلامی آنے والے ایک ممکنہ ضرر اور نقصان سے بچنے کے لیے اس قسم کو مقدمۃً حرام قرار دیا ہے تا کہ معاشرے میں سود خور اذہان کی پرورش ہی نہ ہو سکے۔

سود کے معاشرے پر منفی اثرات

سود کسی بھی معاشرے کو مالی، اخلاقی، نفسیاتی حتی کہ طبیعی حوالے سے بھی زبردست نقصان پہنچاتا ہے۔ سود غریبوں کے معاشی استحصال کا سب سے خطرناک ذریعہ ہے۔ سود دراصل انفاق کی ضد ہے۔ انفاق کا محرک بلند ہمتی، ہمدردی، فیاضی، ایثار اور رحمدلی ہے، جب کہ سود کا محرک پست مزاجی، بے مروتی، استحصالی، خود غرضی اور تنگدلی ہے۔ انفاق کا مزاج افادہ ہے جب کہ سود کا مزاج استفادہ ہے[2]۔ لہذا اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ سودی شرائط پر مبنی قرض کے سبب اگر ایک طرف قرض لینے والے خستہ حال وتباہ حال ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف یہ معاملہ قرض کی رقم فراہم کرنے والے ساہوکاروں کی بداطواری اور بداخلاقی کا باعث بنتا ہے۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ حالات کا ستایا ہوا قرض دار قرض تو اپنی مشکلوں کو کم کرنے کی خاطر لیتا ہے مگر سود پر قرض لینے کے بعد اس مشکل میں پھنس جاتا ہے کہ محدود آمدن کیوجہ سے وہ خود کو کبھی ساہوکار سے آزاد نہیں کرا سکتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جتنی رقم اس نے بطور قرض لی تھی اس کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ رقم ادا کر کے بھی وہ اصل رقم کو بے باق

[1] المسند الصحیح المختصر بنقل العدل عن العدل الی رسول اللہ ﷺ المعروف صحیح مسلم، مسلم بن حجاج نیشاپوری، احیاء التراث العربی، بیروت، طبع ندارد، باب الصرف وبیع الذھب بالورقۃ، حدیث 3، 1587/1211

[2] معاشی مسائل اور قرآنی معلومات (مقالات سیمینار)، قرآن کی چند معاشی تعلیمات اور معاشرے سے ان کا ربط، محمد عمر اسلم اصلاحی، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، اتر پردیش، طبع اول 2011، ص79

کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ معاشرے کی اس صورت حال کے بارے میں ڈاکٹر انور اقبال قریشی لکھتے ہیں: "قرض دار کو ساہو کار اسی طرح سہارا دیتا ہے جیسے رسی، اس شخص کو جسے پھانسی دی جائے"[1]

علم کی سطح پر سود کی بے پناہ استحصالی کردار کو نامور معیشت دان کینز نے بھرپور قوت کے ساتھ بے نقاب کیا ہے کہ جسے تمام اہل علم اس کی صدی کا سب سے بڑا ماہر معاشیات تسلیم کرتے ہیں۔ کینز نے بھرپور طریقے سے اس سچ کو بیان کیا کہ جب تک سود خوری کو کسی غیر تکلیف دہ طریقہ سے معدوم نہیں کیا جاتا اس وقت تک دنیا سے بے روز گاری ختم نہیں کی جا سکتی۔ کینز لکھتا ہے: "ہمارا اعلیٰ ترین مفاد اس میں ہے کہ ہم شرح سود کو اتنا گھٹالیں کہ جہاں سب لوگوں کو روز گار میسر آئے۔ جہاں سود خوار طبقہ کسی غیر تکلیف دہ طریقہ سے معدوم کر دیا جائے تاکہ سرمایہ دار کی وہ استحصالی قوت ختم ہو جائے جس سے سرمایہ کی کم یابی کی قیمت وصول کر کے اختیار حاصل کرتا ہے۔"[2]

سود اور سودی کاروبار کو چاہے صارف کی نگاہ سے دیکھا جائے چاہے تجارتی نکتہ نگاہ سے، ہر دو صورت میں سودی بینکاری معیشت کے لیے خود ایک بڑا مسئلہ ہے۔ مشہور زمانہ اور مقتدر ماہر معیشت ہیبلر (Haberler) لکھتے ہیں:

> “The theory of interest has for long time been a weak spot in the science of economies, and the explanation and determination of interest rule still give rise to more ohs agreements among economists than any other branch of economy theory.”[3]

> ترجمہ: سود کا نظریہ اقتصاد کی سائنس میں ہمیشہ سے ایک کمزور نقطہ رہا ہے، جو سود کی شرح کو بیان کرنے اور اس کا تعین کرنے میں ماہرین کے مابین، اقتصاد بمقابلہ عام اقتصادی نظریہ کے کہیں زیادہ اختلاف رائے کو سامنے لاتا ہے۔

اقتصادی اصولوں، اخلاقی عناصر اور عقلی بنیادوں پر مال کو کمانے اور اس کو صرف کرنے کے تمام معیارات کاملاً موجود ہیں۔ سود ان تمام معیارات و اصولوں کی روح کی بری طرح پامال کرتا ہے اور کسی اخلاقی یا عقلی قاعدے قانون کی رعایت نہیں کرتا۔ شہید باقر الصدر اس حوالے سے لکھتے ہیں: ”سود کے ناجائز ہونے میں بھی وہی دونوں اقتصادی اور اخلاقی عناصر کارفرما ہیں۔ اقتصادی

---

[1] اسلام اور سود، ڈاکٹر انور اقبال قریشی، اسلامک بک سروس لاہور۔ طبع سوم 1978، ص 233

[2] سود کی متبادل اساس، شیخ محمود احمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع دوم 1990ء، ص 75

[3] Prosperity and Depression, Gottfried Haberler, United Nations Late success, New York, 1946, p 95

اعتبار سے دولت کا اضافہ محنت کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور اخلاقی اعتبار سے محنت کو اجتماع کے صلاح پر صرف ہونا چاہیے۔ دولت کا اضافہ محنت کی بنیاد پر ہونا چاہیے اور اخلاقی اعتبار سے محنت کو اجتماع کے صلاح پر صرف ہونا چاہیے۔ معاشرہ کی بربادی کو اس کا ہدف و مقصد نہیں بننا چاہیے، اور سود میں یہ تمام باتیں قہری طور پر پائی جاتی ہیں۔"[1]

سود کے منفی پہلوؤں کی فہرست نہایت طویل ہے۔ یہ سود ہی کا مرض ہے جو لوگوں کو صحت مند اقتصادی سرگرمیوں اور کسب و ہنر کے معاملات سے روکتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے جب کسی شخص کو گھر بیٹھے اور بغیر مشقت کے اتنا معقول معاوضہ سود کی شکل میں مل رہا ہے اس کے لیے کسب و تجارت اور مشقت طلب پیشوں کی طرف جانے کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے پاس موجود رقم سے دیگر لوگوں کے فوائد منقطع ہو کر اس کی ملکیت میں موجود رقم عملاً ملکی معیشت و تجارت کے معاملات سے قطع تعلق ہو جاتی ہے۔ اور یوں یہ سود کے لیے استعمال ہونا والا روپیہ پیسہ معاشرے میں منصفانہ تقسیم دولت کے اصول کے نفاذ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

سود کی موجودگی میں وسائل کی منصفانہ تقسیم کا امکان دور تک موجود نہیں ہے۔ مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں: "سود بہر صورت تقسیم دولت کے توازن میں بگاڑ پیدا کرتا ہے کیونکہ جو شخص کسی دوسرے سے قرض لے کر کاروبار کرتا ہے اگر اسے کاروبار میں نقصان ہو تو قرض دینے والا بہر صورت اپنے سود کا مطالبہ جاری رکھتا ہے۔ بلکہ سود در سود ہو کر اس کی واجب الادا رقم کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے اس طرح قرض لینے والا سراسر نقصان میں ہے اور قرض دینے والا سراسر فائدے میں۔"[2]

سود کا وجود کسی بیمار، مضطر اور غیر ہموار معاشرے میں ہی ہو سکتا ہے جہاں امراء کا مال و پیسہ ان کی تجارات اور نفقات کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہو جب کہ اسی مجتمع میں رہنے والے غریب آدمی کے لیے بہتری اور ترقی کے تمام رستے مسدود ہو چکے ہوں اور رہی سہی کسر ان سودی معاملات نے نکال دی ہو کہ جس کا سہارا اس نے بحالت مجبوری لیا ہو۔ اس کی زندگی کا آنے والا ہر دن اس کے لیے زیادہ مشکل اور مالی حوالے سے زیادہ بھاری ہے جب کہ سود پر پیسہ دینے والا امیر طبقہ آئے روز بغیر محنت و اکتساب کے مزید مال و دولت بٹورتا جاتا ہے اور یوں دولت کا سارا رخ امراء کے محلوں کی جانب ہو جاتا ہے اور غریب کے حصے میں امراض، تنگدستی ،فاقہ کشی اور احساس محرومی کے علاوہ کچھ نہیں بچتا اور اس پر مستزاد یہ کہ آئے روز یہ مشکلات اور مصائب بڑھتے ہی ہیں کم ہوتے نظر نہیں آتے۔ مذکورہ اسباب کے سبب شریعتِ محمدی نے اس کی حرمت کے اقدامات کیے ہیں۔

---

[1] اقتصادنا، سید محمد باقر الصدر، (مترجم: ذیشان حیدر جوادی) محمد علی فاؤنڈیشن، اسلام آباد، سن ندارد، ص:74

[2] اسلام اور جدید معیشت و تجارت، مفتی محمد تقی عثمانی، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، طبع 2010، ص61

حفظ الرحمن سیوہاروی رقم طراز ہیں:"خرید و فروخت اوورلین دین کے معاملات میں کوئی اس طرح کا معاملہ جائز نہیں جس کے سبب فاسد نظامِ معیشت بروئے کار آئے یا اس کو کسی قسم کی بھی اعانت پہنچے یا محبت اور معیشت کے لیے جائز جدوجہد بے حقیقت ہو کر رہ جائے اور اس طرح سرمائے اور محنت کے درمیان اعتدال اور توازن باقی نہ رہے۔اسی لیے اس (اسلام) نے (ربا) یعنی سود کے ہر قسم کے تجارتی کاروبار، قمار (جوا) کی تمام ظاہری و خفی اقسام و اصناف، احتکار و اکتناز کی تمام اشکال اور اسی طرح کی عقود فاسدہ کی دوسری تمام صورتوں کو ناجائز و مردود قرار دیا ہے۔"[1]

سودی قرض لینے کی ممکنہ تین اشکال

جدید معیشت میں سود اور سودی کاروبار کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔سود کا تعلق معاشی زندگی کے ان معاملات سے ہے جن میں کسی نہ کسی طور پر قرض کا لین دین ہوتا ہے۔ قرض کسی بھی معاشرے، قوم حتیٰ کہ ممالک کی ضرورت اور مجبوری ہے۔اس کے بغیر دنیا کی اکثر آبادی کا اقتصادی سلسلہ نہیں چل سکتا۔جب کہ دوسری طرف حالت یہ ہے کہ قرض اور سود ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم حد تک جڑ چکے ہیں۔ قرض لینے کی ممکنہ وجاہات کا پتا چلایا جائے تو ماہرین معیشت قرض اٹھانے کی چار ممکنہ وجوہات کو بیان کرتے ہیں۔اور ان تمام صورتوں میں اس سے بلواسطہ یا بلاواسطہ متاثرین میں بڑی تعداد کا تعلق فقراء اور غرباء کے طبقے سے ہے۔

مختلف مقاصد کو پورا کرنے کی خاطر لیے جانے والا قرض ممکنہ طور پر تین اقسام پر مشتمل ہو سکتا ہے۔

پہلی قسم

اس صورت کا تعلق ایسے حالات سے ہے کہ جب کوئی بھی شخص کسی مجبوری یا حاجتمندی کی وجہ سے قرض کے لیے اپناہاتھ بڑھاتا ہے۔ مثلا اپنے یا اپنے خاندان کے علاج معالجے کے لیے، یا مثلا اپنی بیٹی یا بیٹے کی شادی کے لیے اس کو قرض کی ضرورت پڑے۔یا مثلا مالی واجبات کی ادائیگی جیسا کہ اپنا قرض ی ٹیکس وغیرہ ادا کرنے کے لیے قرض کی ضرورت پڑی ہو یا مثلا مکان یا گھر کی تعمیر وغیرہ کے لیے وہ قرض اٹھانے پر مجبور ہو وغیرہ وغیرہ۔یعنی وہ قرضے جو ضرورت مند افراد اپنی ذاتی ضروریات کے لیے لیتے ہیں۔

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام، حفظ الرحمن سیوہاروی، ص54

بظاہر اس پہلی صورت سے تعلق رکھنے والے افراد یا تو بے روزگار ہوتے ہیں یا نہایت قلیل آمدنی کا حامل طبقہ ہوتا ہے۔ اپنی مجبوریوں کا پیٹ بھرنے اور عارضی طور پر اپنا مسئلہ حل کرنے کے لیے یہ قرض کا سہارا لیتے ہیں لیکن یہ قرض بعد میں مالی بوجھ ثابت ہوتا ہے اور یہ اس کے بوجھ اور شرح سود کی ادائیگی کے بوجھ کے نیچے ہمیشہ کے لیے دب جاتے ہیں۔

اسی طبقہ سے سود لینے اور ان پر سود کے پڑنے والے منفی اثرات کے بارے میں سید شیرازی رقم طراز ہیں:

"فاخذ الربا منه حتى ولو بنسبة قليلة يعني تشديد الضغوط عليه، و زيادة حالة الفقر لديه، او تحوله من الطبقة المتوسطة الى الطبقة الفقيرة"[1]

ترجمہ: اس طبقہ کے افراد سے سود لینے کا مطلب، اگرچہ سود کی مقدار نہایت قلیل ہی کیوں نہ ہو، یہ ہوگا کہ ان کو سخت مالی دباؤ سے دوچار کر دیا جائے یا ان کو مزید تنگدستی میں دھکیل دیا جائے یا پھر ان کو متوسط طبقہ کے افراد سے نکال کر غریب طبقے میں شامل کر دیا جائے۔

تو معلوم ہوا کہ سود یا سودی معالات کی وجہ سے یہ طبقہ بری طرح متاثر ہوتا ہے اور سود پر قرض لینے کی وجہ سے ان کے حالات بہتری کی بجائے ابتری کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔

دوسری قسم

سود یا سودی قرض لینے کا مقصد اپنے مال و دولت یا صنعت و تجارت کو مزید فروغ و توسیع دینا ہو۔

بظاہر اس طرح کا قرض لینے والا طبقہ با اختیار و با روزگار اور مالی حوالے سے بہتر حالات پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر ان کے سود پر مشتمل معاملات کا برا اثر ذاتی طور پر اس طبقے پر نہیں غرباء و فقراء اور نچلے طبقے پر ہوتا ہے۔ قرض کے فوائد و ثمرات سود لینے والے افراد کو حاصل ہوتے ہیں جب کہ تمام مضمرات ایک بار پھر غریب طبقے پر آن پڑتے ہیں۔ حالانکہ اس سودی معاملے سے ان کا دور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔

سود کی اس صورت میں غرباء کے متاثر ہونے کے بارے میں سید شیرازی لکھتے ہیں:

---

[1] استر تجیۃ مکافحۃ الفقر، السید مرتضی حسین الشیرازی، ص99

”فهو من اجل ان يعوض نسبةالربا المفروضة عليه يضطر اما لتخفيض اجور العمال، وهم عادة من ذوی الدخل المحدود،وامالزيادة قيمة منتجاته، مما ينعكس سلبا على الفقراء“[1]

ترجمہ: سود پر قرض لینے والے افراد مطلوبہ رقم واپس کرنے کے لیے یا تو اپنے پاس کام کرنے والے مزدوروں کی اجرت کم کرنے کا اقدام کرتے ہیں، حالانکہ پہلے ہی ان کی آمدن نہایت قلیل ہوتی ہے۔ یا پھر وہ اپنی مصنوعات کی قیمت میں اضافہ کر دیتے ہیں جس کے رزلٹ کے طور پر قوتِ خرید کے کم ہونے اور بالآخر قیمتوں میں اضافے سے سب سے زیادہ متاثر غرباء ہی ہوتے ہیں۔

تیسری قسم

قرض لینے کی تیسری ممکنہ صورت اس قرضے کی ہے کہ جو حکومتیں اپنے حکومتی و ریاستی امور چلانے کے لیے دوسرے ممالک سے یا بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے لیتی ہیں۔

جب ممالک غیر معولی حالات، مشکلات اور مصائب کا شکار ہو جاتے ہیں اور اس ملک کے ذاتی ذرائع اور وسائل ان خطرات اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کے لیے کافی نہ ہوں تو عموما حکومتیں اس طرح کے حالات میں دیگر ممالک یا بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے قرض لینے پر مجبور ہوتی ہیں۔ عموما اس قسم کے قرضے بہت بڑی مالیت کے ہوتے ہیں کہ جن کا حجم بسا اوقات اربوں کھربوں ڈالرز تک جا پہنچتا ہے۔ البتہ اتنی بڑی مقدار میں لیے گئے قرضوں کا سود بھی سالانہ کروڑوں ڈالرز پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ قرضے اتنے بڑی مالیت کے ہوتے ہیں کہ بسا اوقات قرض دینے والے ادارے یا حکومتیں اپنی من مانی شرائط بھی عائد کرتے ہیں اور نتیجۃ قرض لینے والے ممالک اور حکومتیں ان شرائط کو قبول کرنے اور بعض اوقات تو اپنے محاصل میں سے کسی محصول مثلا حکومتی پراپرٹی، چنگی، نمک، شکر یا کسی اور مد کی آمدنی کو رہن رکھ دیتے ہیں۔

ممالک یا حکومتوں کی طرف سے لیے جانے والے مختلف قرضوں کی مختلف نوعیتیں ہو سکتی ہیں مثلا ان میں سے بعض کا مقصد رفاہی و ترقیاتی امور یا پھر رفاہ عامہ وغیرہ کے کام ہوتے ہیں مثلا سڑکیں، نہریں، پل یا دیگر ترقیاتی نوعیت کے کاموں کے لیے۔ جب کہ بعض دیگر غیر نفع آور اغراض کے لیے ہوتے ہیں مثلا جنگی قرضے۔ وجہ جو بھی ہو بظاہر یہ قرضے ترقیاتی و رفاہی کاموں اور امور مملکت کو بہترین اور مثالی انداز میں چلانے کی خاطر لاٹھائے جاتے ہیں مگر حقیقت امر یہ ہے کہ جس قوم کے مالی وسائل اور

---

[1] استر تحیۃ مکافحۃ الفقر، السید مرتضی حسین الشیرازی، ص99

ذرائع کی قلت کے باعث بیرونی قرضوں کا بار اٹھایا گیا ہے وہ کسی طور اس قابل نہیں ہو سکتی کہ اصل قرض کے ساتھ ساتھ سالانہ کئی کروڑ ڈالر بطور سود ادا کرے۔

لہذا بادل نخواستہ بیرونی قرضے بھی خوشحالی اور حالات کی بہتری کی بجائے غربت، تنگدستی اور اس جیسے مسائل مزید گھمبیر کر دیتے ہیں۔

علامہ مودودی لکھتے ہیں: "جو قوم کوئی بڑی رقم اس طور پر قرض لیتی ہے بہت ہی کم ایسا ہوتا ہے کہ اس کی وہ مشکلات رفع ہو جائیں جن سے نکلنے کے لیے اس نے قرض لیا تھا، اس کے برعکس اکثر یہی قرض اس کی مشکلات میں مزید اضافہ کا موجب ہو جاتا ہے۔ قرض کی اقساط اور سود ادا کرنے کے لیے اسے اپنے افراد پر بہت زیادہ ٹیکس لگانا پڑتا ہے اور مصارف میں بہت زیادہ کمی کر دینا ہوتی ہے۔"[1]

تو معلوم ہوا کہ سود یا سودی معاملات میں چاہے جو بھی طبقہ ملوث ہو اس کی قیمت فقراء اور غریب طبقے کو ہی چکانا پڑتی ہے اور کسی بھی طرح کے سودی معاملات سے متوسط اور غریب طبقہ بالواسطہ یا بلاواسطہ بری طرح کچلا جا رہا ہے۔ جس کا نتیجہ غربت و پسماندگی اور معاشی مشکلات میں اضافے کی صورت میں نکلتا ہے۔

---

[1] سود، مولانا مودودی، ص126

فصل سوم

غربت کے معاشرتی واجتماعی اسباب

غربت بطور سماجی اور معاشرتی مسئلہ کے ایک ایسا ناسور اور گہرا زخم ہے جو ثقافت اور معاشرے کے ہر پہلو کو متاثر کرتا ہے۔اس مسئلے کا شکار معاشرے کے وہ افراد بھی ہیں جن کی آمدنی نہایت قلیل ہے یا پھر جو بے روزگار ہیں اور جن کی آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں ہے،اور افراد بھی کہ جن کے پاس زندگی کی بنیادی و اساسی ضروریات جیسا کہ تعلیم، صحت کی مناسب دیکھ بھال، فیصلے کرنے کی صلاحیت، پینے کے لیے صاف پانی، حفظان صحت، امن عامہ، سڑکوں، نقل و حرکت، اور مواصلات جیسی سماجی سہولیات کی کمی ہے۔

علاوہ ازیں یہ غربت ہی ہے جو معاشرے میں مایوسی، ناامیدی، بے چینی، مردہ دلی اور بے حسی جیسے جذبات کو جنم دیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا معاشرہ ان کی لپیٹ میں آجاتا ہے، پھر ایسے معاشرے اخلاقی و سماجی بیماریوں کی آماجگاہ اور ٹھکانہ بن جاتے ہیں۔ غربت کے وجوہات و اثرات کا مطالعہ کر کے یہ امر بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ یہ معاشی مسئلے کی نسبت معاشرتی مسئلہ زیادہ ہے اور اس کا حل بھی معاشرتی و سماجی عوامل کی مدد سے بہتر انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

غربت و افلاس کے مسئلے سے نبرد آزما ہونے کے لیے اس کی علامات و اسباب و وجوہ کا جاننا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے عوامل کو شناخت کرنے کے بعد ان کا سد باب بھی کرنا ہو گا۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ چونکہ غربت صرف مالی مسئلہ نہیں ہے لہذا صرف غریب افراد کو صرف پیسے اور مالی امداد مہیا کر دینا اس کا حل ثابت نہیں ہو سکتا، بلکہ یہ صرف عارضی طور پر اس کی علامات و وجوہات کا خاتمہ کر سکتی ہے مستقل بنیادوں پر حل نہیں۔لہذا غربت سماجی مسئلہ ہونے کے ناطے ایک سماجی و معاشرتی حل کا تقاضہ کرتی ہے۔

غربت کے سماجی و معاشرتی اسباب و عوامل، پوری انسانی تاریخ کے صفحات پر بکھرے پڑے ہیں۔ غربت کی عام فہم معاشرتی وجوہات میں ملکی معیشت میں مندی کی کیفییت کا ہونا، تعلیم کی کمی، طلاق کی شرح میں اضافہ جو کہ خواتین اور بچوں میں غربت کا سبب بنتا ہے، نیز آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ، ایڈز اور ملیریا جیسی مہلک بیماریاں، دہشت گردی اور ماحولیاتی مسائل جیسا کہ بارش کا نہ ہونا، قحط سالی، سیلاب اور بارشیں وغیرہ شامل ہیں[1]۔ اس کے علاوہ استعماری حربے، جنگیں اور فتوحات کی کوششوں نے بھی انسانی معاشرے کو غربت ہی کے تحائف سے نوازا ہے۔[2] بہت سارے ممالک میں سخت موسمی حالات اور قدرتی موسمی آفات

[1] African Poverty at the Millennium: Causes, Complexities, and Challenges, Howard White & Tony Killick , Washington D.C, World Bank. p. 27

[2] Inside the Third World: The Anatomy of Poverty , Paul Harrison, New York, Penguin Books. 3rd edition, p. 20

بھی غربت کی ایک وجہ ہیں۔خشک سالی، طوفانی بارشیں اور سیلاب غربت کے بڑے اسباب میں سے اہم سبب شمار کیے جاتے ہیں۔موسمی قدرتی آفات تک جب میڈیا کی رسائی نہیں ہوتی تو وہاں ان حالات کے ساتھ لڑنا بالخصوص زیادہ مشکل امر بن جاتا ہے چونکہ ایسے علاقوں میں نہ تو فلاحی سرگرمیاں عمل میں لائی جاتی ہیں اور نہ ہی بعض اوقات حکومتی مالی امداد ان متاثرہ افاد تک پہنچ پاتی ہے۔[1]

انٹرنیشنل فوڈ پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ(International Food Policy Research Institute)کی ایک تحقیق کے مطابق غریب افراد کا تعلیم اور اشیاء ضروریہ کی خرید و فروخت کے لیے سرمایہ کاری نہ کر سکنا، آمدنی کا نہائت محدود و قلیل ہونا اور بعض صورتوں میں غربت کا نسل در نسل وراثت میں منتقل ہونا غربت کے اسباب میں سے اہم سبب اور علت ہیں، صرف یہی نہیں بلکہ اقلیتوں کے ساتھ اداروں میں ہونے والا نسلی امتیاز، چھوٹی ذاتوں اور قبیلے کے افراد نیز معذور یا صحت کے مسائل سے دوچار خواتین اور بچوں کے تعلیمی اداروں اور تجارتی مراکز میں ہونے والا امتیاز بھی غربت و افلاس کی اہم وجہ ہے۔[2]

بہت سارے سماجی و معاشرتی عوامل بھی غربت کی پیدائش اور ترویج میں ایک اہم سبب کا کردار ادا کرتے ہیں۔مثلاً کسی بھی معاشرے کا نظام تعلیم اس کی معاشیات کے لیے ایک اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔لہٰذا ایک تباہ حال، ناکارہ اور غیر عملی نظام تعلیم نہ صرف یہ کہ معاشرے کی ترقی و تعمیر کا انجام دینے سے قاصر ہے بلکہ معاشرے کی غربت میں ایک اہم عامل کے طور پر کردار ادا کرتا ہے۔پس وہ لوگ جو اس نظامِ تعلیم سے ہو کر اپنی عملی زندگی میں قدم رکھیں گے تو چونکہ وہ کوالٹی ایجوکیشن، مطلوبہ مہارتوں اور ضروری معلومات سے عاری ہوتے ہیں لہٰذا وہ کبھی اس معیار کو نہیں پہنچ پاتے جو ملازمتوں نیز ملک کے ترقیاتی عمل کے لیے ضروری ہوتا ہے۔لہٰذا کسی بھی معاشرے کا نظام تعلیم اس ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔لیکن اگر تعلیم کے نظام میں ہی سقم اور خرابیاں پیدا ہو جائیں تو یہ بھی باقی اسباب کے ساتھ مل کر غربت کے پیدا ہونے اور پھیلنے کا سبب بن جاتا ہے۔

---

[1] http://www.bbc.com/news/science-environment-24538078 Retrived: 15-7-2017

[2] Characteristics and causes of severe poverty and hunger, Akhter U. Ahmed, Ruth Vargas Hill, Lisa C. Smith, and Tim Frankenberger, International Food Policy Research Institut, August 12, 2011. Retrieved 15 July 2017

جنگ، فرقہ واریت، دہشت گردی اور تشدد بھی کافی حد تک غربت کی وجوہات میں سے ایک وجہ ہے۔ غربت، انتہا پسندی اور تشدد کا آپس میں گہرا ربط ہے، ایک سروے میں جب لوگوں سے دریافت کیا گیا ہے کہ لوگ کیوں تشدد اور جرم کا رستہ اپناتے ہیں تو دو تہائی لوگوں کا یہ ماننا تھا کہ یہ سب غربت اور بے روزگاری کے سبب ہوتا ہے۔ دراصل تشدد اور انانیت چاہے مذہب کے نام پر ہو یا سیاست کے نام پر اس کا نتیجہ غربت ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں سیاسی تشدد، جرائم اور غیر یقینی صورت حال نے بہت سارے ممالک کو متاثر کیا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اِن ممالک میں غربت کی سطح غیر متشدد ممالک کی نسبت دگنی ہے۔[1]

ویسے تو فقر و افلاس کے معاشرتی و سماجی اور انفرادی و اجتماعی اسباب کثیر ہیں لیکن مجملہ اہم اسباب کا تذکرہ کیا جارہا ہے۔

آمدن کا غیر موزوں اور نامناسب خرچ

معاشیات میں کسب معاش کے بعد دوسرا اہم مسئلہ اس کے صرف و خرچ کا ہے۔ جس طرح مال و دولت کمانا باقاعدہ منصوبہ بندی، ذہانت اور انتھک محنت والا مشکل کام ہے، ویسا ہی یا اس سے بھی زیادہ مشکل کام کمائی گئی دولت کو مناسب اور متوازن انداز میں خرچ کرنا ہے۔ اس لیے کہ چاہے کتنی زیادہ دولت ہی کیوں نہ اکٹھی کرلی جائے اگر اس کو مناسب طریقے سے خرچ نہ کیا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ فقر و افلاس اور غربت و تنگدستی کی صورت میں نکلتا ہے۔ جیسے دولت کے ڈھیر اکٹھے کر کے اس کو فضول خرچیوں اور فضول کاموں میں خرچ کرنا غیر مناسب ہے ویسے ہی جمع شدہ دولت کو اصلا استعمال میں نہ لانا اور بخل اپنا لینا بھی غیر اخلاقی کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام انفرادی سطح پر فضول خرچی اور بخل دونوں کو مساوی طور پر غیر شرعی اور غیر اخلاقی و غیر انسانی کام سمجھتا ہے اور اپنے ماننے والے کو ان دونوں کاموں سے رکنے کی تعلیم دیتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾[2]

ترجمہ: اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کرلو (کہ کسی کچھ دو ہی نہیں) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سبھی دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ

ایک اور جگہ ارشاد پروردگار ہے:

﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾[3]

---

[1] Third World: The Anatomy of Poverty, Paul Harrison, Penguin Books, 3rd Edition, p. 20

[2] سورۃ الاسراء:17/ 29

[3] سورۃ التوبہ:9/ 34

ترجمہ: اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کے رستے میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو اس دن عذاب الیم کی خبر سنادو

قرآن مجید ایک اور جگہ فضول خرچی کے حوالے سے انتہائی سخت موقف اپناتے ہوئے کہتا ہے:

﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا - إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ﴾[1]

ترجمہ: اور فضول خرچی سے مال نہ اُڑاؤ، کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں۔

ان آیات میں اپنی آمدن کو صرف و خرچ کرنے کے واضح احکامات موجود ہیں۔ آمدنی کی نامناسب تقسیم و خرچ ہی فقر و افلاس کا بنیادی سبب تصور کیا جاتا ہے۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اموال کے صرف و خرچ میں اعتدال کے بارے میں لکھتے ہیں: "صرف و خرچ میں میانہ روی اختیار کرنا ضروری ہے۔ عمومی طور پر یہ ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ خرچ آمدنی سے آگے نکل جائے اور بعد میں حاجت کے وقت معاشرے میں لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے پڑیں۔ اس کے برعکس حتی الامکان اس کی سعی کرنی چاہیے کہ ان تمام اجتماعی حقوق کے ادا کے ساتھ ساتھ، جو غنی ہونے کے سبب پروردگار عالم نے اس پر عائد کیے ہیں، اپنی اور گھر والوں کی ضروریات کے واسطے کچھ پس انداز ہو۔ نیز یہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ بخل اور تقتیر کو کام میں لائے اور خود اپنے اوپر اور اپنے واجب الکفایہ افرادِ خانہ کے اوپر عطاء الٰہی کے باوجود معیشت کو تنگ کرے۔"[2]

واقعی امر ہے کہ اگر اکتساب دولت کے بعد اس کو پانی کی طرح بہایا جائے اور شاہ خرچیوں پر اڑا دی جائے تو ایسا کرنے والے افراد لازمی طور پر غربت کو اپنی طرف دعوت دے رہے ہوتے ہیں۔ اس کے بالعکس اگر اس کی ترسیل اور بہاؤ کو روک دیا جائے اور بخل کا عملی مظاہرہ کر کے دولت کو صرف اپنی دسترس میں ذخیرہ کیا جاتا رہے اور مزید سرمایہ کاری کے دائرہ کار سے باہر نکال دیا جائے تو وہ دولت عملاً ایک ہاتھ میں پابند ہو جاتی ہے، اور معاشرے کے دیگر افراد کے تعامل سے دور ہو جاتی ہے۔ اگر تمام دولت منداس طرح کا رویہ اپنالیں تو اس قسم کے بخل کا مقصد معاشرے کے دیگر افراد کو حصول دولت کے مواقع سے محروم کرنا ہو گا۔

صرف و خرچ میں تبذیر و تقتیر دونوں معیشت فاسدہ کی علامت ہیں۔ چنانچہ رفیق مصری لکھتے ہیں کہ:

---

[1] سورۃ الاسراء:17 / 26-27

[2] اسلام کا معاشی نظام، حفظ الرحمن سیوہاروی، ص69-70

"فالتبذير يؤدى الى افتقار الشخص،والتقتير يؤدى الى افتقار الآخرين"[1]

ترجمہ:فضول خرچی فرد کی ذات کو فقیر بنا دیتی ہے،جب کہ کنجوسی و بخل دوسرے افراد کے افتقار کا سبب بنتے ہیں۔

یوں صاحب ثروت افراد کے پاس مال و دولت کو خرچ کرنے کا سلیقہ نہ ہونا معاشرے میں فقر و افلاس کی ایک اہم وجہ بن جاتا ہے۔زید رمانی اس بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"يجمع الاقتصاديون على ان مشكلة العالم هى مشكلة سوء التوزيع المسببة لمشكلة الفقر،واللوم يقع على النظام الاقتصادى والأنظمة الاجتماعية بشكل مباشر فيما يتعلق بالجوع و اسبابه والفقر و اشكاله"[2]

ترجمہ:ماہرین معیشت کا اتفاق ہے کہ اقوام عالم کے مسائل میں سے سنگین ترین مسئلہ آمد کی غلط اور نامناسب تقسیم و خرچ ہے اور یہی چیز فقر و افلاس کا سبب بنتی ہے۔جس کا براہ راست اثر معاشرے پر اور معاشرے میں رائج اقتصادی نظام کے فقر وافلاس اور بھوک سے متعلق معاملات پر پڑتا ہے۔

غربت و افلاس یا اس جیسے دیگر مسائل کی وجہ ذرائع و وسائل کی کمی کو قرار نہیں دیا جا سکتا۔دنیا میں آج جتنے بھی وسائل یا ذرائع پیداوار موجود ہیں وہ بنی نوع انسان کی تمام ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کافی ہیں۔لہذا معاشرے کے ایک بڑے طبقے کی غربت و محرومی اور ان کو وسائل کی عدم دستیابی کی وجہ وسائل کی کمی کو ہرگز قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کی اصل وجہ دنیا کی مجموعی پیداوار کی نامناسب اور غیر موزوں تقسیم اور استعمال ہے۔

محمد مرعی لکھتے ہیں:

"الاشكالية فى سوء التوزيع هذه المنتجات،وليس فى كمية انتاجها"[3]

ترجمہ:مسئلہ پیداوار کی کمی کا نہیں بلکہ پہلے سے موجود پیداوار کی غیر مناسب تقسیم اصل مسئلہ ہے۔

---

[1] اصول الاقتصاد فی الِاسلام،رفیق المصری،دار القلم,سوریا،طبع سوم1420ھ،ص21

[2] اقتصاد الفقر بؤس وازمات،زید الرمانی،مکتبۃ النشر،السعودیۃ،طبع اول1424ھ،ص64

[3] الحاجات البشریہ،محمد مرعی،دار البحوث للدراسات الاسلامیہ واحیاء التراث،الامارات العربیہ المتحدہ،دبی،طبع 2001،ص189

لہذا انسان کی مالی مشکلات کی بنیادی وجہ وسائل کی کمی ہر گز نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ وسائل کے نامناسب اور غیر عادلانہ تقسیم کا ہے۔ اللہ تعالی نے اپنی پیدا کردہ مخلوقات کی تعداد اور اپنی عطا کردہ نعمات کی مقدار میں توازن رکھا ہے۔ اس کی سی گئی نعمتیں اس کی پیدا کی گئی مخلوق کی ضروریات سے کم نہیں بلکہ اس کی احتیاجات کے عین مطابق ہیں۔ البتہ اس کی مخلوق میں سے چند لوگ بہت سارے دیگر لوگوں کا حصہ بھی بٹور کھانے کا ظالمانہ طرز عمل اپنائے ہوئے ہیں، یوں وسائل کی تقسیم میں عدم توازن پیدا ہو گیا ہے جو معاشی ناہمواری کا سبب بن رہا ہے۔

علامہ مودودی لکھتے ہیں:"اسلام نے زائد از ضرورت دولت کے جمع کرنے کو معیوب کہا ہے۔ اسلام کے مطالبے کے مطابق جو کچھ مال تمہارے پاس ہے یا تو اسے اپنی ضروریات خریدنے پر صرف کرو یا کسی جائز کاروبار میں لگاؤ یا دوسروں کو دو کہ وہ اس سے اپنی جائز ضروریات خریدیں اور اس طرح پوری دولت برابر گردش میں آتی رہے۔"[1]

معاملات صرف و خرچ اور صرف دولت کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے رسول خدا ﷺ کا تجویز کردہ حل سب سے زیادہ بہترین، پائدار اور معیشت کے لیے موزوں ترین ہے۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:((**الاقتصاد فی النفقة نصف المعیشة**))[2] ترجمہ: (صرف وخرچ میں) میانہ روی اختیار کرنا گویا کہ اپنی معیشت کے نصف مسائل کو حل کر لینا ہے۔

آبادی میں اضافہ

غربت کی وجوہات اور سماجی و معاشرتی عوامل میں سے ایک اور مہم عامل آبادی میں ہوش ربا اضافہ ہے جس نے بھوک ،افلاس، محرومی اور فقر و غربت کو مزید اندوہ ناک کر دیا ہے۔ اور غربت کے خلاف لڑی جانے والی جنگ کے حوالے سے اقتصادی ماہرین کے خدشات کو بہت بڑھا دیا ہے۔ ان ماہرین کا ماننا ہے کہ دنیا میں آبادی جس رفتار سے بڑھ رہی ہے اسی رفتار سے مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے، کیونکہ دنیا کی آبادی جس تیزی سے بڑھ رہی کہ اس تیزی سے وسائل مہیا نہیں ہو رہے۔

ماہرین اس بارے میں متفق ہیں کہ یہ ہماری معاشرتی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کے درمیان آگہی کے اس فقدان کو ختم کیا جائے کہ اگر وسائل کی عدم موجودگی میں اسی تیزی کے ساتھ دنیا کی آبادی بڑھتی گئی تو آنے والی نسلوں کا کیا بنے گا۔ دیکھا جا سکتا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک مسائل کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان ملکوں میں آبادی کو کنٹرول کرنے اور مسائل پر قابو پانے کے لیے ایک واضح حکمت تیار کر کے اس پر عمل پیرا ہونا ہو گا۔

---

[1] معاشیات اسلام، ابو الاعلی مودودی، ص60

[2] مکارم الاخلاق، ابو القاسم الطبرانی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، طبع اول 1409ھ، باب فضل التودد الی الناس و مدارتہم، ص364

سٹینفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر پال اہرلیک نے 1968ء میں "آبادی کا بم" (The Population Bomb) نامی اپنی تصنیف میں دعوی کیا کہ آبادی اپنی حدود سے متجاوز ہو چکی ہے، اور جب آبادی تمام حدوں سے آگے بڑھ جائے گی تو ہزاروں لاکھوں لوگ بھوک اور بیماری جیسے مسائل سے مرنے کو مجبور کو جائیں گے، ہمارے پاس واحد حل آبادی کے شرحِ اضافہ کو صفر سے بھی کم کرنا اور آبادی کو مکمل کنٹرول کر لینا ہے۔[1]

مالتھیس نے پہلی دفعہ آبادی کے بے تحاشہ اضافے اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں کھل کر گفتگو کی۔ اس کا یہ ماننا تھا کہ آبادی کے اضافے میں ہونے والے اضافے کو اگر نظر انداز کیا گیا تو یہ بیش بہا قباحتوں اور برائیوں کی وجہ بنے گا اور بن رہا ہے۔ انہوں نے انسانی آبادی میں ہونے والے بے تحاشہ اضافے کی وجہ سے آنے والے چیلنجز اور خطرات کے پیش نظر ایک نظریہ پیش کیا کہ چونکہ انسانی آبادی دو، چار، آٹھ، سولہ کے تناسب سے بڑھتی ہے جب کہ کرہ ارض پر موجود ذرائع پیداوار میں اضافہ دو، چار، چھ، آٹھ، دس کے تناسب سے ہے لہذا ضروری ہے کہ آبادی کو وسائل میں ہونے والے اضافے کے تناسب سے مشروط کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک کرہ ارض پر بستی انسانی آبادی کو بھوک، افلاس اور فاقہ کشی سے بچانے کے لیے آبادی کے اضافے پر چیکس لگانا ناگزیر ہیں۔ آبادی کے اس اضافے کو محدود کرنے کے لیے دو قسم کے چیکس (یعنی جانچ پڑتال کے ذرائع) ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک روک تھام کا چیک (preventive check) ہے، اس کا ہدف انسانی پیدائش کی شرح کو کم کرنا جب کہ دوسرا چیک کو جانے دو چیک (Possitive Check) کہا جا سکتا ہے جس کا مقصد ہے جو لوگ کسی بھی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہے ہیں تو ان کو جانے دینا چاہیے اور ان کے موت کے اسباب کو روکنا غیر عقلمندانہ ہو گا، پس اس چیک کا مقصد لوگوں کی شرح اموات میں فطرتی اضافہ ہے جس کے سامنے بندش پیدا نہیں کرنے چاہیے تا کہ کرہ ارض پر مزید نئے لوگوں کی گنجائش پیدا ہو سکے ۔ اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو دنیا غذائی قلت اور غربت و افلاس کے مسئلے سے نبٹنے میں ناکام واقع ہو گی۔ اور اگر آبادی کو اخلاقی طریقوں سے کنٹرول نہ کیا گیا تو فطرت غیر اخلاقی طریقوں مثلاً قحط، بیماریوں، اور جنگوں کے ذریعے آبادی کو کنٹرول کرے گی۔ وہ اپنی کتاب An Essay on principles of Populatioin کے Book v, chapter iv میں لکھتے ہیں کہ

"آبادی کو مزید بڑھنے سے روکنے کے لیے درکار تعداد سے زیادہ تمام بچوں کو ختم کرنا ہو گا۔۔۔ (مذکورہ مقصد کے تحت) ہمیں بربادی و تباہی کے طور طریقوں کو خوش آمدید کہنا ہو گا، غریبوں کے لئے صفائی کی بجائے گندگی کو پروان چڑھانا چاہیے، اپنی آبادیوں میں ہمیں گلیاں تنگ بنانی چاہئیں، کم سے کم گھروں میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو رکھنا چاہیے اور وبائی امراض کو خوش آمدید

[1] The Population Bomb, Paul R. Ehrlich, Ballantine Books, 1971, p.45

کہنا چاہیے۔ لیکن سب سے بڑھ کر ہمیں موت پھیلانے والی بیماریوں کے علاج کے لئے بنائی جانی والی ادویات کے ساتھ ساتھ ان خیر اندیش لوگوں کی بھی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے جو ایسی غلطی سے ایسی بیماریوں کے علاج کو انسانیت کی خدمت سمجھتے ہیں"[1]

بڑھتی ہوئی آبادی کی وجہ سے ترقی پذیر ممالک مسائل کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ان ملکوں میں آبادی کو کنٹرول کرنے اور مسائل پر قابو پانے کے لیے ایک واضح حکمت تیار کرکے اس پر عمل پیرا ہونا ہوگا۔ اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ دنیا بھر کے بے شمار مسائل آبادی میں اضافے سے جڑے ہوئے ہیں۔ علاج، رہائش، تعلیم اور دیگر بنیادی اشیاء جو انسان کے لیے ضروری ہیں۔ غریب ممالک میں آبادی پر کنٹرول آسان نہیں۔ جبکہ انہی ممالک میں خواتین کے لئے صحت کی سہولتیں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔

آبادی میں اضافے کے حوالے سے کچھ دانشور مندرجہ بالا چیزوں کو محض مفروضہ قرار دے کر رد کرتے ہیں اور اصل مسئلہ آبادی میں اضافہ نہیں بلکہ وسائل کی نامنصفانہ تقسیم کو قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک غذائی قلت اور دیگر مسائل کی وجہ آبادی میں اضافہ نہیں بلکہ انتظامی امور میں پائی جانے والی خرابیاں اور وسائل کا غیر عادلانہ تقسیم ہے، کہ جن کی خامیوں پر قابو پا کر غربت وافلاس کے مسئلے سے چھٹکارا پایا جاسکتا یا اس کی شدت کو بہت حد تک کم کیا جاسکتا ہے۔[2]

مفکرین کا خیال ہے کہ دنیا کے تمام ممالک میں سب سے اچھی حالت اس ملک کی رہی ہے جس میں آبادی زیادہ ہو، کسی بھی ملک کی اچھی حالت اس دور میں رہی ہو گی جب اس کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اس حوالے سے پروفیسر کولن کلارک لکھتے ہیں: اہل برطانیہ نے بلند ہمتی کے ساتھ مالتھیس کی باتوں کو سننے سے انکار کر دیا۔ اگر وہ مالتھس کے آگے جھک جاتے تو آج برطانیہ بس اٹھارویں صدی کی طرز کی ایک چھوٹی سی زرعی قوم ہوتا۔ امریکی اور برطانوی دولت مشترکہ کے نشوو ارتقاء کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ پیمانہ کبیر کی صنعت کے فطری معاشی تقاضے وسیع طلب، بڑی منڈی اور نقل و حرکت کا ایک موثر نظام ہیں جو ایک عظیم اور بڑھتی ہوئی آبادی ہی کی صورت قابلِ حصول ہیں۔[3]

---

[1]An Essay on principles of Populatioin, Thomas Robert Malthus, John Murray, London, 6th Edition, Vol. II, p.179

[2]The War Against Population: The Economics and Ideology of World Population Control, Jacqueline Rorabeck Kasun, Ignatius Press, 1999, p.271

[3] World Population and Food Supply, Clark Colin, Nature, 1958, p.181

اسلامی تعلمات میں سید الانبیاء ﷺ سے مروی احادیث میں اپنی اولادوں کو فکرِ معاش کی بنیاد پر قتل کرنے (چاہے وہ قبل از ولادت ہیں کیوں نہ ہو) کو امرِ ممنوع اور فعلِ حرام سے تعبیر کیا گیا ہے بلکہ اس کو بناہ کبیرہ بھی کہا ہے۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ: سَأَلْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: " أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ عِنْدَ اللَّهِ؟ قَالَ: ((أَنْ تَجْعَلَ لِلَّهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ)). قُلْتُ: إِنَّ ذَلِكَ لَعَظِيمٌ، قُلْتُ: ثُمَّ أَيُّ؟ قَالَ: ((وَأَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ تَخَافُ أَنْ يَطْعَمَ مَعَكَ)). قُلْتُ: ثُمَّ أَيُّ؟ قَالَ: ((أَنْ تُزَانِيَ حَلِيلَةَ جَارِكَ))[1]

میں نے سرورِ کونین سے پوچھا کہ پروردگا کے ہاں سب سے بڑا گناہ کونسا ہے؟ انہوں نے کہا" یہ کہ تم اللہ کے ساتھ شریک بنالو حالانکہ پروردگاعالم نے تمہیں خلق کیا ہے۔" میں نے جواب دیا بے شک یہ توبڑا گناہ ہے۔ میں نے پوچھا: بعد ازاں عظیم ترین گناہ کونسا؟ مجھے جواب ملا" اس گناہ کے بعد بڑا گناہ اس خدشے کی بناپر اپنی اولاد کو قتل کرنا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ کھانا کھائے گی"۔ میں نے پوچھا ان گناہوں کے بعد کس گناہ کو بڑا گناہ کہا گیا ہے؟ توانہوں نے جواباً فرمایا" یہ کہ تم اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو"۔

حضرت ابو سعید خُدری روایت کرتے ہیں کہ جب ہم نے اپنی کنیزوں سے عزل[2] کرنا چاہاتو ہمیں آپ سے دریافت کیے بغیر ایسا کرنا مناسب نہ لگا، لہٰذا جب ہم نے اس بارے آپ سے استفسار کیا تو آنحضرت ﷺ نے جواب دیا کہ:

((مَا عَلَيْكُمْ أَنْ لاَ تَفْعَلُوا مَا مِنْ نَسَمَةٍ كَائِنَةٍ إِلَى يَوْمِ القِيَامَةِ إِلَّا وَهِيَ كَائِنَةٌ))[3]

ترجمہ: ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیوں کہ قیامت سے پہلے جو جان پیدا ہونے والی ہے وہ تو ضرور پیدا ہو کر رہے گی۔

---

[1] صحیح بخاری، محمد ابن اسماعیل بخاری، کتاب التفسیر، باب قولہ فلا تجعل معہ انداداوانتم تعلمون، حدیث رقم4477،6/18

[2] میاں بیوی کا دوران جماع نطفہ کے خارج ہونے سے قبل اس نیت سے ایک دوسرے سے الگ ہو جانا کہ نطفہ مادر رحم میں منتقل نہ ہو عزل کہلاتا ہے۔

[3] صحیح بخاری، محمد ابن اسماعیل بخاری، باب من ملک من العرب رقیقافوھب وباع، حدیث رقم2542،3/148

دنیاوی مسائل کی وجہ انسانی آبادی میں اضافہ نہیں بلکہ انسانی خواہشات کی تکمیل کے غریضے کا لامحدود ہونا ہے۔ یہ سمجھنا کہ دنیاوی وسائل اور نعمتیں محدود ہیں اور اس سے انسانی آبادی کو مشکلات درپیش ہونے کا خدشہ ہے یکسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ آصف محسنی رقمطراز ہیں کہا قتصادی حالات میں بین الاقوامی یا مقامی طور پر بہتری نہ ضبطِ تولید سے آتی ہے نہ انفرادی ملکیت ختم کرنے سے بلکہ اس کا واحد حل ضبطِ ہوس رانی ہے۔ اور یہ خود انسان ہی ہے کہ جس کے ہاتھوں انسانوں کو اقتصادی مشکلات اور فقر وفاقہ میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔[1]

علامہ مودودی اس بارے میں رقم طراز ہیں: جب آپ اسلام پر نگاہ ڈالیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اسلامی نظامِ تمدن نے سرے سے ان اسباب و دواعی کا ہی استیصال کیا، جن کے سبب انسان اپنی فطرت کے اس اہم اقتضاء یعنی توالد و تناسل سے پرہیز کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے برتھ کنٹرول کی ضرورت نہیں اور نہ اس کی فطری سرشت ہی ان کا اقتضاء کرتی ہے۔[2]

مغربی مفکرین ودانشوروں کی ایک بڑی تعداد آبادی میں اضافے کو غربت وافلاس کے پھیلاؤ کی ایک وجہ جانتے ہیں لیکن اسلام اس مسئلے میں جداگانہ نکتہ نظر کا قائل ہے۔ اسلام کے نزدیک آبادی میں اضافے کا معاشی مشکلات میں اضافے کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے۔

محنت ومشقت سے اجتناب

عوامل پیداوار میں سے ایک عامل محنت ہے۔ انسان کا ایسا عمل جو پیداوار کے وجود میں لانے کا سبب بنے محنت کہلاتا ہے۔ اگر محنت کو روک دیا جائے تو دیگر عوامل پیداوار بھی پیداوار کے قابل نہیں رہتے۔ کیونکہ محنت مزدوری یا کام وہ بنیادی عامل ہے جو ثروت ودولت کو کھینچتا ہے۔ کسب معاش کی بنیادی اکائی محت ہے۔

خالق کائنات نے کارگاہ ہستی میں اپنی مخلوقات کے لیے مال ورزق کے وسیع وعریض ذخیرے جمع کر دیے ہیں مگر ان کے حصول کے لیے کوشش ومحنت اور تلاش وسعی شرط ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر نور محمد غفاری محنت بحیثیت عامل پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] اسلامی اقتصاد، محمد آصف محسنی (ترجمہ: محسن علی نجفی)، جامعہ اہل البیت، اسلام آباد، طبع اول 1983، ص:27

[2] اسلام اور ضبط ولادت، مودودی، ابوالاعلی، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد، ص:55

"محنت بحیثیت عامل پیدائش کی ساری کارکردگی کادارومدار محنت کی استعداد کار پر ہے۔یعنی محنت کرنے والا مزدور یا ناظم جتنا خوش اصلوبی اور تیزی سے کام کرے گا اتنا ہی محنت بحیثیت عامل پیدائش کے نتائج زیادہ خوشگوار سامنے آئیں گے، پیداوار بڑھے گی، ملکی معیشت ترقی کرے گی اور نتیجۃً ساری قوم کے ساتھ مزدور بھی خوش حال ہو گا۔"[1]

اسلام نے محنت مزدوری پسندیدہ اعمال میں شمار کیاہے جبکہ کاہلی و سستی کو سخت ناپسند کیاہے۔اسلام چاہتاہے کہ ہر شخص اپنے ہاتھ کی محنت سے کما کر کھائے اور دوسروں پر بوجھ نہ بنے یہاں تک کہ اپنے اور اپنے اہل و عیال سے لیے نان و نفقہ کمانے کو قرآن مجید جہاد فی سبیل اللہ کے کے ہمراہ تذکرہ کیاہے۔

حکم الٰہی ہے:

﴿وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾[2]

ترجمہ: اور بعض رزقِ خدا کو تلاش کرنے کے لئے سفر میں چلے جائیں گے اور بعض راہِ خدا میں جہاد کریں گے۔

معاشی سرگرمیاں بھی دین کا اہم حصہ ہیں۔اسلام کے نزدیک محنت و مزدوری کرنا،مال و دولت کمانا اور صنعت و تجارت ،زراعت و کاشتکاری اور مزدوری و ملازمت محض پیسہ کمانے کا ایک ذریعہ اور دنیاداری ہی نہیں دین کا ایک اہم حصہ ،اس کی ایک عظیم ذمہ داری اور عبارت پروردگار بھی ہیں۔پروردگارِ عالم اپنی آخری کتاب قرآن حکیم میں صرف اور صرف نماز،روزے اور احکام شرعی ہی کا حکم نہیں دیتا بلکہ نماز پڑھنے کے علاوہ رزق کی تلاش بھی ضروری قرار دیتاہے۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ﴾[3]

ترجمہ: پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل (رزق) تلاش کرو

مذکورہ آیت اور اس جیسی دیگر آیات میں جس طرح نماز کا حکم دیا گیاہے ویسے ہی رزق حلال کے لیے محنت و مشقت اور تلاش و سعی کی خاطر اپنے گھر سے نکل کر خالق کائنات کی وسیع و عریض زمین میں پھیل جانے کو کہا۔ہمارے نبی کی حیات طیبہ اس

---

[1] اسلام کا معاشی نظام، پروفیسر نور محمد غفاری، شیخ الہند اکیڈمی، کراچی، ص222

[2] سورۃ المزمل:73/ 20

[3] سورۃ الجمعہ:62/10

طرح کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ نبی رحمت نے فریضہ احکام اور عبادات کے بعد سب سے بڑا عمل رزقِ حلال کی تلاش اور کمائی کو بتلایاہے۔ چنانچہ آپ کا فرمان ہے:

((طَلَبُ کسبِ الحَلاَلِ فَرِیضَة بَعدَ الفَرِیضَةِ))[1]

ترجمہ: رزق وروزی کی حلال راہوں کو تلاش کرنا فریضہ عبادات کے بعد سب سے بڑے درجے کا واجب عمل ہے۔

قرآنی تعلیمات کے مطابق انبیاء کرام علیہم الصلواۃ والسلام بھی محنت و مشقت والے کام کرتے اور اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے۔ قرآن مجید کے ارشاد کے مطابق حضرت داؤد علیہ السلام ذرہ سازی جیسا مشکل اور مشقت طلب کام کرتے تھے۔

اسلام محنت و مشقت اور صنعت و حرفت کے احترام اور پیشوں کی عظمت کا عظیم مبلغ ہے۔ اسلامی تاریخ کے مطابق انبیاء بھی اپنے زمانے میں کسی نہ کسی پیشہ سے وابستہ ہوتے اور محنت و مزدوری کو اپنے لیے عار نہ سمجھتے۔ اپنے پیشے یا حرفت سے اپنے گھر کا انتظام چلاتے۔ تاریخی مستندات کے مطابق حضرت آدم کھیتی باڑی، حضرت ادریس درزی کا کام، حضرت نوح بڑھئی کا کام سرانجام دیتے جبکہ حضرت ہود تاجر تھے، حضرت ابراہیم بھیڑ بکریاں چراتے، حضرت داؤد زرہ بنانے کے کام سے وابستہ تھے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سیاح تھے۔[2]

سردار انبیاء بھی بعثت سے قبل گلہ بانی کے پیشے سے وابستہ رہے۔ ایک بار جب آپ نے اپنے اَصحاب کو بتایا کہ خدا نے جتنے انبیاء بھیجے ہیں ان سب نے بکریاں چرائی ہیں تو انہوں نے استفسار کیا: حضور آپ نے بھی؟ تو جواب میں ارشاد فرمایا:

((نَعَم کُنتُ اَرعی عَلی قَرَارِیط لِاَھلِ مَکَّة))[3]

ترجمہ: ہاں میں تھوڑے سے قیراطوں کے بدلے مکہ والوں کی بکریاں چَرایا کرتا تھا۔

فخر دوعالم ﷺ نے خود بکریاں چرانے جیسے غیر فنی مزدور سے لے کر کاروباری اہمیت تک کے کام سرانجام دیے، بلکہ انسانیت کو قیامت تک کی معیشت، معاشرت و سعادت و قیادت کے آخری پیغام دینے والے فخر موجودات نے اپنے مبارک

---

[1] سنن الکبری للبیہقی، احمد بن حسین البیہقی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، کتاب الاجارہ، حدیث رقم 11695،6/211

[2] الدر المنثور، عبد الرحمن بن الکمال جلال الدین السیوطی، دار الفکر، بیروت، 1993ء، 1/139

[3] صحیح البخاری، محمد بن اسماعیل البخاری، کتاب الاجارۃ، حدیث نمبر 2262، ص 3/88

کندھوں پر پتھر اور گارا اٹھا کر، اپنے دست مبارک سے کپڑے سی کر اور جوتے گانٹھ کر معاشرے کے نچلے ترین طبقات کے مزدوروں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔[1]

انبیاء نے اپنے عمل کے ذریعے دعوت دی کہ معاش کا کوئی بھی ذریعہ اور پیشہ چھوٹا یا گھٹیا نہیں ہے لہذا انسان کو کمائی کے لیے کسی بھی پیشے سے منسلک ہونا پڑے تو ہچکچانا نہیں چاہیے۔ اسلام میں کمائی کرنے والے ہاتھوں کو اللہ کے پسندیدہ ہاتھ قرار دیا گیا ہے۔

حضرت سعد انصاری جو کہ آہن گری کے پیشے سے وابستہ تھے، کام کی سختی اور سنگینی کے سبب ہاتھ سخت اور کھردرے ہو گئے تھے۔ ایک روز دوران مصافحہ رسول خدا کو ہاتھوں کا کھردرہ پن محسوس ہوا تو اس کی وجہ پوچھی۔ جناب سعد نے کہا کہ ہتھوڑا چلانے سے ہاتھ میں گٹھیں پڑ گئی ہیں اور یہ کھردرے ہو گئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے ہاتھوں کو چوما اور فرمایا کہ یہ وہ ہاتھ ہیں جنہیں جہنم کی آگ چھو نہیں سکتی۔[2]

محنت کی اس قدر عظمت اور افادیت کے باوجود آج بھی بہت سے لوگ اس کو اپنے لیے توہین اور باعث ننگ و عار سمجھتے ہیں۔ بالخصوص یہ سوچ ان لوگوں میں زیادہ راسخ ہو گئے ہے جو رائج نصابی تعلیم میں زیادہ آگے تک چلے گئے ہیں۔ آج کی بے روز گاری اور غربت کی ایک وجہ معاشرے میں بڑی تعداد ایسے پڑھے لکھے لوگوں کی ہے جن کے پاس صرف ملازمتی تعلیم، یا جس کو عرف عام میں ان سروس ایجوکیشن یا سوشل ایجوکیشن کہتے ہیں، موجود ہے۔ ایسے افراد چونکہ ہاتھ سے کام کرنے کو اپنے لیے معیوب سمجھتے ہیں اس لیے وہ کوئی کام کرنے کی بجائے ملازمت کے مواقع ملنے تک معاشرے پر بوجھ کی صورت میں موجود رہتے ہیں۔

غربت اور بے روز گاری کو کم کرنے کے لیے ایسے تمام پڑھے لکھے افراد کو فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم سے بھی آراستہ کرنے کی ضرورت ہے کہ جو بنیادی تعلیم کے بعد افراد کو اپنی معاشی خوش حالی کے لیے اپنی فنی صلاحیت کو بڑھا کر قومی معیشت کے مختلف شعبوں میں ترقی پانے کے لیے حاصل کرنا ہو گی۔

---

[1] اسلامی تصور محنت - سماجی معدلت، چوہدری مجید اے اولکھ، اولکھ پبلی کیشنز، لاہور، ص97،98

[2] تاریخ بغداد، ابو بکر احمد بن علي بن ثابت الخطیب البغدادي، دار الغرب الاسلامي- بیروت، طبع اول، 1422ھ، 8/317

باب سوم

غربت وافلاس کے انسانی زندگی پر اثرات

فصل اول: فقر کے معاشرتی واجتماعی زندگی پر اثرات

فصل دوم: فقر کے ایمان واخلاق پر اثرات

فصل سوم: فقر کے اقتصادی زندگی پر اثرات

فصل چہارم: فقر کے انسانی افکار پر اثرات

فقر و افلاس کے اثرات

غربت ایک مستقل اذیت اور مسلسل تکلیف کی کیفیت ہے۔ غربت کا مفہوم و معنی یہی ہے کہ آنکھوں میں تو بچوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کے خواب ہوں لیکن حالات کے ظلم نے ان بچوں کے نرم و ملائم ہاتھوں میں ہتھوڑا تھما دیا ہو تا کہ کچھ کما سکیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے پیاروں کو روز مرتے دیکھنا مگر ان کا علاج نہ کرا سکنا، آنکھوں میں بڑے خواب رکھنا لیکن ہر روز کسی خواب، کسی خواہش کی میت اٹھانا یہ سب فقر ہی کے مظاہر ہیں۔ فقر کی حقیقت جتنی تلخ ہے اس کے اثرات بھی اتنے ہی بھیانک، لرزہ خیز اور ہولناک ہوتے ہیں جو معاشرتی و اخلاقی بنیادوں کو ہلا دیتے ہیں۔

غربت کی وجہ سے دہشت گردی، جرائم، معاشرتی مسائل، اخلاقی و نفسیاتی الجھنوں اور کثیر الجہتی سماجی امراض میں اضافہ ہو رہا ہے۔ غربت صرف خود ہی ایک مسئلہ نہیں بلکہ بہت سارے دیگر بھیانک اور خطرناک مسائل کی وجہ بھی ہے۔ مگر ان مسائل کی جڑ یعنی غربت و افلاس کے خاتمے کی طرف کم ہی توجہ دی گئی ہے۔

یہ بات واضح حقائق میں شامل ہے کہ موجودہ دور میں غربت اور معاش کا مسئلہ ہمہ گیر شکل میں ہر انسان کے عقل و شعور میں چھایا ہوا ہے۔ اس لیے کہ جب تک معاشرے میں اونچ نیچ موجود ہے اور جب تک اونچے اونچے محلات اور پست قامت جھونپڑے ہیں، دولت کے انبار اور غریبی کے گہرے غار، حد سے زیادہ شکم سیری اور انتہا درجے کی فاقہ مستی رہے گی۔ اس وقت تک دلوں میں بغض و حسد کی آگ سلگتی رہے گی اور سرمایہ داروں اور غریبوں کے درمیان وسیع خلیج حائل رہے گی۔ پھر وہ وقت بھی آئے گا جب ان فاقہ مستوں اور خانماں برباد لوگوں کے درمیان سے تخریب پسند اور قانون کو پاش پاش کرنے والے عناصر پیدا ہوں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ غریبی سے پیدا شدہ یہ خطرہ قوم کی لیڈر شپ اور ملکی آزادی کو بھی پوری طرح سے لاحق ہو گا۔

غربت کے معاشرے پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، جن کی وجہ سے کینہ، اور بغض پروان چڑھتا ہے، بسا اوقات ناامید غریب شخص پورے معاشرے پر اپنا بوجھ ڈال دیتا ہے، یہاں پر اہل علم، دانشوروں، اور صاحب حیثیت افراد کو اپنا کردار پیش کرنا چاہیے کہ وہ اجر پائنے، اور معاشرے کو غربت کے منفی اثرات سے پاک کرنے کیلئے غربت کے خاتمے پر خلوص دل کیساتھ کام کریں؛ چنانچہ غریب لوگوں کیلئے ملازمتیں پیدا کریں، انہیں اپنی کمپنیوں، کارخانوں میں کام کا موقع دیں، انکی صلاحتیوں اور ہنر مندی میں مزید اضافہ کریں، اور انکے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کو ختم کریں۔

غربت و افلاس کے مشکل اور کٹھن حالات انسان کو سخت دل اور بد خلق بنا دیتے ہیں۔ اس کے اندر سے عواطف واحساسات اور انسانی ہمدردی کا مادہ آہستہ آہستہ پگھل کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر کی الجھنیں، پریشانیاں اور مصیبتیں اس کے انسانی روابط پر اثر انداز ہو کر اس کے انسانی جذبات کو پس منظر میں دھکیل دیتے ہیں۔ وہ زندگی کی ہر سانس غربت و تنگدستی سے

چھٹکارا حاصل کرنے پر مرکوز کرتا ہے چاہے اس کے لیے اس کو کس قدر بھیانک کام ہی انجام کیوں نہ دینے پڑیں۔ کبھی کبھی تو اس مقصد کے لیے اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

ذیل میں فقر وافلاس کے انسانی زندگی کے اجتماعی، معاشرتی، اقتصادی اور فکری سطح پر پڑنے والے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

فصل اول

فقر کے معاشرتی و اجتماعی زندگی پر اثرات

فقر کے سماجی و اجتماعی زندگی پر اثرات

انسانی مجتمعات اور معاشروں کو پیش آنے والی سماجی و اجتماعی مشکلات میں سے ایک فقر و غربت ہے۔ بالخصوص ایسے حالات میں جب فقر و افلاس کے مارے ہوئے افراد اپنے سماج میں اپنے قریب ہی ایسے لوگوں کو دیکھتے ہیں جو زبردست مالدار اور اپنے مال و دولت کو اسراف کی حد تک استعمال کرنے والے ہوتے ہیں تو ان فقراء کے ذہن میں طرح طرح کو سوالات جنم لیتے ہیں کہ مثلاً کیا ہم سب برابر کے انسان نہیں ہیں؟ اور کیا اللہ کی نعمتیں تمام انسانوں کے لیے یکساں نہیں ہیں؟ اور کیا ہمارے حصے کی نعمتیں دوسرے افراد نے زبردستی اچک تو نہیں لیں؟ اس طرح کی سوچ جب بھوک و افلاس کے ماحول میں جنم لیتی ہے تو اکثر و بیشتر لوگ اس سوچ کے نتیجے میں دینی و معاشرتی اقدار اور اخلاقی اصولوں کی حدود سے تجاوز کرنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور معاشرتی امن و استقرار کے ماحول سے نکل کر فجور و زوال کے رستے پر چل پڑتے ہیں۔

علامہ یوسف قرضاوی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

"وفوق ذلک کله فالفقر خطر علی امن المجتمع و سلامته و استقرار اوضاعه، و قد روی عن ابی ذر انه قال: "عجبت لمن لا یجد القوت فی بیته کیف لا یخرج علی الناس شاهرا سیفه" و قد یصبر المرء اذا کان الفقر ناشئا عن قلة الموارد و کثرة الناس ، اما اذا نشئ عن سوء توزیع الثروة، و بغی بعض الناس علی بعض، ترف اقلیة فی المجتمع علی حساب الاکثریة ، فهذا هو الفقر الذی یثیر النفوس ، و یحدث الفتن و الاضطراب، و یقوض ارکان المحبة والاخاء بین الناس"[1]

ترجمہ: تمام خطرات سے بڑھ کر غربت سماج کی سلامتی، معاشرتی اقدار کی تعمیر اور استحکام کی راہ میں زبتدست رکاوٹ ہوتی ہے۔ حضرت ابو ذر سے حکایت کیا گیا ہے کہ مجھے خوف ہے کہ تہی دست اور فاقوں کا مارا ہوا بھوک سے تنگ آکر تلوار اٹھا کر لوگوں پر ٹوٹ نہ پڑے۔ یہ تو ممکن ہے کہ جب آبادی کے کثرت کے سبب وسائل کم اور روزگار ناپید ہو جائیں تو غریب آدمی اپنی غربت پر صبر کر لے۔ لیکن اگر غریبی کا اصل سبب لوگوں کے دل میں خود غرضی اور ایک دوسرے کے مقابلے میں برتری اور عناد کے جذبات ہوں یا دولت کی صحیح تقسیم اور گردش مفقود ہو کر چند خاندانوں کی پورے معاشرے پر

---

[1] مشكلة الفقر و كيف عالجها الاسلام، یوسف قرضاوی، مؤسسة الرسالة، بیروت، طبع 1406ھ، ص18

بالادستی قائم ہوگئی ہو تو ان حالات میں یقینی طور پر فقراء وغرباء کے جذبات مشتعل ہوں گے، ہنگامے اور فساد رونما ہوں گے اور باہمی اخوت اور پیار ومحبت کے رشتے تار تار ہو جائیں گے۔

دراصل غربت تمام مسائل ومشاکل کی ماں ہے۔ اور ایسے معاشرے جو فقر زدہ ہوں مسائل ومشکلات کا مرکز ومسکن بن جاتے ہیں۔ ایسے معاشرے کے صرف غریب لوگ ہی نہیں بلکہ اشرافیہ کا طبقہ بھی بالآخر ان مسائل کی زد میں آجاتا ہے اور پورا معاشرہ غیر ہموار، بے سکون اور متزلزل ہو جاتا ہے۔

عبدالرحمن ال سعود غربت کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

" تمثل مشكلة الفقر فى حقيقتها اخطبوطا متعدد الاطراف تمدها لتحكم قبضتها على الكيان الاجتماعى كله بحيث يندر ان ينجو من قبضتها جانب من جوانب ذلك الكيان لكنها اكثر من تستفحل و تبرز ويلاتها فى الحياة الاجتماعية"[1]

ترجمہ: غربت ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی صحیح معنوں میں مثال ایک کیکڑے سے دی جا سکتی ہے کہ جس کی کئی سمتیں اور اطراف ہیں۔ فقراء ہمہ وقت کوشش میں ہوتے ہیں کہ اپنی اجتماعی وسماجی معاملات پر اپنی گرفت مضبوط رکھیں۔ (لیکن اس کیکڑے کی طرح جو جتنی زیادہ ٹوکری سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے اپنی اور دیگر کیکڑوں کی مشکل مزید بڑھا دیتا ہے) شاذ ونادر ہی سماجی مسائل کا حل ان کی دسترس میں آیا ہوگا۔ بلکہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ اُن کی سماجی زندگی کی تلخیاں اور پریشانیاں ہر پہلو اور ہر گوشے سے مزید نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔

ویسے تو معاشرے پر غربت کے اثرات ہمہ گیر ہیں لیکن غربت عموما ان تین معاشرتی پہلوؤں پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔

(i) سماجی تعلقات میں کشیدگی اور تناؤ

(ii) بیماریاں

(iii) معاشرتی آفات کا نزول

---

[1] مشکلۃ الفقر و سبل علاجها فی ضوء الاسلام، عبدالرحمن آل سعود، دارالنشر بالمرکز العربی للدراسات الامنیۃ و التدریب، ریاض، طبع 1411ھ، ص126

(i) سماجی تعلقات میں کشیدگی اور تناؤ

غربت سماجی کشیدگی کی ایک بڑی وجہ ہے۔ یہ آمدنی میں عدم مساوات کے سبب اقوام کو تقسیم کر دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں معاشرتی اختلاف، ٹکراؤ اور فسادات کی تعداد میں ہوشربا اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے جب کسی قوم کی دولت اس کے افراد کے درمیان غیر عادلانہ اور نامنصفانہ طریقے سے گردش کر رہی ہو۔ جس معاشرے کی اقلیت قوم کے غالب مالی ذخائر پر قابض ہو جب کہ اکثریت غربت و ناداری کی کیفیت میں مبتلا ہو تو ان حالات میں معاشرے کا اقتصادی توازن لڑکھڑا جاتا ہے۔ ایسے میں معاشرے میں موجود درمیانہ طبقہ سماجی استحکام کا کام کرتا ہے۔ خدشہ ہے کہ دنیا بھر کے اکثر ممالک میں مڈل کلاس بہت تیزی سے غائب ہوتی جا رہی ہے جو کہ معاشرتی و معاشی عدم استحکام کا سبب بن رہا ہے۔

غربت و افلاس ایک ایسا خطرناک عنصر ہے جو معاشرے میں ناہمواری اور عدم استحکام کو دعوت دیتا ہے۔ جس کی سب سے بڑی مثال عرب بہار یا عرب سپرنگ (Arab Sprin) ہے جس میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح اعلیٰ سطح غربت اور ملازمت کے مواقع کی کم دستیابی عوامی بغاوت، انتشار اور جرائم کو رستہ فراہم کرتے ہیں۔ عبد الرحمن آل سعود لکھتے ہیں کہ:

> "ان الفقر اذا تفاعل مع ظروف اخرى مساعدة فانه يؤدى الى الجنوح والى اثارة مشاكل اجتماعية عديدة"[1]
>
> ترجمہ: غربت جب دیگر حالات کے ساتھ تعامل کرتی ہے تو معاشرے کو جرائم، انتشار اور بہت سارے دیگر سماجی مسائل کا پیش خیمہ بنتی ہے۔

موجودہ دور میں غربت اور معاش کا مسئلہ ہمہ گیر شکل میں ہر انسان کے عقل و شعور میں چھایا ہوا ہے۔ اس لیے کہ جب تک معاشرے میں اونچ نیچ موجود ہے اور جب تک اونچے اونچے محلات اور پست قامت جھونپڑے ہیں، دولت کے انبار اور غریبی کے گہرے غار، حد سے زیادہ شکم سیری اور انتہا درجے کی فاقہ مستی رہے گی۔ اس وقت تک دلوں میں بغض و حسد کی آگ سلگتی رہے گی اور سرمایہ داروں اور غریبوں کے درمیان وسیع خلیج حائل رہے گی۔ پھر وہ وقت بھی آئے گا جب ان فاقہ مستوں اور خانماں برباد لوگوں کے درمیان سے تخریب پسند اور قانون کو پاش پاش کرنے والے عناصر پیدا ہوں گے۔ صرف یہی نہیں بلکہ غریبی سے پیدا شدہ یہ خطرہ قوم کی لیڈر شپ اور ملکی آزادی کو بھی پوری طرح سے لاحق ہو گا۔[2]

---

[1] مشکلۃ الفقر و سبل علاجہا فی ضوء الاسلام، عبد الرحمن آل سعود، ص 144

[2] مشکلۃ الفقر و کیف عالجہا الاسلام، یوسف قرضاوی، ص 18-19

اعدادوشمار بتاتے ہیں کہ جغرافیائی طور پر غربت اور جرائم، پسماندگی اور استحصال اور فقر و محرومی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، کیونکہ جس معاشرے میں غربت، پسماندگی اور فقر موجود ہوں اس میں لازمی طور پر جرائم، استحصال اور محرومی نظر آئے گی۔ ایسے حالات میں کہ جب معاشرے پر فقر و افلاس کے بادل چھائے ہوں غریب اور پسماندہ طبقے کے پاس صرف دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ یا تو غربت و محرومی کو خدا کا لکھا ہوا سمجھ کر خاموشی سے سہہ لیا جائے اور ساری زندگی محرومی اور فقر و فاقہ میں گزار دی جائے۔ یا پھر مجرمانہ سرگرمیوں کو اپنا کر اپنی روزی رزق کا رستہ خود پیدا کر لیں، چاہے وہ راستہ صحیح ہو یا غلط۔ محروم طبقے کی اکثریت دنیا بھر میں دوسرے رستے کا انتخاب کرتی ہے جو معاشرتی تنزلی اور انتشار کا سبب بنتا ہے۔

عطف عجوہ رقم طراز ہیں کہ:

"ترتبط البطالة عادة بانخفاض حاد و غير متوقع فى دخل الفرد العاطل، مما يجعل الفرد فقيرا سواء كان فقرا مطلقا او فقرا نسبيا، اى بالنسبة المجتمع الذى يعيش فيه، فاذا ما طال امد هذا الانخفاض الحاد فى الدخل و استحكم، فانه يؤدى الى السلوك الاجرامى، والانحراف بدافع من الحاجة المادية والعوز الاقتصادى، و هذه علاقة اقتصادية مباشرة بين البطالة والجريمة عن طريق تاثر اسرة العاطل بهذه الظروف الاقتصادية السيئة فيجنحون الى الجريمة بسبب ما يلقونه من سوء الرعاية الصحية و سوء التغذية والانقطاع عن التعليم فى سن مبكرة او الاخفاق فيه"[1]

ترجمہ: بے روزگاری کا تعلق عام طور پر بے روزگاروں کی غیر متوقع طور پر اور تیزی سے گرتی ہوئی فی کس آمدنی کے ساتھ ہوتا ہے۔ عموماً اس طرح کی صورتحال میں انسان غرباء کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور اس پر فقر و غربت طاری ہو جاتی ہے فرق نہیں کرتا کہ وہ غربت جو اس پر طاری ہوئی فقر مطلق ہو یا فقر نسبی۔ آمدن میں کمی کا یہ رجحان جب زیادہ عرصہ برقرار رہتا ہے تو یہ انسان کو مجرمانہ رویے اور انحراف کی طرف لے جاتا ہے، تاکہ اپنی اقتصادی پسماندگی اور ضروریات زندگی اس طرح سے ہی پورا کر لیا جائے۔ بے روزگاری اور جرائم کے درمیان پائے جانے والے براہ راست اقتصادی رشتے سے بے روزگار افراد کے خاندان بھی بری طرح متاثر ہوتے ہیں۔ پس اس طرح کی صورت حال

---

[1] البطالة فى عالم العربى وعلاقتها بالجريمة، عاطف عبد الفتاح عجوه، دار النشر بالمركز العربى للدراسات الامنية والتدريب، طبع 1406ھ، ص 40

میں افراد معاشرہ کو اقتصادی پسماندگی اور محرومی کی وجہ سے جو خراب صحت، غذائی قلت اور ابتدائی عمر میں علم کے حصول سے دوری وغیرہ جیسے مسائل انہیں جرائم کے راستے پر ڈال دیتے ہیں۔

(ii) امراض

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ غربت اور امراض میں گہرا ربط پایا جاتا ہے۔ جہاں کہیں بھی افراد یا معاشرہ فقر و افلاس میں مبتلا ہو وہ ضرور طرح طرح کی بیماریوں کی آماجگاہ ہوتا۔ پسماندہ ممالک میں بیماریاں اور بیمار افراد زیادہ ہوتے، کیونکہ صحت کے لیے مطلوبہ متوازن غذا انکو میسر نہیں ہوتی ان کے جسم کی طبیعی ضرورتیں پوری نہیں ہو پا رہی ہوتی جس کی وجہ سے متعدد وٹامنز، نمکیات، کیلشیم اور دیگر متعدد جسمانی ضروریات میں کمی واقع ہو جاتی ہے جو امراض کو دعوت دینے کا سبب بنتی ہے۔ گویا کہ بالآخر ان افراد کی بیماریوں کی جو چیز وجہ بنتی ہے وہ غربت و افلاس ہے۔

غربت اور امراض کے ربط بارے عبد الرحمن آل سعود لکھتے ہیں کہ:

"یرتبط المرض و بصفة خاصة انواع منه، بحالة الفقر التی تکون علیها الاسرة والمجتمع، وذلک لقلة الموارد من جهة و لضعف الوعی من جهة اخری و لقصور التغذیة من جهة ثالثة ، و لما ینشا منها من ظروف و یتصل منها من ملابسات کلها تؤدی الی انعدام الصحة وقائیاً و علاجیاً"[1]

ترجمہ: بیماریاں بالعموم اور ان کی کچھ اقسام بالخصوص خاندان اور معاشرہ کی غربت کے ساتھ پوری طرح منسلک ہیں۔ بیماریوں اور غربت میں یہ ربط اس طرح سے ہے کہ ایک طرف وسائل کی کمی بیماریوں کے پیدا ہونے کا سبب یا پھر ان کا تسلی بخش علاج نہ کر سکنے کی وجہ ہے، جب کہ دوسری طرف شعور کی کمی اور عدم آگاہی ان امراض کی علت ہے۔ ناکافی غذا ایک اور عامل ہے جو خراب صحت اور بیماریوں کی وجہ ہے۔ گویا کہ بالآخر فقر کی وجہ سے ہی ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں کہ جو امراض سے بچاؤ یا ان کے علاج میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

---

[1] مشکلة الفقر و سبل علاجها فی ضوء الاسلام، عبد الرحمن آل سعود، ص126

دوسری طرف ایسے افراد کو جب امراض لاحق ہوتے ہیں تو وہ اپنی بیماری کے سبب بہتر کمائی کرنے کی حالت میں نہیں ہوتے، گویامالی حالات اور غربت کے باعث ان کو بیماری لاحق ہوتی ہے اور پھر ان بیماریوں کی وجہ سے ان کی غربت میں مزید شدت پیدا ہو جاتی ہے۔[1]

دنیا میں موجود اکثر امراض کا تعلق ناکافی غذا یا غذائی قلت کے مسائل سے ہے۔غذائی قلت کو بیماریوں کی پیدائش اور بقا کے حوالے سے سب سے بڑی وجہ تصور کیا جاتا ہے۔ناکافی غذا یا غذا کی قلت کا براہ راست تعلق غربت اور اس سے متعلق امور سے ہے۔

اس حوالے سے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن، ورلڈ بینک اور اقوام متحدہ کے ذیلی ادارے یونیسیف نے 2014 میں ایک مشترکہ تحقیقی سروے رپورٹ جاری کی ہے۔اس مقصد کے لیے ایک سو پینتالیس ممالک میں سروے کیا گیا۔طویل مدت کی تحقیق پر مشتمل اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

> “Globally 161 million under-five year olds were estimated to be stunted in 2013. About half of all stunted children lived in Asia and over one third in Africa.”[2]
>
> ترجمہ: دنیا بھر میں صرف 2013 میں پانچ سال سے کم عمر کے 161 ملین بچے غیر کامل نمو والے یعنی stunted رپورٹ کیے گئے۔ان بچوں میں تقریبا آدھے ایشیا میں جب کہ کل ایک تہائی بچے افریقہ میں پائے گئے۔

صرف بچے ہی ناکافی غذا کے مسئلے سے دوچار نہیں ہیں بلکہ غذائی قلت سے پیدا ہونے والے مرض Malnutrition کے بارے میں WHO کی 2005 کی جینیوا رپورٹ کہتی ہے کہ پسماندہ اور غریب ممالک اور گھرانوں کی خواتین بھی غذائی قلت کا شدت سے شکار ہیں، لہذا ان کی اپنی اور ان کے ہاں پیدا ہونے والے بچوں کی زندگی خطرے میں رہتی ہے۔

رپورٹ کے مطابق " Malnutrition، جس کو معمول سے کم وزن سے تعبیر کیا جاتا ہے، عوام الناس کی صحت کو درپیش سنگین مسئلہ ہے۔جس کی وجہ سے مریضوں کی تعداد اور ان کی شرح اموات میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے۔چھوٹے بچے اور خواتین

---

[1] الحرمان والتخلف فی دیار المسلمین، نبیل صبحی طویل، ص33

[2] Level and Trend in Child Malnutrition, UNISEF-WHO-The World Bank joint child Malnutrition estimates

غذائی قلت کی وجہ سے ہونے والی بیماریوں کا زیادہ شکار واقع ہوتے ہیں۔ افریقہ اور جنوبی ایشیا میں تولیدی عمر کی ستائیس سے اکیاون فیصد خواتین غذائی قلت کے مسئلے سے دوچار ہیں۔"[1]

خواتین چونکہ اگلی نسل کو جنم دیتی ہیں لہذا ان کی صحت کے مسائل اس حوالے سے بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ بیمار اور غذائی قلت کا شکار ماؤں سے تندرست اور پورے وزن کے حامل بچوں کی تولید کی امید نہیں کی جاسکتی۔ بالفرض ایسی ماؤں کا بچہ کسی طرح تندرست اور صحت مند پیدا بھی ہو تو بیمار ماں یا کم خوراکی کا شکار ماں اپنی صحت کے مسائل کی وجہ سے اس کی پوری نگہداشت اور صحیح پرورش کرنے سے معذور ہوتی ہے۔ ایک تندرست معاشرے اور توانا نئی نسل کی افزائش کے لیے ماؤں کی صحت کا موزوں ہونا کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ جبکہ غربت کا شکار مائیں غذائی قلت اور اس سے منسلک کئی دیگر مسائل کے سبب اپنی کوکھ سے تندرست بچوں کو جنم دینے سے قاصر ہوتی ہیں۔ WHO کے مطابق "کم خوراکی کا شکار ہونے والی ماں کے ہاں اوسط سے کم وزن کے حامل بچوں کی پیدائش کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں، ایسے بچے عموماً بیماریوں اور قبل از وقت موت جیسے معاملات کا شکار ہیں۔ کم خوراکی کی وجہ سے ماں اور بچوں کو پیش آنے والے ایسے حالات خاندان کے اقتصاد کو متاثر کرتے ہیں، یوں معاشرے میں غربت اور غذائی قلت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ (چکر) چل نکلتا ہے۔[2]

موجودہ دور میں امراض کا غربت و فقر سے علاقہ اور تعلق، بالخصوص وبائی امراض اور آلودگی کے بڑھ جانے کی وجہ سے، نہایت گہرا اور عمیق ہو گیا ہے۔ امیر اور ترقی یافتہ ممالک میں ان امراض سے بچاؤ کے لیے ویکسینز اور مطلوبہ احتیاطی تدابیر موجود ہیں۔ ان ممالک اور ان میں آباد باشندوں کو ان امراض کے خطرات کم سے کم لاحق رہتے ہیں۔ جب کہ فقراء کے پاس یا تو سرے سے علاج کی یہ سہولیات میسر ہی نہیں ہیں یا پھر وہ علاج معالجے کے بلند و بالا اخراجات کو اٹھانے کی حیثیت میں نہیں ہوتے۔ اس حوالے سے جو حقائق اب تک سامنے آئے ہیں ان کے مطابق غریب لوگوں کے لیے مناسب صحت اور مناسب علاج کی سہولتوں

---

[1] World Health Organization, Nutrition for Health and Development, Protection of the Human Environment, Environmental Burden of Disease Series, No. 12, Geneva 2005

[2] World Health Organization, Nutrition for Health and Development, Protection of the Human Environment, Environmental Burden of Disease Series, No. 12, Geneva 2005

تک رسائی خاسی حد تک نیچے گر گئی ہے، اور غریب کمیونیٹیز میں متعدی امراض کے پھیلاؤ میں اضافہ ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ علاج معالجہ کی سہولیات کا نہایت مہنگا ہونا ہے۔ [1]

دنیا میں پائی جانے والی بیماریوں میں سے کچھ بیماریاں پسماندہ اور غریب ممالک اور طبقوں میں اس قدر عام ہیں کہ انہیں غریب ممالک یا پسماندہ طبقے کی بیماریاں کہا جا سکتا ہے۔ یہ ممالک اور معاشرے اپنی عوام الناس کو حفظان صحت کے اصولوں کی مکمل راہنمائی اور ابتدائی علاج معالجے کی سہولیات میسر کرنے میں ناکام ہونے کی بنا پر اکثر و بیشتر ایسی بیماریوں کی لپیٹ میں ہی رہتے ہیں۔ اس حوالے سے زید رمانی رقم طراز ہیں کہ:

"وتعتبر بعض الأمراض مثل الملاريا والسل، من أمراض الفقر والتخلف، نظرا لارتباطها بانتشار النفايات، وانعدام الوعي الصحي، ونقص التغذية، وسوء الأحوال المعيشية بصفة عامة مثل عدم وجود المساكن الصحية أو العيش في البيوت القصديرية، وازدحام السكان، وعدم وجود مياه نقية للشرب، وتلوث الهواء وانعدام الصرف الصحى"[2]

ترجمہ: بعض بیماریوں مثلا ملیریا اور تپ دق وغیرہ کو فضلہ اور گندگی کے پھیلاؤ، حفظان صحت کے اصولوں سے عدم آگاہی اور ناقص غذا وغیرہ کہ وجہ سے غربت اور پسماندگی کی بیماریاں تصور کیا جاتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ناکارہ اور پسماندہ حالات زندگی مثلاً مناسب رہائش کا نہ ہونا یا ٹن کے گھروں میں رہائش پذیر ہونا، آبادی کا زیادہ گنجان آباد ہونا، پینے کے لیے صاف پانی کا دستیاب نہ ہونا، ہوا کا آلودہ ہونا اور نکاسی آب کا انتظام نہ ہونا وغیرہ وہ عوامل ہیں جو ان معاشروں میں بیماریوں کی پیدائش اور افزائش کا سبب بنتے ہیں۔

افراد، معاشرے یا گھرانے جب بیماریوں کی لپیٹ میں آجاتے ہیں تو اس سے فقط انہی کی روزی روٹی یا صرف انہی کی زندگی متاثر نہیں ہوتی بلکہ پورا معاشرہ اور منطقہ اس کے منفی اثرات کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ یوں امراض فقط افراد کی معیشت و ترقی کے زوال کا سبب ہی نہیں بلکہ معاشرتی ترقی کو بھی روک دیتی ہے۔ عبد النعیم حسنین اس حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

---

[1] التشخيص ظاهرة الفقر بالجزائر ودور الزكاة في مواجهتها، الملتقى الدولي حول مؤسسات الزكاة في الوطن العربي، فريد كورتل، اناجى بن حسين، كلية العلوم الاقتصادية وعلوم التسيير، جامعة سعد دحلب، البليدة، 2004ء

[2] اقتصاد الفقر: بؤس وازمات، زيد رمانی، مكتبة الرشد للنشر والتوزيع، رياض، المملكة العربية السعودية، طبع اول 2003، ص30

"فالمرض كأثر من آثار الفقر لا يؤثر على الشخص أو الأسرة فحسب، وإنما يؤدي إلى وقوع اضطرابات اجتماعية وسياسية قد تدمر مجهودات التنمية"[1]

ترجمہ: غربت کے اثرات بد میں سے بیماری، فقط فرد واحد یا خاندان ہی کو متاثر نہیں کرتی بلکہ سیاسی و سماجی بے چینی کی صورت میں معاشرتی ترقی کی تمام کوششوں کو تباہ اور سبوتاژ کرتی ہے۔

(iii) معاشرتی آفات کا نزول

فقر و افلاس کا مسئلہ افراد کے دائرے سے نکل کر معاشروں، اقوام اور ممالک کا مسئلہ بن چکا ہے بلکہ اس وقت اس کو ایک عالمگیر مسئلے کی حیثیت حاصل ہے، اور پوری دنیا ہی غربت کے محاذ سے لڑتی ہوئی نظر آتی ہے۔ غربت کی مثال ایک وبائی مرض کی سی ہے جو افراد، خاندان اور آخر میں معاشروں کو نگل جانے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ غربت انسانی معاشرے کے لیے ایک آفت سے کم نہیں یہی وجہ ہے کہ غربت زدہ معاشرہ در حقیقت آفت زدہ معاشرہ ہے۔ ویسے تو غربت کی وجہ سے معاشرے میں پیدا ہونے والی آفات کثیر ہیں البتہ ان میں سے چند نمایاں حسب ذیل ہیں۔

(i) گداگری

غربت ایسا عفریت ہے جس سے تنگ آکر انسان بالآخر ہاتھ پھیلانے کی حد تک گر جاتا ہے۔ ہاتھ پھیلانے کی عادت کا پڑ جانا یا سوال کرنے کی جھجک کا ختم ہو جانا، بھیک اور گداگری کا مقدمہ ہے۔ وہ معاشرے جن میں بھیک اور گداگری کا راج ہو وہ کبھی بھی قومی اور ذاتی عزت نفس کا خیال نہیں رکھ سکتے۔ اور نہ ہی کبھی ترقی کی راہ پا سکتے ہیں۔ غربت ایک ایسا عامل ہے جو معاشرے کی عزت نفس کو ختم کر کے اسے سوالی، بھکاری یا گداگر بنا دیتا ہے۔

کسی بھی معاشرے میں سوال کی ثقافت یا بھیک کی عادت کا ہونا دراصل اس سماج کی غربت کا اظہار و اعلان ہوتا ہے۔ ماہر علی معاشرے میں رائج گداگری کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

"التسول ظاهرة اجتماعية يمارسها أفراد أوُ أسر، إما للحاجة الشديدة، أو هربا من مسؤوليات الحياة خاصة بالنسبة للأشخاص الذين ليس له رغبة في مزاولة الأعمال،

[1] الانسان والمال في الاسلام، عبد النعيم حسنين، دار الوفاء للطباعة والنشر، المنصورة، طبع 1986، ص39

ويؤثر التسوُّل على الاقتصاد، كون المتسولين طاقة بشرية معطلة وغير منتجة، كما أنه سلوك منحرف، مكروه في الشرع، مجرم في القانون"[1]

ترجمہ: بھیک مانگنا بعض افراد یا خاندانوں کی طرف سے سامنے آنے والا ایسا رجحان ہے جس کی وجہ یا تو شدید ضرورت مندی ہے یا پھر یا پھر افراد کا اپنی ذاتی ذمہ داریوں سے فرار کرنا۔ بالخصوص وہ افراد جو کسی قسم کا کاروگار یا کام کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے ہیں وہ اسی صورت میں اپنی مشاکل کا راہ حل دیکھتے ہیں۔ چونکہ بھکاریوں کی محنت مزدوری کرنے کی بشری طاقتیں اس عمل کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں اور کوئی پیداواری نتیجہ ان سے اخذ نہیں ہوتا۔ یہ ایک منحرف اور غلط کام بھی ہے۔ ایسا کرنا شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور قانون کی نگاہ میں مجرمانہ ہے۔

بعض اوقات گداگری، بے روزگاری کے نتیجے میں جنم لیتی ہے۔ کیونکہ ایسے بے روزگار افراد جن کی نہ تو تعلیمی اداروں میں جگہ ہوتی ہے اور نہ فیکٹریوں اور کاخانوں میں اور نہ ہی انہیں اپنے زندگی کو اقتصادی حوالے سے آگے بڑھانے کے لیے کوئی سہولت کہیں سے میسر آتی ہے تو ایسے افراد شریر اور مجرمانہ ماحول کے زیر اثر چلے جاتے ہیں۔ جب افراد معاشرہ کسب روزی کی صلاحیتیوں کے باوجود روزگار کے مواقع نہ ملنے کی وجہ سے بے کار میں بیٹھ جاتے ہیں، وہ ایسے تکلیف دہ ماحول میں اپنی ضرورتوں کی تکمیل کی خاطر کسی بھی رستے کو اپنانے سے گریز نہیں کرتے چاہے اس مقصد کے لیے انہیں اپنے ہاتھ ہی دوسروں کے آگے کیوں نہ پھیلانا پڑیں۔ یوں غرت و بے روزگاری انسان کو ذلت نفس کے اس مرحلے پر لے جاتی ہے جہاں وہ سوال کرنے سے بھی ہچکچاتا نہیں۔[2]

اسلام نے ہاتھ پھیلانے کو انتہائی معیوب بتلایاہے اور سختی سے اس کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ سنن الکبری میں آیاہے کہ:

أَنَّ رَجُلًا أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَأَلَهُ فَأَعْطَاهُ، فَلَمَّا وَضَعَ رِجْلَهُ عَلَى أُسْكُفَّةِ الْبَابِ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ((لَوْ تَعْلَمُونَ مَا فِي الْمَسْأَلَةِ مَا مَشَى أَحَدٌ إِلَى أَحَدٍ يَسْأَلُهُ شَيْئًا))[3]

---

[1] الخدمة الاجتماعية في مجال الدفاع الاجتماعي، ماہر علي، مكتبة زہراء الشرق، مصر، طبع چہارم 2003ء، ص 303

[2] مشكلات المدينة دراسة في علم الاجتماع الحضري، حسين رشوان، المكتب العربي الحديث، الاسكندرية، طبع 2002ء، ص 157

[3] السنن الكبرى، ابو عبد الرحمن النسائي، مؤسسة الرسالة، بيروت، طبع 2001ء، كتاب الزكاة، حديث رقم 2378، ص 3/74

ترجمہ: ایک شخص آنحضرت کے پاس آیا اور کچھ عطا کرنے کا سوال کیا۔ تو آپؐ نے اس کو (ضرورت بھر) عطا فرمایا۔ تو پھر جب اس نے گھر کی دہلیز پر قدم رکھا تو آنحضرتؐ نے فرمایا: اگر لوگ مانگنے کے نقصانات کو جان لیں تو کسی کے دروازے پر جانے کی ہرگز ہمت نہ کریں۔

اسلام سوال کرنے کو روزی رزق اکٹھا کرنے کا وسیلہ گردانتے کی بجائے گداگری کو فقر و افلاس کا سبب بتاتا ہے۔ آنحضرت سے مروی ہے:

((وَلاَ فَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسْأَلَةٍ إِلاَّ فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ))[1]

ترجمہ: جس نے بھیک مانگنے کا راستہ اختیار کیا اللہ اس کے لیے غریبی اور افلاس کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

اسلام نہ فقط گداگری اور بھیک کو معیوب خیال کرتا ہے بلکہ اس حوالے سے اپنا دوٹوک موقف پیش کرتا ہے کہ جب تک کوئی بھی شخص تندرست ہو، کمانے کے طاقت و سکت رکھتا ہو اور اس کے پاس کمائی کے جائز مواقع بھی موجود ہوں تو اس وقت وہ صدقہ، خیرات اور زکاۃ کا مستحق نہیں قرار دیا جاسکتا۔

(ii) منشیات کا استعمال اور اس کے کاروبار کا پھیلاؤ:

وہ اولین مسائل جن پر اسلام نے بھرپور احکام وضع کیے اور نہایت تفصیل سے احکامات صادر فرمائے ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ نشہ آور اشیاء اور یا منشیات کا مسئلہ ہے۔ اسلام نے منشیات کو ان محرمات کے زمرے میں شامل کیا ہے جن میں سرے سے کوئی معاملہ کرنا اصلاً حرام ہے، چاہے وہ بیعاً ہو یا شراءً، بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔ یہاں تک کہ اس معاملے میں سہولت کار کا کردار کرنا بھی ممنوع و حرام ہے۔ اس نظریے سے جن اشیاء کی حرمت بیان ہوئی ہے ان میں زیادہ سنگین شراب، منشیات اور سفید ٹاکسن کی مختلف انواع و اقسام ہیں۔ تحقیقات کے مطابق دنیا بھر میں ان اشیاء کی تجارت اور لین دین پر اقوام عالم کے اربوں روپے ضائع کیے جارہے ہیں اور ہر روز ہزاروں لاکھوں جوان ان کی وجہ سے موت کے منہ میں جارہے ہیں۔[2]

منشیات کا کاروبار کرنے والے دراصل انسانیت کے سوداگر ہیں کہ اپنے دنیاوی اور عارضی دنیاوی فائدے کی خاطر لاکھوں انسانوں کی زندگیوں سے کھلواڑ کرتے ہیں۔ دراصل پسماندہ معاشروں میں جہاں روزی رزق کی قلت ہو، نوجوانوں کو روزگار میسر نہ

---

[1] سنن الترمذی، محمد بن عیسی الترمذی، دار الحرب الاسلامی، بیروت، طبع 1998، ابواب الزہد، باب ما جاء مثل الدنیا مثل اربعۃ نفر، حدیث رقم 4، 2325/140

[2] دور القیم والاخلاق فی الاقتصاد الاسلامی، یوسف قرضاوی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، لبنان، طبع دہم 1994، ص 283

ہو اور پریشانیوں نے ہر طرف ڈیرہ ڈال رکھا ہو وہاں ایک ایسا ذہن جو پریشانیوں کی آماجگاہ بن چکا ہو اپنے سکون کے لیے منشیات اور نشہ آور عارضی سکون دینے والی چیزوں کا سہارا لیتا ہے۔ حمدی عبد العظیم غربت اور منشیات کے ربط بارے رقمطراز ہیں:

"وقد أوضحت الدراسات علاقة الفقر بتجارة المخدرات أو تعاطيها، حيث تعتبر المخدرات من الأمراض الاجتماعية المنتشرة في الدول الفقيرة لعدة أسباب، منها الربح السريع الذي تدره على التجار، ورغبة المدمنين في نسيان المشاكل المادية والحرمان الذي يعانونه والهروب من هموم الفقر ومشاكله، وتسهم المخدرات في التحرر من الضوابط الاجتماعية"[1]

ترجمہ: تحقیقات سے فقر و غربت اور منشیات کے استعمال کے درمیان گہرا ربط اور تعلق ثابت ہوا ہے۔ منشیات ان امراض میں سے ایک ہے جن کا شکار کئی وجوہات کی بنا پر پسماندہ اور غریب ممالک ہیں۔ ظاہری طور پر یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ کاروبار ایک طرف تو تاجر حضرات کے لیے فوری منافع والا کاروبار ہے جبکہ دوسری طرف نشہ آور اشیاء اور منشیات لوگوں کو ان کی مادی مشکلات و محرومی اور فقر و غربت کی مشکلات اور پریشانیوں کے لیے عارضی طور پر سہی لیکن بہر طور سکون مہیہ کرتی ہیں اور انہیں اپنے معاشرتی اور خاندانی ذمہ داریوں سے کچھ دیر کے لیے ذہنی طور پر بری الذمہ کر دیتی ہیں۔

فطرت انسانی کا تقاضہ یہ ہے کہ کسی بھی فرد کو دوسرے افراد کو ضرر اور نقصان پہنچا کر کاروبار اور تجارت کرنے اور منافع کمانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اسلام چونکہ عین فطرت وطبیعت کے مطابق احکامات کو صادر کرتا ہے لہذا اس فطری تقاضے کے عین مطابق لوگوں کی زندگیوں سے کھیل کر کاروباری معاملات کے منافع کو روکنا ہو گا۔ محمد مبارک لکھتے ہیں کہ:

"إن النظام الإسلامي يهدف إلى النفع البشري، حين يوجه النشاط الاقتصادي وجهة نافعة للبشر، فيشجع إنتاج المنافع، ويحرم إنتاج المواد الضارة كالمسكرات والمخدرات، كما يحرّم المتاجرة بها مهما كان فيها من ربح للفرد أو الدولة"[2]

ترجمہ: اسلام در حقیقت بشریت اور انسانیت کے نفع کو مد نظر رکھتا ہے۔ لہذا جب یہ انسانی اقتصادی سرگرمی کی بات کرتا ہے تو وہاں بھی جو چیز مد نظر رکھتا ہے وہ نفع بشری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ (جائز اور

---

[1] فقر الشعوب بین الاقتصاد الوضعی والاقتصاد الاسلامی، حمدی عبد لعظیم، اکادیمیۃ العلوم الاداریۃ، مصر، طبع 1995، ص210

[2] نظام الاسلام الاقتصادی: مبادئ وقواعد عامۃ، محمد المبارک، ص29

فائدہ مند) منافع والے کاروبار کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جبکہ نقصان دہ اشیاء کی پیداوار اور کاروبار سے منع کرتا ہے جیسا کہ منشیات اور نشہ آور اشیاء کے کاروبار سے منع کرتا ہے، چاہے ریاست یا فرد کو اس میں کتنا ہی انفرادی نفع کیوں نہ وصول ہو رہا ہو۔

فصل دوم

فقر کے ایمان واخلاق پر اثرات

فقر کے ایمان وعقیدے پر اثرات

یہ ایک حقیقت ہے کہ غربت ایمان و دین کے لیے سخت خطرہ ہے۔ کوئی بھی شخص جب اپنے گھر میں ہر طرف محرومیوں اور مایوسیوں کو ڈیرہ ڈالے دیکھتا ہے اور پھر اس کی نگاہ معاشرے کے ان افراد پر پڑتی ہے جو دولت کے نشے میں مست اور آسائشوں ،سہولیات اور تعیشات میں غرق ہوتے ہیں تو اس کا ذہن پروردگار کے تقسیم دولت کے قانون کو غیر عادلانہ اور غیر منصفانہ خیال کرنے کی طرف چل پڑتا ہے۔ یوں اس کی غربت ذات حق تعالی پر اعتراض کرنے سے بھی نہیں چوکتی۔

علامہ یوسف قرضاوی اس حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

"لا شک ان الفقر من اخطر الآفات علی العقیدةالدینیة ،وبخاصة الفقر المدقع الذی بجانبه ثراء فاحش، و بالاخص اذا کان الفقیر هو الساعی الکادح والمترف هو المتبطل القاعد، الفقر حینئذ مدعاة للشک فی حکمة التنظیم الالهی للکون و للارتیاب فی عدالة التوزیع الالهی للرزق"[1]

ترجمہ: بلاشک وشبہ فقر عقیدہ دینی کے لیے سب آفتوں سے زیادہ خطرناک ہے بالخصوص فقر مدقع یعنی فقر کی شدید ترین حالت، خصوصا ایسی جگہ جہاں دولت کی فراوانی ہو۔ یہ خطرہ ایسے وقت مزید خطرناک بن جاتا ہے جب غریب شخص جفاکش اور محنتی ہو جبکہ (اس کے پڑوس میں رہنے والا دولت مند) انتہائی کاہل اور سست ہو۔ ایسے حالات میں غریب لامحالہ یہ خیال کرتا ہے کہ رزق کی تقسیم کے معاملے پر پروردگار اس سے امتیاز اور جانبداری برت رہا ہے۔

فقر ادراک حقائق اور فہم مسائل میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ بالخصوص جب اہل ثروت، غرباء کو آیئنہ تقابل میں حقیقت سے انحراف کیطرف سعی کرتے ہیں تو غرباء کے ایمان پر زبردست چوٹ پڑتی ہے اور ان کا ایمان وایقان غربت سے جرے مسائل کی وجہ سے ڈگمگانے لگتا ہے۔ اس موضوع میں قرآن مجید نے باقاعدہ گفتگو کی ہے کہ کس طرح غربت کی وجہ سے غربت زدہ طبقے کو فاسد عقائد اور منحرف حقائق کی جانب گمراہ کن انداز میں پھنسایا جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے:

---

[1] مشکلۃ الفقر و کیف عالجہا الإسلام، یوسف قرضاوی، ص14

﴿وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَيُّ الْفَرِيقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَأَحْسَنُ نَدِيًّا﴾[1]

ترجمہ: اور جب انہیں ہماری کھلی ہوئی آیتیں سنائی جاتی ہیں تو کافر ایمان داروں سے کہتے ہیں دونوں فریقوں میں سے کس کا مرتبہ بہتر ہے اور محفل کس کی اچھی ہے۔

مذکورہ آیت کی تفسیر کے ضمن میں طبری رقم طراز ہیں:

"و اذا تتلی علیهم آیاتنا بینات،قال اللذین کفروا للذین آمنوا: ای الفریقین منا ومنکم اوسع عیشا،وانعم بالا،وافضل مسکنا،و احسن مجلسا،و اجمع عددا،و غاشیة فی المجلس،نحن ام انتم؟"[2]

ترجمہ: جب ان پر ہماری کھلی نشانیاں تلاوت کی جاتی ہیں تو کافر لوگ ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ تم خود ہی بتاؤ کہ ہم میں سے کون زیادہ صاحب ثروت، زیادہ اولاد و نعمت والا، بہترین رہائش و مسکن والا، زیادہ تعداد والا اور اعلی اور بارونق محفل و مجلس والا ہے۔ ایسے تم ہو یا ہم؟

گویا کہ اس طریقے سے ضعیف الایمان اور کمزور عقیدے والے مسلمانوں کے ایمان و عقیدے پر چوٹ لگائی جاتی تھی تا کہ مال و دولت کے حصول کے لیے وہ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔ علامہ قرطبی اسی آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"ای هؤلاء اذاقرئ علیهم القرآن تعززوا بالدنیا،وقالوا: فما بالنا–ان کنا علی باطل–اکثر اموالا،واعزنفرا،و غرضهم ادخال الشبهة علی المستضعفین وایهامهم ان من کثر ماله دل ذلک علی انه المحق فی دینه"[3]

ترجمہ: جب ان (مشرکین) کے سامنے قرآن کی تلاوت کی جاتی تو وہ دنیاوی جاہ و جلال کے حوالے سے اپنی کرامت و عزت کو بیان کرتے اور کہتے کہ ہمیں کیا پرواہ کہ ہم باطل پر ہیں جب کہ مال و افراد کی کثرت ہمارے پاس ہے۔ ان لوگوں کے مورد نظر یہ بات ہوتی کہ اس طرح کی باتوں سے کمزور ایمان

---

[1] سورۃ مریم:19/73

[2] جامع البیان فی تاویل القرآن، محمد ابن جریر طبری،15/608

[3] الجامع لاحکام القرآن، القرطبي،11/141

والوں کے دل میں شبہات پیدا کریں اور انہیں اس ابہام میں مبتلا کر دیں کہ مال و اموال کی زیادتی کسی شخص کے حق پر ہونے کی دلیل ہے۔

اگر بالفرض وہ ذات حق تعالی پر یہ جسارت نہ بھی کرے تو اپنی غربت و محرومی کا ذمہ دار معاشرے کے تعیش پسند طبقے کو قرار دیتا ہے۔ اور ان سے حسد، کینہ اور بغض جیسی بیماریاں معاشرے میں سر اٹھالیتی ہیں۔ اور پھر بعض اوقات فقراء کا طبقہ اپنی محرومی کا انتقام ان افراد سے لینے کے لیے ان کے مال و اموال اور ملکیتی اشیاء اپنے تصرف میں لینے کے لیے غلط راستوں مثلاً چوری چکاری، نقب زنی، ڈاکے اور بے ایمانی و بد دیانتی کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور یوں سماج ایک دوسرے کے مقابل کھڑا ہو جاتا ہے جو کہ معاشرے کے امن عامہ کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔

فقر و افلاس کی آفات کثیر اور اسکی جہات بہت زیادہ ہیں۔ بالخصوص یہ انسانی فکر اوراس کے میلانات کے لیے تباہ کن اثرات کا حامل ہے۔ فقر و تنگدستی کے مضمرات اور اثرات اس قدر شدید اور پُر خطر ہیں کہ سید الانبیاء بھی غربت و تنگدستی سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے۔ سید الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پالنے والے سے یوں مخاطب ہوتے تھے:

((اَللّھُمَّ اِنّی اَعُوذُ بکَ مِن الفَقرِ والقَلَّةِ والذِلَّة و اعُوذُ بکَ من اَن اظلَمَ او اُظلم))[1]

ترجمہ: اے پروردگار میں فقر و فاقہ، مال و اموال کی قلت اور ذلت سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اور اس بات سے بھی کہ میں کسی پر ظلم کروں یا کوئی مجھ پر ظلم کرے۔

جب کہ اس کے مقابلے میں آپ اپنے پروردگار سے مال و رزق کی وسعت کی دعا مانگتے تھے۔

آپؐ فرمایا کرتے تھے:

((اَللّھُمَّ اِنِی اَسئَلُکَ الھُدی وَالتُّقی وَالعِفَاف وَالغِنی))[2]

ترجمہ: پروردگار میں تیری ذات سے ہدایت، تقوی، عفت اور مال و رزق کی وسعت کا سوال کرتا ہوں۔

نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے خادم حضرت انس بن مالک کے لیے پروردگار سے دعا کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] مسند امام احمد ابن حنبل، احمد بن حنبل، حدیث 8053، ص 13/418

[2] المسند الصحیح المختصر بنقل العدل عن العدل الی رسول اللہ ﷺ، المعروف صحیح مسلم، مسلم بن حجاج نیشاپوری، کتاب الذکر والدعاء والتوبہ والاستغفار، باب التعوذ من شر ما عمل من شر لم یعمل، حدیث 4، 2721/2087

((اَللّٰھُمَّ اَکثِر مَالَه وَ وُلدَه وبَارِک لَه فِیمَا اَعطَیتَه))[1]

ترجمہ: پروردگار انس کے مال و اولاد میں کثرت پیدا فرما، اور جو کچھ اس کو عطا کیا ہے اس میں برکت عطا فرما۔

یقیناسردار انبیاء جس چیز سے پروردگار کی پناہ کے طلب گار ہیں اس کے اثرات معاشرے کے لیے کسی صورت بھی مثبت یا قابل قبول نہیں ہوسکتے۔ اور اس میں پائی جانے والے فواحش، برائیاں اور نقصانات نہایت واضح ہوں گے۔ فقر و افلاس در اصل خود غرضی، لالچ، سرکشی، دھوکہ دہی اور فساد جیسے تمام امور کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ آنحضرت تنگدستی کو ایسی بیماری بتاتے ہیں جو انسان سے کفر کا ارتکاب بھی کرواسکتی ہے۔ حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول اللہ کا فرمان ذیشان ہے:

((کَادَالفَقرُ اَن یَّکُونَ کُفراً))[2]

ترجمہ: بعید نہیں کہ غربت انسان کو کافر بنادے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اک دعا میں پروردگار سے فر اور فقر سے پناہ مانگی تو سائل نے سوال کیا کہ کا کفر اور فقر دونوں برابر درجے کے ہیں کہ آپ نے دونوں سے ایک ہی دعا میں اور ایک ساتھ پروردگار کی پناہ چاہی ہے تو خاتم المرسلین کا جواب یہ تھا کہ "دونوں برابر ہیں۔"

ابو سعید خدری کی روایت میں آنحضرت کا ارشاد گرامی ہے:

((اَللّٰھُم اِنِّی اَعُوذُ بِکَ مَنَ الکُفرِ وَالفَقرِ، فقال رجل: اَیَعتَدِلَان؟ قَالَ:نَعَم))[3]

ترجمہ: پروردگارا! میں تیری پناہ مانگتا ہوں کفر و فقر سے۔ ایک شخص نے پوچھا: کیا یہ دونوں برابر ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں (دونوں برابر ہیں)

فقر چونکہ کفر کی بنیاد اور اساس ہے تبھی ہم نے دیکھا کہ رسول خدا نے دونوں سے ایک ساتھ پناہ مانگی۔ اور یہ بات بدیہی ہے کہ غربت و افلاس کے مشکل اور کٹھن حالات انسان کو سخت دل اور بد خلق بنا دیتے ہیں۔ اس کے اندر سے عواطف و احساسات

---

[1] صحیح بخاری، محمد ابن اسماعیل بخاری، باب الدعا بکثر المال مع البرکۃ، حدیث 6378، ص 8/81

[2] شعب الایمان، احمد بن حسین ابو بکر البیہقی، مکتبۃ الرشد للنشر والتوزیع، طبع اول 2003ء، باب الحث علی ترک الغل والحسد، حدیث 6188، ص 9/12

[3] السنن الکبری، النسائی، باب الاستعاذہ من الکفر، حدیث 7867، ص 7/221

اور انسانی ہمدردی کا مادہ آہستہ آہستہ پگھل کر ختم ہو جاتا ہے۔اس کے اندر کی الجھنیں، پریشانیاں اور مصیبتیں اس کے انسانی روابط پر اثر انداز ہو کر اس کے انسانی جذبات کو پس منظر میں دھکیل دیتے ہیں۔وہ زندگی کی ہر سانس غربت و تنگدستی سے چھٹکارا حاصل کرنے پر مرکوز کرتا ہے چاہے اس کے لیے اس کو کس قدر بھیانک کام ہی انجام کیوں نہ دینے پڑیں۔ کبھی کبھی تو اس مقصد کے لیے اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

تاریخ نے اپنے دامن میں ایسے واقعات کو محفوظ کر رکھا ہے کہ جہاں والدین نے اپنی غربت و تنگدستی سے بددل ہو کر یا پھر اپنی اولاد کو غربت و تنگدستی اور فقر وافلاس میں جھونک دینے کے ڈر سے ان کے قتل کا اقدام بھی کیا ہے۔قرآن مجید اس طرح کی سنگین وارداتوں کو فقر واملاق کا نتیجہ گردانتا ہے۔کلام الہی میں حکم پروردگا ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْئًا كَبِيرًا﴾[1]

ترجمہ: اور اپنی اولاد کو تنگدستی کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی بے شک ان کا قتل کرنا بڑا گناہ ہے

اس قرآنی حوالے سے معلوم ہوا کہ اولاد کو قتل کرنے کا سبب املاق یعنی فقر و فاقہ کا خدشہ تھا۔لہذا قرآن اسی آیت کے اختتامی الفاظ میں رزق کی ذمہ داری پروردگار کے سپرد کرتے ہوئے ہمیں یہ پیغام پہنچارہا ہے کہ تمہارا اور تمہاری اولادوں کا رزق پروردگار کے ہاتھ میں ہے،لہذا رزق کی تنگی یا عدم دستیابی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل کے گھاٹ مت اتارو۔

اسلام اگر مالی تنگی و غربت وافلاس کو قرین کفر رکھ کر اولاد کے قتل جیسے سنگین عمل کا محرک کہتا ہے تو دوسری طرف مال داری اور مال و دولت کو معاشرے کی بہبود و بھلائی اور تقوی الہی اختیار کرنے کی بہت بڑی وجہ اور اہم ترین سبب بتلاتا ہے۔

آنحضرت سے منقول ایک روایت میں وارد ہوا کہ:

((نِعمَ العَونُ عَلَى تَقوَى اللهِ الغِنَى))[2]

ترجمہ: تقوی الہی اختیار کرنے کے لے غنی وثروت مندی بہترین ساتھی ہے۔

---

[1] سورۃالاسراء:17 /: 31

[2] اتحاف المہرۃ بالفوائد المبتکرۃ من اطراف العشرۃ(المعروف اتحاف المہرۃ لابن حجر)، احمد ابن حجر عسقلانی، مجمع الملک فہد للطباعۃ المصحف الشریف، مدینہ، طبع اول 1415ھ، کتاب المراسیل والمقاطیع والموقوفات، 19 / 505

غربت فواحش و محرمات کی مختلف انواع مثلاً چوری، بے ایمانی، زنا اور لواط وغیرہ کا ارتکاب کرنے کی بھی ایک اہم وجہ ہے۔ان غلاظتوں سے انسان اپنے کردار نیز ایمان و عقیدہ دونوں کو پنے ہاتھوں مار ڈالتا ہے اور اپنی بقیہ زندگی ایک مجرم کی طرح گزارنے پر مجبور ہے۔

جس کی تائید صحیح بخاری میں رسول اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے ذکر شدہ بنی اسرائیل کی اس عورت کے اس قصے سے ہوتی ہے کہ جس کو مال و دولت کی ضرورت تھی مگر اس کے لیے کہیں سے بھی میسر نہیں تھا تو اس نے اپنے چچازاد کو اپنی رغبت و خواہش بتا کر مال کا مطالبہ کیا کہ اس کے مقابل وہ اس کی خواہش نفس پوری کرے گی۔البتہ بعد میں لطف پروردگار نے ان کو اس برائی میں پڑنے سے بچالیا۔

صحیح بخاری اس کے چچازاد بھئی کے ان الفاظ کو بیان کیا گیا ہے:

"فجا ئتنی فاعطیتها عشرین ومائة دینار علی ان تخلی بینی وبین نفسهاففعلت حتی--"[1]

ترجمہ: پس وہ میرے پاس آئی اور میں نے اس کو 120 دینار اس شرط پر دیے کہ وہ اپنے نفس پر مجھے اختیار دے، تو اس نے ایسا ہی کیا حتی کہ۔۔۔۔

اس طرح غربت و تنگدستی اور مجبوری انسان کے ایمان کو خطرے میں ڈال دیتی ہے اور بعض اوقات وہ معمولی مالی فائدے کے بدلے اپنے ایمان کو بیچ ڈالتا ہے اور سراسر خسارے کا سودا کرتا ہے۔ایسے ہی افراد اللہ کے آخری نبی نے دنیا کا بدبخت ترین افراد قرار دیا ہے کہ جو دنیاوی زندگی میں فقر میں مبتلا ہوئے اور بعد از مرگ اپنی بد اعمالی، بے ایمانی اور بدکرداری کی وجہ سے عذاب آخرت میں گرفتار ہوئے۔

غربت سے پیدا شدہ مشکلات اور مصائب کی فہرست طویل ہے۔اعلام نے اس کو انسانی زندگی کا سب سے بڑا خطرہ کہا ہے۔امام جعفر صادق کا قول ہے کہ:

"ذقت المرارات کلها فلم اذق شیئا امر من الفقر"[2]

ترجمہ: میں نے دنیا کی تمام تلخیوں کو چکھا ہے مگر غربت سے زیادہ کسی چیز کو تلخ اور کڑوا نہیں پایا۔

حضرت علی رضوان اللہ تعالی علیہ نے اپنے فرزند محمد حنفیہ کو غربت کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا:

---

[1] صحیح بخاری، محمد ابن اسماعیل بخاری، کتاب الاجارہ، باب من استاجر اجیر افترک الاجیر، حدیث رقم 2272، ص 3/91

[2] بحار الانوار الجامعۃ لدرر اخبار الائمۃ الاطہار، محمد باقر المجلسی، منشورات مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، طبع اول 2008ء، 13/413

"يا بني إني أخاف عليك الفقر فاستعذ بالله منه، فإن الفقر منقصة في الدين، ومدهشة للعقل، داعية للمقت"[1]

ترجمہ: میرے بیٹے! میں تمہارے لیے فقر و تنگدستی سے ڈرتا ہوں، لہذا فقر و ناداری سے اللہ کی پناہ مانگو۔ کیونکہ یہ دین کے نقص، عقل کی پریشانی اور لوگوں کی نفرت کا باعث ہے۔

بعض اوقات فقر و تنگدستی اس نہج تک پہنچا دیتی ہے کہ انسان اپنا دین تک درہم و دینار کے عوض بیچ دیتا ہے اور اس عارضی دنیا کو ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کے بدلے خریدتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ سے مروی سید الرسل کا فرمان ہے:

"بَادِرُوا بِالأَعمَالِ فِتَناً كَقِطَعِ اللَّيلِ المُظلِمِ يَصبحُ الرَّجُل مؤمِناً ويُمسِي كافراً أو يُمسِي مُؤمناً ويُصبحُ كافِرا يَبِيعُ دِينَه بِعرضٍ من الدُّنيا"[2]

ترجمہ: باطل اور جھوٹے اعمال سے اس طرح دور ہو جاؤ جس طرح سیاہ رات چھٹ جاتی ہے۔ جان لو کہ کوئی شخص صبح طلوع ہوتے وقت مومن جبکہ شام کو کافر ہوتا ہے، یا پھر شام کو مومن تو صبح کافر ہوتا ہے۔ اور یوں وہ اپنے دین کو دنیاوی سامان کے عوض بیچ دیتا ہے۔

آج کی دنیا میں یہ خطرہ اور سوا ہے جب ہر طرف سے دیگر ثقافتیں اور جدید پرکشش دنیاوی فوائد کی بھرمار ہے۔ جہاں بظاہر ایک مظلوم و بے کس کی مدد کے لیے ہزاروں ہاتھ موجود ہوتے ہیں مگر اپنے پس پردہ عزائم اور فوائد کے ساتھ اس کے ایمان و ایقان کو آلودہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ عبد الرحمن بن سعد بن عبد الرحمن لکھتے ہیں:

"ان المبشرين والشيوعيين و غيرهم من اصحاب النظريات والعقائد عرفوا ان لا مجال لابعاد المسلين عن دينهم،الا بتقديم بنوع من الخدمات ، مظل التعليم و الصحة و غيرها، ولما كانت الشعوب الاسلاميه بسبب الفقر فى حاجة ملحة لهذه الخدمات فانهم يقدمون اليها هذه الخدمات بمثابة الطعم الذى يقدمه الصياد للسمكة، فما ان تلتهمه حتى تقع فى الشرك"[3]

---

[1] نہج البلاغہ، محمد بن حسین الشریف رضی، امامیہ پبلی کیشنز، لاہور، طبع سیز دہم 1998، حکمت 319، ص:913

[2] صحیح مسلم، مسلم بن حجاج نیشاپوری، کتاب الایمان، باب الحث علی المبادرۃ بالاعمال قبل تظاہر الفتن، 1/110

[3] مشکلۃ الفقر و سبل علاجہا فی ضوء الاسلام، عبد الرحمن بن سعد بن عبد الرحمن، ص160

ترجمہ: صاحبانِ فکر و نظر اور اہل علم و بصیرت جانتے ہیں کہ امت مسلمہ کو دینی امور سے دور کرنے کی غرض سے تعلیم اور صحت جیسے معاملات کی حیثیت بنیادی اور انتہائی کلیدی ہے، چونکہ مسلمان ممالک و اقوام غربت و افلاس کے سبب ان خدمات کے شدید ضرورتمند ہیں۔ مسلمانوں کی ان ضروریات کو (بلا معاوضہ پورا نہیں کیا جاتا بلکہ) جیسے ایک شکاری اپنے کانٹے پر مچھلی کی خوراک لگا کر اس کا شکار کرتا ہے ایسے ہی ان خدمات کو ایمان و شرک کے بیچنے کے عوض میسر کیا جاتا ہے۔ (اور ان کی آڑ میں مسلمانوں میں ایمانی انحراف کی کوشش کی جاتی ہے)

پس لوگ اپنے ایمان کی کمزوری، فہم و ادراک کی کمی، مال و اسباب کی قلت اور فقر و فاقہ کی وجہ سے دین کو دنیاوی حساب کتاب کے بدلے میں بیچ دیتے ہیں۔

فقر کے اخلاق انسانی پر اثرات

جس معاشرے کی اخلاقیات دم توڑ جائیں وہاں جرائم اور معاشرتی انحراف کا سدباب کرنے کے لیے انسان کے اندر کوئی اندرونی خودکار عنصر باقی نہیں رہتا۔ اخلاقیات سے محروم معاشرہ درحقیقت تیزی سے اخلاقی تنزلی اور انحراف کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ انحراف اخلاقی برائیوں اور جرائم کی وجہ بنتا ہے جو معاشرے کو کھوکھلا کر دیتے ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں جب غربت و تنگدستی بڑھ جائے تو اس کے نوجوانوں کی بڑی تعداد غیر اخلاقی سرگرمیوں مثلاً انتشار، بدامنی، انتہاپسندی، انحرافات اور جرائم کے راستے پر چل پڑتی ہے۔ محمد غزالی لکھتے ہیں:

"ان اضطراب الاقتصادی کثیرا ما یکون السبب فی نشوء الجرائم والرزائل و شیوعها"[1]

ترجمہ: بے شک اقتصادی اضطراب کا پایا جانا، جرائم اور برائیوں کے پیدا ہونے اور عام ہو جانے کی ایک بڑی وجہ ہے۔

بلاشبہ غربت جرائم اور نفرتوں کو جنم دیتی ہے جس کی تائید کے لیے یہی امر کافی ہے کہ غربت سے متاثرہ اقوام ہی جرائم، انتشار اور دہشت گردی کا سب سے زیادہ شکار ہیں۔ جرائم کا کسی بھی معاشرے میں رہنا اس وجہ سے بھی خطرناک ہوتا ہے کہ وہ مختصر وقت میں ہی سماجی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں اور پھر سماج میں آنے والی کئی نسلیں چار و ناچار ان جرائم کی آغوش میں پلتی

---

[1] الاسلام والاوضاع الاقتصادیۃ، محمد غزالی، ص92

بڑھتی ہیں اور ترقی کی بجائے تنزلی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یوں غربت جرائم کی ماں کا کردار ادا کرتی ہے اور معاشرے کو بنیادوں تک ہلا دیتی ہے۔

ڈاکٹر محمد عبد اللہ حماد لکھتے ہیں:

"تشير الدراسات الميدانية و التجربية على ان الجريمة على مستوى الافراد ذات علاقة بالعديد من العوامل،منها :الفقر، الكبت ، و تهدم بنيان الاسرى"[1]

ترجمہ: زمینی حقائق اور تجربات سے پتا چلتا ہے کہ معاشرے میں موجود جرائم کا تعلق چند ایک عوامل سے ہوتا ہے۔ کہ جن میں فقر اور کبت بھی شامل ہیں۔ یہ عوامل (جرائم کی پیدائش کے ساتھ ساتھ) عائلی نظام کو بھی تباہ کرتے ہیں۔

اقوام عالم میں پائے جانے والے جرائم کی وجہ کسی نہ کسی طور یہی ہوتی ہے کہ اس علاقے کے محروم، فاقہ کش اور مفلس طبقہ کی غربت و تنگدستی، حاجتمندی اور مالی حالات انہیں چوری، دھوکہ دہی، لوٹ مار، ڈاکہ زنی، خیانت کاری، لوگوں کے مال و اموال کی حق تلفی، ملاوٹ، رشوت، غبن، اغوا، جعلسازی، ذخیرہ اندوزی، عصمت دری، تخریب کاری، غیر قانونی اسلحے کی ترسیل، سمگلنگ، منشیات فروشی اور بدعنوانی جیسے جرائم کا ارتکاب کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ سب امور معاشرے کی اخلاقی گراوٹ اور انحراف کا سبب بنتے ہیں۔

عبد الرحمن بن سعد بن عبد الرحمن لکھتے ہیں:

"ان اكثر جرائم الاموال كانت بسبب فقراء،لا يعنى ذلک ان غيرها من الانحرافات الاخلاقية لم تحدث بسبب الفقروالحرمان، بل ان كثيرا من جرائم الاخلاقية الاخرى كانت بسبب البطالة والفقر،مثل ممارسة البغاء و انتشاره فى المدن"[2]

ترجمہ: مالی جرائم کی اکثر و بیشتر وجہ فقر و افلاس ہے، البتہ مقصد ہرگز یہ نہیں کہ مالی جرائم کے علاوہ اخلاقی انحرافات کے پھیلاؤ سے فقر و محرومی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ مالی جرائم کے علاوہ اکثر اخلاقی

---

[1] التحصر والجریمۃ، ڈاکٹر محمد عبد اللہ حماد، المرکز العربی للدراسات الامنیۃ والتدریب، ریاض، طبع 1406ھ، ص29

[2] مشکلۃ الفقر و سبل علاجہا فی ضوء الاسلام، عبد الرحمن بن سعد بن عبد الرحمن، ص 142

انحرافات اور جرائم بھی بے روزگاری اور غربت کی پیداوار ہیں۔ مثلاً شہروں میں بڑھتا ہوا انتشار اور نفرت بھی اسی کے سبب ہے۔

نظام زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے انسانوں کو طرح طرح کی حاجتیں اور ضرورتیں پیش آتی ہیں۔ غذا، لباس، کھانا، مکان، تعلیم، صحت، پینے کے لیے صاف پانی اور تمام بنیادی ضروریات زندگی ہر انسان کا حق بھی ہیں اور ضرورت بھی۔ حیات انسانی کا ان کے بغیر تصور و قیام ممکن نہیں۔ جب کسی بھی فرد کو یہ اشیاء فقر و افلاس کی وجہ سے میسر نہ ہو رہی ہوں تو ایسا ممکن نہیں کہ ان کے بغیر ہی زندگی کو آگے چلایا جا سکے۔ عموماً ہوتا یہی ہے کہ ان کی عدم دستیابی کی صورت میں اکثر غلط رستوں کا چناؤ کیا جاتا ہے اور پھر ان رستوں پر چل پڑنے والے اپنے لیے کسی قاعدے، قانون اور اصول کو رکاوٹ نہیں سمجھتے اور اپنی ضروریات کو کسی بھی غیر مشروع طریقے سے پورا کرنے کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ایسی سوچ والے افراد ہر قسم کے قاعدے، قانون کو بدل کر اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے اپنی مجبوری اور حاجتمندی کو اپنا جواز بناتے ہیں اور کسی جائز و ناجائز میں فرق روا نہیں رکھتے۔

علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

"و شر من ذلک ان یؤدی ذلک الحرمان الی تسکک فی القیم الاخلاقیه نفسها، و عدالة مقاییسها ، کما ادی الی تشکک فی القیم الدینیة"[1]

ترجمہ: غربت کی بڑی برائی یہ ہے کہ انسان اخلاقی اقدار نیز ان کے معیار و مقساط کو بھی شک کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ دینی اقدار بھی اس کی نظر میں مشکوک ہو جاتی ہیں۔

فقر و افلاس کے دباؤ سے متاثر ہو کر انسان اخلاقی اقدار اور ان کے پیمانوں کو بھی بدل دیتا ہے۔ بلکہ وساوس و شکوک کی زد میں آکر مذہب کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں رہتی اور وہ دینی اقدار کو بھی مشکوک سمجھتا ہے۔ فقراء کو ان کی محرومیاں اور پریشانیں بعض اوقات وہ کچھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں جو انسانی عزت و شرافت اور کرامت نفس سے میل نہیں کھاتا۔

معاشروں کی بنیاد انسانیت، محبت، مواخات اور مواساۃ پر ہوتی ہے۔ لیکن انتشارِ فقر و افلاس ایک ایسی بیماری ہے جو لوگوں کے دلوں سے محبت و اخوت کی معاشرتی بنیادوں کو مسمار کر دیتی ہے۔ اس بات کا مشاہدہ روز مرہ زندگی میں ہر ایک کو ہی ہو رہا کہ موجودہ معاشروں سے محبت و اخوت جیسی اقدار کس طرح جلدی رخصت ہو رہی ہیں۔

---

[1] مشکلة الفقر و کیف عالجها الاسلام، یوسف قرضاوی، ص 15

حیاتِ انسانی کے لیے فقر و افلاس سب سے بڑی آزمائش و امتحان ہے۔ یہ ایک ایسا امتحان ہے کہ نفسِ انسانی جس کا متحمل نہیں ہو پاتا۔ یہ وہ مصیبت ہے جس سے شیطان بھی انسانوں کو ڈراتا ہے اور اس کو خوفِ فقر دلا کر انفاق فی سبیل اللہ جیسے اقدامت سے اس کو روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالی اپنی لاریب کتاب میں فرماتا ہے:

﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ﴾[1]

ترجمہ: شیطان تمہیں تنگدستی کا وعدہ دیتا ہے اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے۔

جب انسان ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزار رہا ہو جس کی اخلاقی اقدار اور ان سے جڑے ہوئے زندگی کے تمام پیمانے درہم برہم ہو چکے ہوں، جس میں انسان کا مقام و مرتبہ اس کی عقل و دانشمندی کی بجائے دنیاوی دولت و ثروت کے اعتبار سے مقرر ہوتا ہو اور جہاں تعلیم، دین اور اخلاق کی طرح کی چیزوں کی کوئی قیمت نہ ہو تو ایسے معاشروں میں رہنے والا اشرافیہ کا طبقہ اور تمام صاحبانِ ثروت اپنے مال و دولت کو اپنی عزت و شرافت سمجھ کر سینے سے لگائے رکھنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ جس معاشرے کی اقدار اس طرح کی ہو جائیں وہاں مالی طور پر کمزور لوگوں کی مدد کو آگے بڑھنے کے لیے کوئی تیار نظر نہیں آتا۔ جب لوگوں کی نظر میں عزت و کرامت، مال و دولت کی کثرت کا نام ہو تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب لوگ کبھی معاشرے میں صاحبانِ عزت و مقام نہیں ہو پاتے چاہے ان کی انسانیت کتنے معراج پر یہ کیوں نہ ہو۔

ایسے حالات میں اخلاقی اقدار منہدم ہو جانے کی وجہ سے مال و دولت کو مرکزیت مل جاتی ہے اور معاشرے میں موجود دونوں طبقوں یعنی امراء اور فقرء میں دو الگ الگ اخلاقی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ جس سے معاشرہ اخلاقی بے راہ روی اور انتشار و تقسیم میں مبتلا ہو جاتا۔

وہ برائی جس کا شکار دولت مند طبقہ ہوتا ہے اس کا نام "بخل" ہے۔ چونکہ شرافت و بزرگی اور عزت و اکرام کا معیار دولت قرار پاتی ہے تو صاحبانِ دولت اپنی دولت کو خرچ کر کے اپنے عزت و شرافت کو کم کرنے پر مائل نہیں ہوتے اور یوں وہ اللہ کی عطا کی ہوئی دولت سے نہ صرف غریبوں بلکہ اپنی ذات اور اپنے واجب النفقہ افراد کو بھی محروم رکھتے ہیں اور اسی کا نام بخل ہے۔ جس دولت و ثروت کو معاشرے کی فلاح و بہبود اور انسانی بھلائی کے لیے استعمال ہونا تھا اس کو اپنی جھوٹی عزت و بزرگی کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف بخل انسانی معاشرے کے اخلاقی ارتقاء میں رکاوٹ ڈال کر باہمی امداد جیسے نظریوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔

---

[1] سورۃ البقرۃ:2/268

وہ برائی جس کا شکار محروم اور غریب طبقہ ہوتا ہے وہ ہے "سوال کرنا"۔ جب دولت کو خیرات جیسے عوامی فلاح کے منصوبوں سے روک دیا جائے تو غریب مجبور ہو کر اپنا دست سوال دراز کرتا۔ یہ عمل محتاج کی ہتکِ حرمت کے ساتھ ساتھ معاشرے کے زوال کا سبب بھی ہے۔

فصل سوم

فقر کے اقتصادی زندگی پر اثرات

اقتصادی زندگی پر اثرات

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ فقر و افلاس کے اثرات کثیر الجہات ہیں۔ مگر اس کے اقتصادی اثرات جو معاشرے کی معیشت و اقتصاد کو متاثر کرتے ہیں فقر و غربت کے ان اثرات سے کہیں زیادہ ہیں جو طبیعی اثرات کے ضمن میں معاشرے پر پڑتے ہیں۔ معاشی حوالے سے فقر و محرومی افراد کی زندگیوں کو بھی متاثر کرتا ہے اور اقوام و ممالک کی مجموعی معیشت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ فقر و فاقہ کا فوری نتیجہ محرومی و محتاجی کی صورت میں نکلتا ہے اور معاشی پسماندگی کو دعوت دیتا ہے۔

ویسے تو غربت کے اقتصادی اثرات بہت زیادہ ہیں۔ مگر اہم ترین درج ذیل ہیں۔

(i) اقتصادی انحصار

(ii) پسماندگی

(iii) غربت کی شرح، فقراء کی تعداد اور بے روزگاری میں اضافہ

(i) اقتصادی انحصار

فقر و غربت کے باقی آثار تو شاید وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طاری ہوتے ہیں، مگر اس کا فوری ترین اثر انسان کی محتاجی کی صورت میں نکلتا ہے۔ جب ضروریات زندگی کے لیے اپنے آپ کو خالی ہاتھ دیکھتا ہے تو پھر اس کی نگاہیں دوسرے افراد اور اقوام کی طرف دیکھتی ہیں کہ جو اس کی ضرورت اور حتیاج کو کسی طرح پورا کر دیں۔ یوں افراد اور اقوام غیروں کے رحم و کرم اور انحصار پر ہوتے ہیں۔

افراد معاشرہ کے ایک دوسرے پر انحصار کرنے سے زیادہ خطرناک وہ صورتحال ہوتی ہے جب ممالک و اقوام اپنے مالی معاملات میں دوسروں پر انحصار کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں۔ ایسی اقوام اور ممالک کبھی بھی اپنے ذاتی مفادات طے کرنے کی صورتحال میں نہیں ہوتے، بلکہ ان کی پوری معیشت و اقتصاد بیرونی امداد اور اس سے وابستہ شروط و شرائط پر منحصر ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ابراہیم عسل لکھتے ہیں:

”وهناك هيمنة وسيطرة للأجهزة الأجنبية على اقتصاد البلدان المتخلفة بامتلاكهم الأراضي والشركات والمصانع، والاستثمار في مجال المواصلات، ومجال الطاقة، وهناك أوجه أخرى لتعميق التبعية الاقتصادية، باستمالة بعض الرؤساء وذوي النفوذ، وفي كثير

من البلدان الفقيرة نجد أن صادراتها من المنتجات الأولية تكون لصالح أسواق البلدان المتقدمة"[1]

ترجمہ: پسماندہ ممالک کی معیشت پر بیرونی عوامل کا مکمل اثر و نفوذ بلکہ قبضہ ہے۔ان نادیدہ قوتوں نے پسماندہ ممالک کی زمینوں، کمپنیوں اور فیکٹریوں کی ملکیت حاصل کرلی ہے۔اس کے علاوہ نقل و حمل اور توانائی کے شعبے بھی ان کی سرمایہ کاری کے مرہون منت ہیں۔اقتصادی انحصار کو مزید بڑھانے کے لیے ان لوگوں نے پسماندہ ممالک کے حکمران طبقے، اشرافیہ اور صاحبان اثر و نفوذ کو اپنی لابی کا حصہ بنایا ہوا ہے۔نہ صرف یہ بلکہ اکثر غریب اور پسماندہ ممالک کی بنیادی پیداواری مصنوعات کی برآمدات تک دراصل ترقی یافتہ ممالک کی منڈیوں کے حق میں وضع کی جاتی ہیں۔

اقتصادی انحصار اقوام اور ممالک کی معیشت واقتصاد کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔مالی اور سیاسی طور پر مضبوط ممالک پسماندہ ممالک کی غربت و افلاس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں محدود مالی وسائل دینے کے بدلے دنیا بھر میں اپنی سیاست اور اجارہ داری قائم کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہیں۔ایسے حالات انسانی فلاح و بہبود اور فکر و شعور کی ترقی کے لیے نقصان دہ ہیں۔اس لیے کہ پسماندہ ممالک کو قرض اور امداد مہیہ کرنے والے ممالک و ادارے اپنے مفادات کہ بنیاد پر تمام شروط و شرائط کو مقرر کرتے ہیں۔اور یوں پسماندہ ممالک کی فلاح اور بھلائی یکسر نظر انداز ہو جاتی ہے اور ان مقرر کردہ شرائط کی وجہ سے ان ممالک کے اکثر و بیشتر وسائل محدود طبقے کی مرضی اور مفادات کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔

حمدی عبد العظیم اس حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

"المقصود بالتبعية الاقتصادية هو تكييف الهياكل الاقتصادية في المجتمعات النامية وفقا لمصالح واحتياجات الدول المتقدمة، بحيث يصبح صنع القرار الاقتصادي وحتى السياسيِ بيَد هذه الدول سواء في صورة سيطرة شركات احتكارية، أو مساعدات أو قروض أو استثمارات أو تبادل تجارى"[2]

ترجمہ: اقتصادی طور پر انحصار کا مطلب یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے اقتصادی امور و عوام اور معاشی بلکہ سیاسی و قومی مسائل کا ترقی یافتہ ممالک کے مصالح و مفادات کے (تحفظ کے) موافق و مطابق ہونا اور

---

[1] التنمیۃ فی الاسلام: مفاہیم، مناہج وتطبیقات، ابراہیم عسل، الموسسۃ الجامعۃ للدراسات، بیروت، طبع 1996، ص177

[2] فقر الشعوب بین الاقتصاد الوضعی والاقتصاد الاسلامی، حمدی عبدلعظیم، ص102

ان کو معاشی تحفظ فراہم کرنا۔ گویا کہ اقتصادی انحصار کے نتیجے میں اقتصادی وسیاسی فیصلہ سازی کے تمام قومی امور ترقی یافتہ ممالک کے پاس چلے جاتے ہیں اور یوں ان کی اجارہ داریاں قائم ہو جاتی ہیں۔ لہذا کسی بھی قوم وملک کے تمام مالی وسیاسی امور، چاہے وہ قرض، امداد یا سرمایہ کاری سے متعلق ہوں یا تجارتی لین دین کی شکل میں ہوں، کو ترقی یافتہ ممالک کی صوابدید پر چھوڑ دینا اقتصادی انحصار کہلاتا ہے۔

اقتصادی انحصار کی مختلف شکلیں اور صورتیں ہو سکتی ہیں۔ کبھی یہ انحصار مالی و تجاتی امور سے متعلق ہوتا ہے، جس کی واضح ترین شکل ترقی پذیر ممالک کا اپنے قدرتی وسائل، معدنیات، خام مال کی پیداوار اوران کو نکالنے میں مکمل طور پر ترقی یافتہ ممالک پر انحصار کرنا ہے، کہ جس کی وجہ سے ان کے ذاتی وسائل بھی درحقیقت غیروں کے دست قدرت میں چلے جاتے ہیں اور غیر ملکی سرمایہ کاری ان تمام امور پر مکمل یا غالب کنٹرول حاصل کرلیتی ہے۔[1]

اقتصادی انحصار کا شاید خطرناک تریں پہلو یہ ہے کہ پسماندہ ممالک کی غلہ منڈیاں اور غذائی اجناس کی داخلی و ملکی مارکیٹس، عالمی منڈیوں کے اثرات سے محفوظ نہیں ہیں حالانکہ ملک کی پوری آبادی کی ضروریات کا انحصار ملکی و داخلی منڈیوں پر ہی ہوتا ہے۔ یوں غلہ منڈیوں اور غذائی اجناس کی منڈیوں کا خطرناک اقتصادی پہلو یہ ہے کہ عالمی منڈیاں درحقیقت اقتصادی وسیاسی معاملات کے اتار چڑھاؤ اور گورکھ دھندے کا اڈہ بن چکی ہیں۔[2]

جب بین الاقوامی سطح پر پسماندہ ممالک کے وسائل کے ساتھ اس طرح کا گھناؤنا کھیل کھیلا جارہا ہو تو ان حالات میں اس ملک کے وسائل کا اپنی آبادی کے حق میں استعمال ہونے کا دور دور تک امکان نظر نہیں آتا۔ لہذا ضروری ہے کہ ان ممالک کی حکومتیں کوئی ایسا نظام وضع کریں کہ جس سے ان کے ذاتی وسائل کا قومی استعمال یقینی بنایا جاسکے اور دیگر ممالک پر اقتصادی انحصار کے متبادل رستے تلاش کیے جائیں۔ عریقات حربی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

”ولكي يتحقق الاستقلال الاقتصادي، وجب التخلص تدريجيا من التبعية، بتغيير الهيكل الاقتصادي للدولة، بإحداث تنمية حقيقية تعتمد على الذات باستغلال الموارد المتاحة في الدولة استغلالا صحيحا“[3]

---

[1] فقر الشعوب بین الاقتصاد الوضعی والاقتصاد الاسلامی، حمدی عبدلعظیم، ص104

[2] خمسۃ مشکلات اساسیۃ لعالم متخلف، صموئیل عبود، کلیۃ التربیۃ الریاضیۃ، جامعیہ حلوان، بنین، الھرم، طبع 1986ء، ص90

[3] مبادی فی التنمیۃ والتخطیط الاقتصادی، حربی عریقات، دار الفکر للنشر والتوزیع، اردن، طبع اول 1992، ص30

ترجمہ: دوسرے ممالک پر اقتصادی ومالی انحصار کو ختم کرنے اور اقتصادی خود مختاری کے حصول کے لیے لازم ہے کہ دیگر ممالک اور اقوام پر انحصار کو درجہ بدرجہ ختم کیا جائے۔ ریاست کے اقتصادی ڈھانچے کو تبدیل کی جائے، اور ذاتی انحصار کے اصول کی بنیاد پر معیشت کی ترقی کو ممکن بنایا جائے۔ تمام دستیاب ملکی وسائل کو استحصال سے بچایا جائے۔

صرف یہی اقدامات اس سلسلے میں کامیابی کے لیے کافی نہیں ہیں بلکہ ضروری ہے کہ ان وسائل سے اقوام بذات خود بھر پور استفادہ کریں۔ بیرونی قرضوں پر انحصار کم سے کم حد تک لایا جائے۔ اس کے علاوہ اقتصادی آزادی اور خود مختاری حاصل کرنے کے لیے درآمدات پر انحصار اور اس کی لاگت کے نظام کو بھی بدلنا ہو گا۔ بالخصوص وہ درآمدات جو ان ممالک اور اقوام کی اقدار اور روایات کے برعکس ہیں بلکہ غیر ملکی تہذیب و ثقافت کو پیش کرتی ہیں۔ ان کا متبادل تلاش کر کے تہذیب و ثقافت کے رنگ کو مخلوط ہونے سے بچانا ہو گا[1]۔ غیر ملکی اقتصادی و سماجی اثرات کی ترمیم کے بارے سوچنا ہو گا اور سب سے اہم یہ کہ پیداوار کے عمل کو مغربی اجارہ داری کے اثرات بالخصوص تکنیکی، فنی اور سائنسی مہارتوں کے فقدان کے سبب مغرب کے بڑھتے ہوئے اقتصادی اجارہ داری کے اثر کو زائل کرنا ہو گا۔

(ii) پسماندگی

فقر و غربت، پسماندگی کا اہم ترین سبب ہے۔ تنہا غربت ہی پسماندگی کا سبب نہیں بنتی بلکہ کچھ دیگر عوامل جو خود غربت کا نتیجہ ہوتے ہیں، غربت کے ساتھ مل کر پسماندگی کو دعوت دیتے ہیں۔ ان عوامل میں جہالت، ناخواندگی، ناقص غذائیں، بیماریاں، ذرائع نقل و حمل کی بُری اور خستہ حالت، بے روزگاری اور ناقص و فرسودہ اقتصادی نظام وغیرہ شامل ہیں۔ جب یہ سارے عوامل مل کر کسی فرد یا قوم پر نازل ہوتے ہیں تو وہ قوم لازماً پسماندگی اور ذلت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔[2]

ایک بات جو بالکل واضح ہے وہ یہ کہ پسماندگی کا تعلق فقط مالی و مادی معاملات کے دگرگوں ہونے سے نہیں ہے۔ چونکہ عین ممکن ہے کہ ایسے افراد بھی معاشرے میں موجود ہو جن کے پاس تمام مادی وسائل تو موجود ہوں لیکن اس کے باوجود انہیں پسماندہ ہی شمار کیا جاتا ہو۔ یا عین ممکن ہے کہ ایسے ممالک اور اقوام موجود ہوں اور موجود ہیں کہ جن کے پاس وسائل کی کمی نہیں لیکن اس کے باوجود ان کا شمار پسماندہ ممالک اور اقوام میں ہوتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنی معیشت و اقتصاد کو رائج اقتصادی قوانین

---

[1] الامن الغزائی فی الاسلام، احمد مصطفی العیادی، دار النفائس، عمان، اردن، طبع اول 1999، ص 196

[2] التنمیۃ والتخطیط الاقتصادی، حسین عمر، دار الشروق، جدہ، طبع ثانیہ 1978، ص 15

کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا ہے یا جو معاشی قوانین انہوں نے اپنائے ہوئے ہیں وہ متروک و منسوخ ہو چکے ہیں۔اور ابھی تک وہ اقتصادی ارتقاء کے تکنیکی اصولوں سے ابھی تک وہ بہرہ ور نہیں ہوئے ہیں۔یا اس معاشرے میں ابھی تک جہالت کا راج ہے اور وہ علمی پسماندگی کی وجہ سے معاشی بحران اور پسماندگی کا شکار ہیں۔ اقتصادی بحران جس بھی ممکنہ وجہ سے معاشرے میں آئے وہ معاشرے کو من حیث المجموع پسماندگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ جس کے واضح آثار معاشرے میں نظر آتے ہیں۔مالی و مادی پسماندگی اقوام اور معاشروں کی بدحالی کی شدت میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ [1]

افراد معاشرہ اور ممالک و اقوام کی پسماندگی کا ایک اہم سبب افراد اور اقوام کا کسی ایک سبب پیداوار کے اوپر مکمل انحصار کرنا ہے۔ مثلاً وہ ممالک جن کی زمین زرخیز ہے اور جہاں نہریں، دریا اور زیر زمین پانی آب پاشی کے لیے وافر مقدار میں موجود ہوتا ہے وہاں کے لوگوں کی اکثریت زراعت کے پیشے سے ہی وابستہ ہوتی ہے اور اس ملک کی معیشت کا زیادہ تر انحصار زراعت پر ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ ممالک جن میں کوئی اور قدرتی پیداوار مثلاً تیل موجود ہو، ان ممالک کی معیشت و اقتصاد عموماً تیل ہی کی مرہون منت ہوتی ہے۔

کسی بھی وجہ سے ایسے ممالک کے وہ شعبے متاثر ہوں جن پر ان کی معیشت کا تمام دارومدار ہوتا ہے، مثلاً بارشوں یا پانی کی عدم دستیابی سے فصلیں متاثر ہو جائیں یا کسی بھی وجہ سے مثلاً تیل کی قیمتیں گر جائیں تو دیکھنے میں یہی آتا ہے ایسے ممالک کی معیشت بیٹھ جاتی ہے اور ان کے اقتصاد پر خطرات منڈلاتے لگتے ہیں۔اور یوں کسی ایک شعبے میں مکمل دسترس رکھنے کے باوجود بھی ان ممالک کو اس طرح اقتصادی استقلال حاصل نہیں ہو پاتا اور معیشت پر دباؤ کی صورت میں یا عام حالات میں بھی کم از کم صنعت و ٹیکنالوجی کے شعبے میں دوسرے ممالک پر انحصار کرنا پڑ رہا ہوتا ہے۔ [2]

موجودہ دور میں جو کہ اقتصادی حوالے سے نہایت پیچیدہ دور ہے، اس طرح کے حالات سے بچاؤ اور مضبوط معیشت و اقتصاد کے لیے کثیر الجہتی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ بالخصوص صنعت و ٹیکنالوجی کے شعبے میں خود کفیل ہونا معاشی پسماندگی ختم کرنے اور معاشی و اقتصادی استقلال حاصل کرنے کی بنیادی شرط ہے۔ اسی طرح سے افراد معاشرہ کو معاشی استقلال دینے کے لیے ان کے پاس فقط تعلیم اور ملازمتوں کے مواقع ہی کافی نہیں بلکہ انہیں فنی مہارتوں (skills) کی فراہمی بھی اشد ضرورت ہے تا کہ وہ اپنی ملازمت و تعلیم کے بعد خود انحصاری کی پالیسی پر عمل پیرا ہو سکیں اور اپنے فن سے ملک و قوم کو بھی فائدہ دے سکیں۔

---

[1] مشکلۃ الفقر و سبل علاجہا فی ضوء الاسلام، عبد الرحمن آل سعود، ص172

[2] الحرمان و التخلف فی دیار المسلمین، نبیل صبحی، کتاب الامۃ، قطر، طبع اول 1404ھ، ص54

اس ضمن میں دوسری اہم بات ملکی وسائل اور ان کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدن کا خرچ و تقسیم ہے کہ جس میں شفافیت کا نہ ہونا پوری قوم و ملک کو پسماندگی کی راہ میں ڈال دیتا ہے۔یعنی یہ کہ ملکی وسائل و ذخائر کو کس انداز میں اور کن افراد پر خرچ کیا جائے۔یقینا انسانی وسائل سب سے اہم اور قیمتی قومی اثاثہ ہوتے ہیں۔اقتصادی ترقی میں ان وسائل کی اہمیت راس المال کی سی ہے۔

عام مشاہدے کی بات ہے کہ ترقی یافتہ ممالک میں قومی وسائل کو سب سے زیادہ انسانی ترقی و کمال کے لیے خرچ کیا جاتا ہے۔یعنی ان وسائل کو انسانی بہبود اور بہتری کے لیے استعمال میں لائے جانے کی تمام ممکنہ تدابیر اپنائی جاتی ہیں۔ان ممالک میں گزشتہ کچھ دہائیوں میں ملکی وسائل کو براہ راست عوام الناس کی خدمت و بہتری اور بہبود و ترقی کے لیے خرچ کیے جانے کی شرح نوے فیصد ہے۔[1]

پسماندہ اور غریب ممالک میں قومی و ملکی وسائل کے ساتھ ایسے نہیں ہوتا جیسا کہ ترقی یافتہ ممالک میں دیکھا گیا ہے۔بلکہ اس کے برعکس ان ممالک کے وسائل کا اکثر و بیشتر حصہ ان کی اپنی بدانتظامی، کرپشن یا نااہلی کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے اور باقی ماندہ کسی نہ کسی اقتصادی تعامل میں ترقی یافتہ ممالک میں پہنچ جاتا ہے جہاں اس سے عوام الناس کے فائدے اور بھلائی کے لیے بھرپور استفادہ کر کے ملکی اور افرادی غربت و پسماندگی کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔جب کہ یہ وسائل کن ممالک کی حقیقی پیداوار ہوتے ہیں ان میں بے روزگاری اور تنگدستی خیمہ زن ہے۔یوں روزگار کے مواقع یا تو اصلا پیدا ہی نہیں ہوتے یا پھر وہ غیر معیاری ہوتے ہیں۔یوں قومی تعمیر و ترقی میں استعمال ہونے کی بجائے ان وسائل، توانائیوں اور افرادی قوت کا استحصال کر دیا جاتا ہے۔[2]

(iii)غربت کی شرح میں اضافہ

فقر و افلاس کے اثرات اگر فقراء پر نہیں پڑیں گے تو بھلا اور کون سا طبقہ اس سے متاثر ہو گا۔حقیقت امر یہ ہے کہ غربت سے متعلق اُمور کی وجہ سے غریب کی گزر بسر موجودہ دنیا میں نہایت مشکل ہو ہے۔اقوام متحدہ کی 2007 میں جاری ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کے غریب افراد جو کہ عالمی آبادی کا چالیس فیصد حصہ ہیں، عالمی آمدنی میں ان کا حصہ صرف پانچ فیصد ہے۔جب کہ دنیا کے وہ امیر افراد جو کہ عالمی آبادی کا صرف بیس فیصد ہیں، عالمی آمدنی کے تین چوتھائی حصے پر قابض ہیں۔[3]

---

[1] تحلیل ظاہرۃ الفقر فی اطار الفکر الاقتصادی الاسلامی من المفاہیم الی القیاسات، دار الفکر للنشر والتوزیع، اردن، طبع 2004، ص5

[2] مشکل البطالۃ وعلاجہا: دراسۃ بین الفقہ والقانون، جمال حسن سراحنہ، دمشق، سوریہ، طبع 2001، ص99

[3] Human Development Report, United Nations Development programme, Nov 27 2007, p.25

مالی مسائل اور مشکلات کے بڑھنے کی وجہ سے اور دوسری طرف ملازمتوں کے مواقع آبادی کے تناسب سے انتہائی کم ہونے کی بنا پر فقراء کی تعداد کا تناسب بڑھتا جارہا ہے۔ اقوام متحدہ نے اپنی ایک طویل رپورٹ میں موجودہ زمانے کے فقراء کی تعداد کا گزشتہ ادوار کے فقراء کی تعداد کے ساتھ تناسب کا ذکر کیا ہے۔ طویل مدت کی تحقیق پر مشتمل اس رپورٹ کے مطابق تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ 1980 میں امیر اور غریب ممالک کے درمیان فرق کا تناسب 3=1 تھا۔ یہ فرق شروع رفتہ رفتہ بڑھنا شروع ہوا اور 1960 کی دہائی سے اس فرق میں بہت تیزی سے اضافہ ہوا۔ اور اب یہ فرق 74=1 تک جا پہنچا ہے (یعنی امیر ملک کے ایک شہری کی دولت غریب ملک کے 74 شہریوں کے برابر ہے)۔[1]

مذکورہ اعداد کے مطابق ایک امیر کے پاس جتنا کھانا، پینا، غذائی اجناس، مال و پیسہ اور وسائل زندگی موجود ہیں، چوہتر (74) غرباء و فقراء مل کر اس جتنی مال و دولت یا آسائشات کے مالک ہیں۔ یعنی ایک امیر آدمی روزانہ جس قدر کھاتا ہے، 74 چوہتر غرباء مل کر اس جتنی غذا پر گزارا کر رہے ہیں۔

غربت و پسماندگی نے جس بیماری کو سب سے زیادہ معاشرے میں پھیلایا ہے وہ بے روزگاری ہے۔ معاشرے میں ایسے افراد کی کثیر تعداد بآسانی مل جاتی ہے جو ہنر مند اور باصلاحیت ہیں اور رزق کمانے کی تمام استطاعت اور صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ مگر وہ اور ان کے اہل خانہ صرف اس لیے غریب ہیں کہ سرمایہ دار نے لالچ کی بنیاد پر محدود افراد کو اجرت پر لے رکھا ہے۔ ان کی بے روزگاری کی ممکنہ وجہ یہ ہے کہ سماج میں بے روزگاروں کی تعداد زیادہ ہو جانے کی بنا پر سے مزدور بیچارہ تھوڑی اجرت کے عوض کام پر تیار ہو جاتا ہے۔ ورلڈ بینک کی 2011 کی رپورٹ کے مطابق بے روزگاری کے اثرات سے ترقی پذیر ممالک سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک متاثر ہیں۔[2]

---

[1] سرمایہ دارانہ نظام کے نتائج، شیخ عثمان صفدر، سہ ماہی البیان، خصوصی اشاعت جدید معیشت تجارت مروجہ اسلامی بینکاری میزان شریعت میں، سلسلہ نمبر 6،7 جنوری تا جون 2013، المدینہ ریسرچ سنٹر، کراچی، ص 22

[2] World Bank, World Development Indicator, March 2^{nd},2011

فصل چہارم

فقر کے افکار انسانی پر اثرات

فقر کے افکار انسانی پر اثرات

غربت کے اثرات بد فقط عقیدہ وایمان، عائلی نظام، معاشرتی وسماجی مسائل، انسانی صحت اور اقتصادی معاملات تک محدود نہیں بلکہ غربت ایک ایسا عامل ہے جو انسانی فکر وشعور اور ذہن کو بھی بری طرح متاثر کرتا ہے۔مالی حالات کا آسودہ خاطر نہ ہونا دراصل ایسی پریشانی ہے جو انسان کو کسی بھی مسئلے پر ذہنی طور پر مکمل مرتکز نہیں ہونے دیتی۔اس لیے کہ انسان جب تک ذہنی و دماغی دباؤ سے آزاد نہیں ہوتا اس وقت تک وہ کچھ اور کرنے اور کسی بھی کام کو مکمل دلجمعی اور توجہ سے کرنے سے قاصر ہوتا ہے۔

علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

"فالفقير الذى لا يجد ضرورات الحياة و حاجاتها لنفسه و اهله و ولده،كيف يستطيع ان يفكر تفكيرا دقيقا ولا سيما اذا كان هناک بجواره من تغض داره بالخيرات وتموج خزائنه بالذهب"[1]

ترجمہ: جن غریبوں کو اپنے لیے اور اپنے گھر والوں کے لیے ضرورت کی چیزیں میسر نہیں آتیں ان کے لیے کسی بھی مسئلے پر یکسو ہو کر سوچنا در حقیقت ممکن نہیں ہوتا۔ خصوصا ایسے وقت میں جب ان کے پڑوس میں ایسے افراد آباد ہوں جن کے پاس سبھی تعیشات موجود ہوں اور ان کے خزانے مال واموال سے لبریز ہوں۔

تہی دست انسان کی تمام قوتیں استعمال کے وقت بجھی بجھی سی رہتی ہیں۔اس کے دل کی تنگی اس کو اس قدر پریشان و سرگرداں کر دیتی ہے کہ زمین و آسمان کی وسعتیں بھی اس کو خود پہ تنگ پڑتی نظر آتی ہیں،اور وہ ہر طرف سے اپنے اوپر رستوں کو بند ہوتا ہوا دیکھتا ہے۔اللہ کی عطا کی ہوئی مکمل لیاقت وصلاحیت ہونے کے باوجود اس کی قوت فیصلہ بری طرح متاثر ہو جاتی ہے۔اور معاملات زندگی میں کسی بھی مرحلے پر اس سے یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ کسی کام کو کر گزرنا اچھا ہے یہ نہ کرنا۔اسی لیے امام شافعی کہا کرتے تھے کہ:

"لا تشاور من ليس فى بيته دقيق، فانه موله العقل"[2]

---

[1] مشکلۃ الفقر وکیف عالجہا الاسلام، یوسگ قرضاوی، ص16

[2] موسوعۃ الاخلاق والزھد والرقائق،(قصص تربویۃ من حیاۃ الانبیاء والصحابۃ والتابعین والصالحین)، یاسر عبدالرحمن، موسسۃ اقرا النشر والتوزیع والترجمۃ، قاہر، طبع اول،1428ھ،2/287

ترجمہ: جس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہو اس سے مشورہ نہ لو، اس لیے کہ اس کے خیالات پراگندہ ہوتے ہیں۔

یعنی ایسے آدمی کے گویا عقل و حواس منتشر ہوتے ہیں، چونکہ وہ ہر طرف سے غم و ہم اور پریشانیوں میں گھرا ہوتا ہے، نتیجۃً اس میں نفسانی اور عقلی قوتیں بری طرح متاثر ہوتی ہیں یا اصلاً زائل ہی ہو چکی ہوتی ہیں۔ اردو کی ایک کہاوت ہے کہ کسی بھوکے سے پوچھا گیا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں تو اس نے جواب دیا چار روٹیاں، چونکہ اس کی ذہنی اور نفسانی قوتوں میں بھوک غالب تھی اس لیے اس کا ذہن صرف اسی چیز کے گرد مرتکز تھا۔

کسری بادشاہ کسی بھوکے و مفلس شخص سے مشورہ طلب نہیں کرتا تھا بلکہ اگر کسی نادار شخص کی رائے مطلوب بھی ہوتی تو پہلے اس کو عطا کیا جاتا اور پھر مشاورت کی جاتی۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"و کان کسری اذا اراد ان یستشیرا انسانا بعث الیه بنفقة سنة ثم یستشیره"[1]

ترجمہ: کسری جب کسی انسان سے مشورہ کرنے کا ارادہ کرتا تو پہلے اس کی طرف سال بھر کے اخراجات بھجواتا، پھر اس سے کسی بھی مسئلے میں رائے طلب کرتا۔

جب وہ سال بھر کے فکر معاش سے آزاد ہو گا تو، کسری کا خیال تھا کہ، اسی صورت میں اس کا دل و دماغ کسی اور جانب مکمل دلجمعی اور گہرائی سے غور و خوض کے قابل ہو گا لہذا پہلے اس کے دماغ سے فکر معاش کو نکالو تا کہ وہ کچھ کرنے سوچنے کے قابل ہو سکے اور اس کی ذہنی قوتیں مکمل توجہ اور التفات سے کسی بھی مسئلے کو سوچ سکیں گی۔

شریعت اسلامی نے قاضی، مفتی، حَکَم اور ان جیسے دیگر افراد کو ان تمام حالتوں میں کام کرنے سے روکا ہے کہ جو ان کی ذہنی قواہ اور صلاحیتوں پر منفی اثر انداز ہوتی ہیں۔ ذہنی آسودگی اور اطمینان قلبی کی کیفیت نہ ہونے کی صورت میں اسلام میں قاضی کو قضاء سے، مفتی کو افتاء سے اور حَکَم کو فیصلہ صادر کرنے سے منع وارد ہوئی ہے تا کہ اس حالت میں کوئی ایسا فتوی یا فیصلہ نہ کر بیٹھیں جو شریعت اسلامی یا انصاف کے تقاضوں کے خلاف ہو۔ بخاری شریف میں ہے کہ:

---

[1] محاضرات الادباء و محاورات الشعراء والبلغاء، راغب اصفہانی، منشورات دار مکتبۃ الحیات، بیروت، 1/45

"کتب ابو بکرہ الی ابنه وکان بسجستان بان لا تقض بین اثنین و انت غضبان،فانی سمعت النبی صلی اللہ علیه وآله وسلم یقول: ((لا یقضیین حکم بین اثنین و ھو غضبان))"[1]

ترجمہ: ابو بکرہ نے اپنے بیٹے کو، جو کہ سجستان میں رہتا تھا، ایک خط میں لکھا کہ کبھی غصے کی حالت میں دو لوگوں کے درمیان فیصلہ نہ کرنا، کیونکہ رحمۃ للعالمین کا ارشاد ہے: حَکَم دو لوگوں کے درمیان غصے کی حالت میں فیصلہ نہ کریں۔

نہ صرف غصہ بلکہ فقہائے اسلام نے تو غصے پر قیاس کرتے ہوئے اس جیسی دیگر تمام حالتوں پر، جو انسانی فکر و شعور اور قلب و دماغ کو منفی اثر انداز کرتی ہیں، یہی حکم عائد کیا ہے۔ علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

"و قاس الفقهاء علی الغضب شدة الجوع و شدة العطش و غیرهما من انفعالات المؤثرة"[2]

ترجمہ: فقہاء نے بھوک، پیاس اور اسی قسم کے دیگر زود اثر عوامل کو غصے پر قیاس کر کے ان پر بھی مذکورہ حکم ہی لاگو کیا ہے۔

بلا شک و شبہ انسان کی معاشی حیثیت و مالی کیفیت اس کی دماغی صلاحیتوں اور افکار پر حاوی رہتی ہے۔ ماہرین کے مطابق غربت دماغی و ذہنی نشو و نما پر بری طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ محققین کا یہ ماننا ہے کہ غربت کے تمام مظاہر اور اشکال انسانی صحت کے طبعی اور نفسیاتی پہلوؤں پر منفی اثر انداز ہوتے ہیں۔ بالخصوص بچوں کی دماغی و ذہنی صلاحیتوں پر والدین کے معاشی حالات نہایت گہرے اور دیر پا اثرات کے حامل ہوتے ہیں بعض اوقات تو ان اثرات سے ساری زندگی نکلنا ممکن نہیں ہوتا اگرچہ معاشی حالات بدل ہی کیوں نہ جائیں۔

غربت اور غربت زدہ ماحول کس طرح بچوں کی نفسیات، فکر و شعور اور ذہن پر اثر انداز ہوتے ہیں اس مقصد کے لیے کولمبیا یونیورسٹی اور لاس اینجلس کے چلڈرن ہسپتال کے ماہرین کی مشترکہ تحقیقی ٹیم نے ایک تجرباتی رپورٹ جاری ہے۔ تفتیش کاروں نے نوجوانوں کے دماغ پر سماجی و اقتصادی امور کے اثرات جاننے کے لیے ایک ہزار ننانوے صحت مند بچوں اور نوجوانوں کے

---

[1] صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل بخاری، کتاب الاحکام، باب ہل یقضی القاضی اویفتی وہو غضبان، حدیث رقم 7158، ص 65/9

[2] مشکلۃ الفقر وکیف عالجہا الاسلام، یوسف قرضاوی، ص 16

دماغ کو اسکینر کی مدد سے معائنہ کیا۔اس سے قبل انہوں نے ان بچوں اور نوجوانوں کے پس منظر،والدین کی تعلیم اور آمدنی کے حوالے سے معلومات جمع کیں۔اس کے علاوہ اس مقصد کے لیے تین سے بیس برس کے عمر کے اشخاص سے یادداشت اور منصوبہ سازی کی صلاحیتوں کے حوالے سے ایک ٹیسٹ بھی لیا گیا۔یہ اس نوعیت کی منفرد تحقیق ہے کہ جس کے مطابق والدین کے اقتصادی حالات بالخصوص ان کی غربت یا دولت بچوں کے افکار اور دماغی ساخت پر بڑی حد تک اثر انداز ہوتے ہیں۔رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

> "Income was logarithmically associated with brain surface area."[1]

ترجمہ: آمدنی کا براہ راست تعلق دماغی سطح کے طول و عرض سے ہوتا ہے۔

غریب شخص کی زندگی میں اس کی آمدن کے حوالے سے پڑنے والا معمولی سا فرق بھی اس پر مثبت یا منفی انداز میں بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔جب کہ امراء میں اس طرح کا معمولی فرق ان کی ذہنی سطح کو کوئی خاص متاثر نہیں کرتا، چناچہ آگے چل کے رپورٹ کہتی ہے کہ:

> "Among children from lower income families, small differences in income were associated with relatively large differences in surface area, whereas, among children from higher income families, similar income increments were associated with smaller differences in surface area."[2]

ترجمہ: کم آمدنی والے خاندان کے بچوں میں آمدن میں ہونے والے معمولی فرق کی وجہ سے دماغ کی سطح کے اوپر نسبتاً بڑے اثرات دیکھنے میں نظر آئے۔جب کہ وہ بچے جن کا تعلق زیادہ آمدنی والے گھرانوں سے ہوتا ہے ان میں آمدن کا فرق ان کے دماغ کی سطح پر بہت معمولی اثر ڈالتا ہے۔

یہ دماغی اثرات افراد کو سماجی اور اقتصادی طور پر تو متاثر کرتے ہیں ہی لیکن ان کا سب سے بڑا مسئلہ انسانی اعصاب کو متاثر کرنا ہے۔لہذا رپورٹ میں اس حوالے سے واضح لکھا گیا ہے کہ:

> "These relationships were most prominent in regions supporting language, reading, executive functions and spatial skills; surface

---

[1] Family income, Parental education, and brain structure in children and adolescents, published online 30 March 2015

[2] Ibid

area mediated socioeconomic differences in certain neurocognitive abilities."[1]

ترجمہ: ان تمام نتائج کا انحصار واضح طور پر ان علاقوں سے تھا جہاں زبان، پڑھنے، علاقائی مہارتوں اور روز مرہ کے افعال کو اہمیت دی جاتی ہے۔ ان نتائج میں سطح دماغ پر پڑنے والے سماجی واقتصادی فرق کے علاوہ اعصابی فرق کو بھی واضح دیکھا گیا ہے۔

اس حوالے سے کہ آیا امیر والدین کے بچے دماغی ترقی میں بہتر نتائج پیش کرتے ہیں یا پھر غرباء کے بچے یا دونوں ہی کی دماغی وذہنی ترقی مساوی ہوتی ہے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

"These data imply that income relates most strongly to brain structure among the most disadvantaged children."[2]

ترجمہ: ان اعداد وشمار سے پتا چلتا ہے کہ پسماندہ بچوں میں آمدنی کا گہرا تعلق دماغی ترقی سے ہوتا ہے۔

یعنی اس تحقیق کے مطابق امیر والدین کے بچے دماغی ترقی میں بہتر نتائج پیش کرتے ہیں۔ وائس آف امریکا کی اردو ویب سائٹ کے مطابق اس رپورٹ کو مترتب کرنے والے ایک محقق الزبیتھ سوویل بھی ہیں جن کا یہ کہنا ہے کہ:

"ایک ایسے گھر میں پرورش پانا جہاں ضروریات زندگی کی قلت کا اندیشہ نہیں ہے بچوں کو دباؤ سے آزاد کرتا ہے جس سے دماغ کی ترقی کو فروغ دینے کا امکان ہوتا ہے۔"[3]

Poverty Impedes Cognitive Function کے نام سے کی جانے والی ریسرچ میں غرباء اور امراء کے طبقوں میں موجود ذہنی فرق کو مزید صراحت سے اجاگر کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق غریب طبقہ اکثر (غربت سمیت) کسی بھی چیز کا کم موثر انداز میں سامنا کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ مستقل غربت ہے۔ [4]

مفلسی کے انسانی ذہانت پر مرتب ہونے والے اثرات کی اس تحقیق کو معتبر امریکی درس گاہ ہارورڈ یونیورسٹی اور کینیڈا کی برٹش کولمبیا یونیورسٹی کے محققین نے حتمی شکل دی، ریسرچ کے لیے 400 افراد کے انٹرویوز پر مشتمل ڈیٹا مرتب کیا گیا جن کی سالانہ آمدنی 20 ہزار ڈالر سے لے کر 70 ہزار ڈالر تک تھی۔ رپورٹ دو مقاصد اور دو ہی مرحلوں پر مشتمل تھی۔ پہلے مرحلے میں

---

[1] Family income, Parental education, and brain structure in children and adolescents, published online 30 March 2015

[2] Ibid

[3] http://www.urduvoa.com/a/parents-wealth-impact-on-children-abilities/2707247.html

[4] Poverty Impedes Cognitive Function, published online, Aug 30, 2013

شرکاء سے ان کی آمدنیوں اور معاش سے متعلق سوال کیے گئے۔ اس مرحلے کے نتیجے کے طور پر رپورٹ کہتی ہے کہ پہلے مرحلے میں ہم اقتصاد کے حوالے سے مختلف خیالات و سوالات شرکاء پر القا کیے اور دیکھا کہ ان سوالات نے غرباء کی شناخت و ادراک کی کارکردگی کو کم کر دیا جب کہ متمول گھرانوں سے تعلق رکھنے والے افراد پر ایسا کوئی اثر نہیں دیکھا گیا۔[1]

دوسرا مرحلہ عملی اقدام کے حوالے سے تھا۔ اس مرحلے میں ایک ہی شخص سے ایک ہی چیز کے بارے میں البتہ اس شخص کی دو مختلف معاشی حالتوں میں سوالات کیے گئے۔ اور دیکھا گیا کہ شرکاء کی بہتر معاشی حالت میں ان کی کارکردگی بہت بہتر رہی جب کہ معاشی تنگی کی حالت میں اسی چیز کے حوالے سے ان کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی۔ دوسرے مرحلے کے حوالے سے رپورٹ کہتی ہے کہ دوسرے مرحلے میں ہم نے پودے لگانے والے آلات کے حوالے سے کسانوں کی شناخت و ادراک کی صلاحیتوں کو آزمایا۔ ہم نے دیکھا کہ کاشت سے پہلے کہ جب کسان غریب تھا ،اس میں اشیاء کا ادراک کرنے کی صلاحیت اور کارکردگی، کاشت کے بعد کی نسبت کہ جب وہ امیر ہو چکا تھا، ماند تھی۔[2]

یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ ادراک و کارکردگی کا یہ فرق مختلف اوقات، غذائی مقدار، ذہنی دباؤ یا کام کی کمی و زیادتی کی وجہ سے تھا بلکہ رپورٹ میں اس طرح کے تمام امکانات کو رد کر کے کہا گیا ہے کہ ظاہر یہ ہوتا ہے کہ غربت بذات خود ادراک و شناخت کی صلاحیت کو کم کرتی ہے۔ ہمارے خیال میں غربت سے متعلق امور انسان کی دماغی صلاحیتوں کو بہت زیادہ استعمال کرتے ہیں اور دوسرے کاموں کے لیے اس کے پاس کم صلاحیتیں ہی وافر بچتی ہیں۔[3]

غربت اور تنگدستی کی وجہ سے انسانی ذہن کا کام کئی گنا بڑھ جاتا ہے اور وہ اپنی غربت کے سبب کسی بھی چیز میں پورا ارتکاز کرنے میں دشواری محسوس کرتا ہے، کیونکہ اسے محنت و مزدوری کے علاوہ ہر وقت اپنے اندر کی بے چینی اور تکلیف کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور جب پہلے سے ہی دماغ پر لاتعداد پریشانیاں اور بے چینیاں ہوں تو ذہن کچھ بہتر سوچنے اور کرنے کی بجائے انہی پر مرکوز رہتا ہے۔

---

[1] Poverty Impedes Cognitive Function, published online, Aug 30, 2013

[2] Poverty Impedes Cognitive Function, published online, Aug 30, 2013

[3] Ibid

باب چہارم

فقر وافلاس کا حل اسلام کی روشنی میں

فصل اول:	ارتکاز دولت کی ممانعت اور تقسیم دولت کا اصول
فصل دوم:	غریب پروری کی تلقین اور فقر کے خاتمے کی ترغیب و تلقین
فصل سوم:	زکاۃ وخمس وعشر اور کا نظامِ صدقہ وخیرات
فصل چہارم:	ذاتی ملکیت کی فراہمی اور حدود و قیود
فصل پنجم:	اسلامی بیت المال اور امداد باہمی کا اصول
فصل ششم:	اسلام کا قانون میراث

آج یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ احیائے دین و مذہب کی سوچ اور اُس کی نئی تشکیلی پالیسی کے نتیجے میں مسلم دنیا میں ایسی تحریکوں نے جنم لیا جنہوں نے "اسلام بطور مکمل ضابطہ حیات" کا نعرہ لگایا اور اس مقصد کے لیے جدوجہد شروع کی کہ پورے سماج اور اس میں پائی جانے والی معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں بشمول معاشی و اقتصادی پہلو کو اسلامی ضابطہ حیات کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ اسلامی سوچ اور تعلیمات کو نئی شکل میں پیش کرنے اور ان کو معاشرے میں لاگو کرنے کے حوالے سے علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کی اسلامی افکار اور تعلیمات کی تشکیلِ نو کا مطالبہ بھی اسی سوچ کا غماض ہے جس نے انیسویں اور بیسویں صدی میں بالخصوص سر اٹھایا اور پھر اس کو علمی حلقوں میں بھرپور پذیرائی حاصل ہوئی۔

چونکہ عالمی غربت و افلاس کا ایک بہت بڑا حصہ اسلامی دنیا سے متعلق ہے اور اسلامی ممالک میں فقر و افلاس سے متاثرہ افراد کی ایک بہت بڑی بلکہ کثیر تعداد پائی جاتی ہے، اس کے ہمراہ یہ بھی کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے اسلامی سکالرز اور فلاسفرز نے اسلامی تعلیمات بالخصوص سماجی و معاشی افکار کی تشکیلِ جدید کے ذریعے اسلامی تعلیمات کو نئے سرے سے اور زیادہ مؤثر انداز میں پیش کرنے کا آغاز کر دیا تھا، لہٰذا اس دوران میں اسلامی معاشیات اور فنانس کی ابھرتی ہوئی صورت حال سے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ وہ غربت، محرومیت اور مالی عدم مساوات سمیت دیگر اہم معاشی مسائل سے لڑنے، ان کی علل و وجوہات کو سمجھنے اور ان کا حل پیش کرنے میں دیگر معاشی نظاموں کی طرح ایک بنیادی اور اہم کردار ادا کرے گی۔[1]

صرف یہی نہیں بلکہ ابتدائے اسلام سے ہی اسلامی مکتبہ فکر نے غربت و افلاس کے مسئلے کو نہایت سنجیدگی سے دیکھا ہے، یہاں تک کہ رسول اکرمؐ سے منقول احادیث میں اس کو کفر کے ہمراہ رکھ کر اس سے پناہ مانگی گئی۔ غریب کمزور اور محروم افراد قرآن مجید اور اسلامی تعلیمات کا اہم اور نمایاں موضوع رہے ہیں۔ غربت کے چیلنج سے نبٹنے کے لیے متفقہ، جامع، مضبوط اور ٹھوس قومی نقطہ نظر اور ایجنڈے کی ضرورت ہے۔ جہاں معیشت اور سماج میں موجود متحرک اور فعال تمام اداروں اور افراد کو اپنی اپنی حیثیت میں کردار ادا کرنا ہو گا تب ہی یہ ممکن ہو سکے گا کہ غربت و افلاس کے مسئلے سے مضبوط حکمت عملی کے ذریعے نبرد آزما ہوا جا سکے۔

اسلام کا اقتصاد سے دو طرح کا تعلق اور ربط ہے، بلاواسطہ اور بالواسطہ۔ اسلامی تعلیمات کا اقتصاد سے بلاواسطہ رشتہ اس اعتبار سے ہے کہ اسلام ملکیت، مبادلات، ٹیکس، حق ملکیت و تحجیر، میراث، ہبہ، وقف، صدقات، مالی جرمانے یا کفارہ جات وغیرہ جیسے مسائل میں براہ راست اقتصادی قوانین رکھتا ہے، اسلام میں کتاب البیع، کتاب الاجارہ، کتاب الوکالۃ، کتاب الرہن،

---

[1] Global Islamic Finance Report 2012, pp:173

مشارکت، مضاربت، مرابحۃ، کتاب الارث، کتاب الھبہ اور کتاب الوقف وغیرہ موجود ہیں، جن کا براہ راست تعلق اقتصادیات اور معاشیات سے ہے۔

جب کہ دوسری طرف اسلام کا اقتصاد سے رابطہ اخلاقی رابطہ ہے۔ اسلام نے لوگوں سے امانت داری، عفت، عدالت، احسان، ایثار اور انفاق کی تاکید کی ہے جب کہ ساتھ ہی چوری، خیانت کاری، دغہ بازی، ملاوٹ اور رشوت وغیرہ سے منع کیا ہے۔ یہ سب کے سب ثروت کے سلسلے ہیں یا ثروت سے ان کا تعلق ہے، لہذا جب تک اقتصادی مسائل کے حدود واضح نہ ہوں گے تب تک عدالت، امانت، عفت اور احسان کی حدیں واضح نہ ہوں گی اور اسی طرح چوری، خیانت کاری اور رشوت وغیرہ کا دائرہ کار بھی واضح نہ ہو گا۔[1]

لہذا کسی بھی مسئلے کہ طرح فقر و غربت کی وجوہات، آثار اور خاتمے کے اصول پر اسلامی نقطہ نظر کی بنیاد بھی اس کا اقتصاد کے ساتھ یہی دو طرح کا پایا جانے والا تعلق ہے۔

اسلامی اقتصادی و معاشی نظام کی خصوصیات

اسلام کا متعارف کردہ معاشی نظام معیشت کے اوپر تمام لوگوں کے مساوی حقوق اور معاشی عدل و انصاف پر مبنی ہے۔ کسی خاص طبقے یا گروہ کے ساتھ خصوصی رعایت اور امتیازی سلوک کا روادار نہیں ہے۔ وہ پوری انسانیت اور ساری انسانی برادری کے حقوق و مفادات کے تحفظ کا حامن ہے۔ ظلم و استبداد یا خصوصی مراعات کے چور دروازے کی وہاں کوئی گنجائش نہیں، اس کے ملحوظِ خاطر یہ امر ہے کہ افراد معاشرہ کے حقوق کے تحفظ کے ساتھ ساتھ ان میں باہمی پیار و محبت اور الفت و یگانگت قائم رہے اور پورا معاشرہ خوش حالی اور فارغ البالی، امن و سلامتی اور بہی خواہی و ہمدردی کا خوش نما گہوارا اور طبقاتی جنگ کی بجائے عالم گیر اخوت کا دلکش نظارہ بن کر، حیات انسانی کے مقصد وحید یعنی اللہ اور اس کے بندوں کے درمیانی رشتہ کو مضبوط کرنے اور اخلاق کریمانہ کی رفعتوں تک پہنچانے کی خدمت انجام دے کر تا کہ حیاتِ دنیوی کی فوز و فلاح، حیات اخروی کی سعادت و کامرانی کا ذریعہ بنے۔

معیشت کے اوپر تمام افراد کے مساوی حقوق کے قائل اسلامی معاشی نظام کی چند نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

1۔ وہ تمام وسائل جن پر انسان کا معاشی انحصار ہے سب اللہ تعالیٰ کی ملکیت اور اس کی تخلیق ہیں۔ قرآن پاک میں ارشادِ ربانی ہے:

---

[1] اسلامی اقتصاد کا ایک جائزہ، مرتضی مطہری (مترجم: سید مسعود اختر رضوی)، دارالثقافہ الاسلامیہ، پاکستان، طبع اول 1420ھ، ص 7،8

﴿لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾[1]

ترجمہ: جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے سب اللہ کے لئے ہے۔

2۔ خالق کائنات، رازقِ کائنات بھی وہی ہے جو تمام مخلوقات کو رزق دیتا ہے، قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلاَّ عَلَی اللهِ رِزْقُهَا﴾[2]

ترجمہ: اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا (جاندار) نہیں ہے مگر (یہ کہ) اس کا رزق اللہ (کے ذمۂ کرم) پر ہے۔

3۔ اسلام کا معاشی نظام انفرادی حق ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ اس میں کچھ حدود و قیود لگائی گئی ہیں لیکن انسان کو اس کے بنیادی حق سے محروم نہیں کیا گیا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُواْ أَنفِقُواْ مِن طَیِّبَاتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَکُم مِّنَ الْأَرْضِ﴾[3]

ترجمہ: اے ایمان والو! ان پاکیزہ کمائیوں میں سے اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے نکالا ہے (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا کرو۔

4۔ اسلام حق معیشت میں مساوات کا قائل ہے۔ اسباب معیشت میں ہر انسان کو فائدہ اٹھانے کا مساوی حق فراہم کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ مَکَّنَّاکُمْ فِی الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیهَا مَعَایِشَ قَلِیلاً مَّا تَشْکُرُونَ﴾[4]

ترجمہ: اور بیشک ہم نے تم کو زمین میں تمکّن و تصرّف عطا کیا اور ہم نے اس میں تمہارے لئے اسبابِ معیشت پیدا کئے، تم بہت ہی کم شکر بجالاتے ہو۔

5۔ جس طرح اسلام حقِ معیشت میں مساوات کا داعی ہے اور ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے فراہم کردہ اسبابِ معشیت سے فائدہ اٹھانے کا حق دیتا ہے۔ اسی طرح حالات کو سامنے رکھتے ہوئے درجاتِ معیشت میں تفاوت کی نشاندہی کرتا ہے۔ یعنی اسلام میں

---

[1] سورۃالبقرۃ،2 / 284

[2] سورۃھود،11 / 6

[3] سورۃالبقرۃ:2 / 267

[4] سورۃالاعراف:7 / 10

معاشی مساوات کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ذی روح کو دنیا میں رہنے کا حق حاصل ہو، محنت اور ترقی کے راستے سب کے لئے ہوں اور وہ معیشت میں اپنا کردار ادا کر سکے۔ اس کا فیصلہ اس کی محنت، قابلیت اور کام کرنے کی صلاحیت پر رکھا گیا ہے جتنا وہ کام کرے گا۔ اسی حساب سے معیشت میں اس کا درجہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ﴾[1]

ترجمہ: اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق (کے درجات) میں فضیلت دی ہے (تاکہ وہ تمہیں حکمِ انفاق کے ذریعے آزمائے)۔

اس کے پس منظر میں اس آیت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہو گا۔ جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلاَّ مَا سَعٰى﴾[2]

ترجمہ: اور یہ کہ انسان کو (عدل میں) وہی کچھ ملے گا جس کی اُس نے کوشش کی ہو گی۔

مذکورہ بالا اساسی تصورات کے ساتھ اسلام نے معاشیات کے میدان میں اخلاقی اقدار کی بھی نشاندہی کی ہے جن میں تقویٰ، احسان، ایثار، عدل، اخوت، تعاون، توکل، قناعت اور مساوات اہم ہیں۔

غربت نے جس طرح پوری دنیا کے ممالک، خطوں اور اقوام کو اپنے اثرات بد سے متاثر کیا ہے اس سے یہ بات یقینی ہے کہ چونکہ یہ صرف کسی ایک سبب یا وجہ سے نہیں پھیل رہی بلکہ اس کے گوناں گوں اور چندیں اسباب ہیں چنانچہ غربت کے خلاف جنگ کو بہت سے محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔ اس ضمن میں افراد کی کاروباری و معاشی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی، ذاتی منافع کی حدود کا تعین، بازار کی میکانیت، آمدنی اور ذرائع کی تقسیم نیز مالیاتی اور فلاحی پالیسیوں کے کردار کو معین و مشخص کرنا ہو گا تاکہ غربت کے اسباب و علل کو روک کر اس کے سدباب کی راہ ہموار کی جاسکے۔[3]

خالق کائنات نے فطرتِ انسان میں کھانے پینے کے تقاضے رکھ کر اسے یوں ہی اس کے اپنے حال پر نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس نے اپنے لطف و کرم کی بنا پر اس کے رزق کا بھی ذمہ خود لیا ہے۔ پھر اس رزق کی فراہمی کے لئے اس نے کمال حکمت اور عجیب و غریب انداز میں زمین میں ایسی صلاحیت، برکت، وسائل اور خزانے رکھ دیئے ہیں کہ قیامت تک بھی ختم نہیں ہوں گے۔ رزاق

---

[1] سورۃ النحل: 16 / 71

[2] سورۃ النجم: 53 / 39

[3] Islam, Poverty and Income Distribution, Ziauddin Ahmad , The Islamic Foundation, 1991, p: 27

مطلق نے تو سارا نظام کائنات ہی انسان کی اس خدمت پر مامور فرما رکھا ہے۔ البتہ ان لاتعداد وسائلِ معاش یا وسائلِ رزق کی منصفانہ تقسیم کا کام خود حضرت انسان کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

لہذا تاریخ انسانی کے گذشتہ کسی بھی دور میں یا اس وقت روئے زمین پر اگر کوئی آدمی رزق اور بنیادی ضروریات سے محروم ہے تو کسی مقام پر خداداد وسائلِ معیشت و رزق کی تقسیم کے نظام میں انصاف نہیں ہو رہا۔ عام غربت افلاس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں مگر ان میں سب سے بڑا سبب وسائل دولت اور اسباب معیشت کے تقسیم کنندگان وہ ظالم، لٹیرے، قارون صفت، حریص اور غاصب ہیں جو محروم المعیشت اور کمزور لوگوں کا حق مارے بیٹھے ہیں۔ یہی حرص ولالچ، ناانصافی اور استحصال معیشت کے میدان میں "ام الخبائث" یا "ام الامراض" ہے جو بیشمار خرابیوں کی بنیاد اور جڑ ہے۔ آج سے کوئی چودہ سو سال قبل درس گاہ نبوی اور صحبت نبوی کے تعلیم یافتہ و فیض یافتہ حیدر کرار سیدنا علی المرتضیٰ رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے اسی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"بلاشبہ ذاتِ کبریاء نے اہل ثروت پر ان کے مالوں میں اپنے معاشرے کے فقراء و مساکین کی معاشی حاجات کو بدرجہ کفایت پورا کرنا فرض قرار دیا ہے۔ چنانچہ یہ فقیر لوگ اگر بھوکے ننگے یا معاشی تنگی میں مبتلا ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ثروت نے ان کے حق یا ان کے حصے کے وسائل رزق کو روک لیا ہے اور پروردگارِ عالم نے اپنے ذمہ یہ امر لازم ٹھہرا رکھا ہے کہ بروز قیامت وہ ان اہل ثروت کا محاسبہ فرمائے گا اور فقراء کی اس حق تلفی پر انہیں عذاب دے گا"[1]

پس ایسا ہرگز نہیں ہے کہ آج زمین پر جتنے وسائل اور ان کی پیداوار موجود ہے آبادی اس سے زیادہ ہوگئی ہے اور وسائل کم پڑ گئے ہیں، کیونکہ اللہ کریم نے جس انسان کو پیدا کیا ہے اس کے رزق کا بھی وافر مقدار میں سامان کیا ہے۔ مگر آج انسان کی خواہشات اور ہوس اتنی بڑھ چکی ہے کہ کھانے کو چاہے وہ ایک کلوگرام بھی نہ کھا سکے مگر اپنے پاس ایک من دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ آنکھوں کی ہوس کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ اس ہوس کو حدیث نبوی کے مطابق قبر کی مٹی ہی پورا کرے گی۔

اسلام کی نظر میں غربت کن اسباب و عوامل سے سے پیدا ہوتی ہے اور کس انداز میں معاشرے کے افراد اس کا شکار ہوتے ہیں، نیز کون کون سے سیاسی، معاشرتی، معاشی اور انفرادی و اجتماعی اسباب ہیں جو غربت کی پیش خیمہ بنتے ہیں یہ موضوع دوسرے باب میں تفصیلاً ذکر ہو چکا۔ غربت کے اہم اور بنیادی اسباب میں بے روزگاری، مہنگائی اور افراط زر، سود اور سودی معاملات، آبادی

---

[1] المحلی بالآثار، علی بن احمد بن حزم الاندلسی، دار الفکر، بیروت، سن ندارد، 3/455

میں بے تحاشہ اضافہ، ارتکاز دولت، آمدن کا غیر موزوں اور نامناسب خرچ نیز سستی و کاہل وغیرہ شامل ہیں۔ جن پر تفصیل گزر چکی ہے۔

اب اس باب میں اسلام کی طرف سے فقر و افلاس کے لیے پیش کیے گئے حل پر گفتگو گی۔ اسلامی معاشی نظام کے درج ذیل اہم اصول مسئلہ فقر و افلاس کے تدارک اور اس کے خاتمے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔

فصل اول

ارتکاز دولت کی ممانعت اور تقسیم دولت کا اصول

تاریخی حقائق گواہ ہیں کہ جب بھی کسی سماج میں ثروت و دولت سمٹ کر محدود افراد کے ہاتھوں میں آجاتی ہے تو پورے معاشرے کا نظم معیشت بگڑ جاتا ہے اور ایسا معاشرہ اپنا معاشی توازن کھو دیتا ہے، یوں یا تو اس کے معاشی قالب میں جان ہی نہیں رہتی یا پھر ہمیشہ لڑکھڑاتا رہتا ہے۔ دولت جمع کرنے والے افراد نہ صرف اپنی ذات کے لیے اخلاقی و معاشرتی جرائم کے مرتکب قرار پاتے ہیں بلکہ ان کا یہ ارتکاب جرم پورے معاشرے کے خلاف ہوتا ہے اور اس کو بری طرح متاثر کرتا ہے۔

اسلامی معاشی قوانین اس طرح کے جرائم کو پیدائش کے عمل سے ہی روکتے ہیں اور ان میں ایسا کوئی قانون اصلاً موجود ہی نہیں جس کا مقصد مال و دولت کو چند افراد تک محدود رکھنا ہو بلکہ اس کے برعکس اس نے جو قوانین وضع کیے ہیں ان کا ہدف یہ مقرر کیا کہ دولت کو مسلسل تقسیم اور گردش کے عمل میں رکھا جائے۔ یوں اسلام ارتکاز دولت کے کسی قانون یا کسی بھی شکل کو مدد فراہم کرنے کی بجائے گردش دولت اور تقسیم دولت کے اصول کا حامی ہے۔

اسلام ضرورت سے زائد دولت جمع کرنے کو معیوب قرار دیتا ہے۔ اس لیے کہ اسلامی نظام معیشت کا اصول، دولت کی مساوی تقسیم نہیں بلکہ منصفانہ تقسیم ہے۔ اس کے وضع کیے گئے معاشی قوانین میں کسی بھی فرد کی اپنی ذاتی محنت و مشقت اور کاوش سے حاصل کی گئی حلال کی کمائی پر محروموں اور محتاجوں کا حق مقرر کیا گیا ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہے کہ کسی فرد نے جیسے اور جس قدر دولت کمالی ہے وہ اسی کی ہے اور اس میں دوسرے افراد کا عمل دخل نہیں، نہ ہی معاشرے کے دیگر افراد کا کوئی حق اس سے وابستہ ہے۔

اسلام یہ چاہتا ہے کہ پیدائش دولت کے عمل میں تمام عاملین دولت کو اپنا حصہ ڈالنے اور اپنی کارکردگی دکھانے کا بھرپور موقع ملنا چاہیے اور پھر اسی اعتبار سے دولت کو عاملین پیدائش میں مختلف معاوضوں کی شکل میں تقسیم کر دیا جائے۔ یہی وہ ممکنہ صورت ہے جس کے بعد ہی دولت کی تقسیم کا نظام انصاف، عدل اور احسان کی بنیاد پر قائم ہو سکتا ہے اور معاشرے کے تمام افراد کو وسائل معیشت میسر آسکتے ہیں۔ البتہ یہ سب اہداف صرف اسی صورت میں ممکن ہیں جب دولت صرف چند ہاتھوں میں پابند نہ ہو جائے بلکہ پورے معاشرے میں اس انداز میں گردش کرے کہ ارتکاز و اکتناز کے امکانات دم توڑ جائیں اور معاشرے کے تمام افراد کو وسائل زیست اور ضروریات زندگی باوقار اور معیاری طریقوں پر میسر ہوں اور اس کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔

ذیل میں تقسیم دولت اسلامی تصور کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

ارتکاز دولت قرآن مجید کی نگاہ میں

معاشرے میں دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹ جانا، قرآنی نکتہ نگاہ سے سنگین اور بدترین فعل ہے۔ اس سے بڑھ کر ناپسندیدگی کا اظہار اور کیا ہو سکتا ہے کہ نہ صرف دنیا بلکہ آخرت میں بھی ارتکاز دولت کے حوالے سے عذاب الیم کا وعدہ دیا جا رہا

ہے۔ تاکہ وہ لوگ جو روپے پیسے کو معاشرے کی بجائے حد ذات تک محدود کر لیتے ہیں اس کام کے اخروی نتائج کے حوالے سے باخبر رہیں۔

دراصل اسلام سرے سے ایسی سوچ کا خاتمہ کرتا ہے جس کا مقصد مال و دولت کو چند افراد کی دسترس تک محدود کر دینا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ ایسے ذرائع استعمال کرتا ہے کہ جن کی بدولت دولت معاشرے کے تمام طبقات میں انصاف کے ساتھ تقسیم ہو اور اس کی گردش تمام طبقات میں جاری رہے۔ اس کے نزدیک ایسی کوئی بھی صورت قابل تصور ہے نہ قابل برداشت کہ جس میں معاشرے کے تمام وسائل دولت اور ذرائع سمٹ کر صرف ایک خاص طبقے یا چند افراد کے ہاتھ میں آجائیں اور وسائل دولت کا مالک طبقہ تو عیاشیاں کرے جب کہ دوسری طرف غریب عوام، ممالک اور افراد بنیادی ضروریات زندگی اور سہولیات کو ترس جائیں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ ﴾[1]

ترجمہ: تاکہ وہ (مال و دولت) تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔

اسلامی معاشی قوانین وضوابط دنیاوی دولت کی حرص وہوس، اپنی خوشحالی وامارت پر فخر تکبر کرنے، اثاثے بنانے اور ان میں لگاتار اضافہ کیے جانے کو معیوب گردانتے ہیں بلکہ اس کو انسانی سوچ وفکر کے لیے تباہ کن قرار دیتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿ أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ﴾[2]

ترجمہ: تمہیں کثرت (مال واولاد) کی مسابقت نے غفلت میں رکھا۔ یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ،الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ كَلَّا ، لَيُنبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ﴾[3]

ترجمہ: ہر طعن آمیز اشارتیں کرنے والے چغل خور کی خرابی ہے، جو مال جمع کرتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔ (اور) خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کی ہمیشہ کی زندگی کا موجب ہو گا، ہر گز نہیں وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا۔

---

[1] سورة الحشر: 59/7

[2] سورة التكاثر: 102/ 1-2

[3] سورة الهمزة: 104/1-4

یہ معاشرے کا ثروت مند اور دولت مند طبقہ ہی تھا جو اپنی دولت و مال کی کثرت کو پیغام رسالت کو جھٹلانے کی وجہ بنا لیتا۔ آسمانی ادیان و انبیاء کے خلاف بغاوت کا علم سب سے پہلے انہی لوگوں کے گھروں سے بلند ہوتا اور یہ کثرت دولت کے نشے میں الٰہی پیغام کی طرف متوجہ تک نہ ہوتے جس کی وجہ ان کا اپنے مال پر گھمنڈ اور فخر و مباہات ہوتا۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَمَا أَرْسَلْنَا فِي قَرْيَةٍ مِّن نَّذِيرٍ إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَا إِنَّا بِمَا أُرْسِلْتُم بِهِ كَافِرُونَ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴾[1]

ترجمہ: اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوش حال لوگوں نے کہا کہ جو چیز تم دے کر بھیجے گئے ہو ہم اس کے قائل نہیں، اور (یہ بھی) کہنے لگے کہ ہم بہت سامال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم کو عذاب نہیں ہو گا۔

اسلام نہ صرف ناجائز اور باطل طریقوں سے دولت کے انبار اکھٹے کرنے سے منع فرماتا ہے بلکہ اپنی، محنت، مشقت اور حلال طریقوں سے کمائی گئی دولت میں بھی بخل و اکتناز سے منع فرماتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴾[2]

ترجمہ: اور جو شخص طبعیت کے بخل سے بچایا گیا تو ایسے ہی لوگ راہ پانے والے ہیں۔

گویا کہ قرآنی نکتہ نظر کے مطابق انسان کو اپنی حلال کی کمائی اپنے اور اپنے خاندان کی جائز ضروریات زندگی مہیہ کرنے پر صرف کرنی چاہیے، اور اگر اس کی ضروریات سے بچ جائے تو پھر اس سے دوسرے ضرورت مند افراد کی حاجت روائی اور ان کی ضروریات کی تکمیل کا کام لیا جانا چاہیے۔ قرآن مجید اس حوالے سے واضح حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ:

﴿ وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ﴾[3]

ترجمہ: ان کے اموال میں سوال کرنے والوں اور سوال نہ کرسکنے والوں کا حق ہوتا ہے۔

---

[1] سورۃ سبا:34/34-35

[2] سورۃ التغابن:64/16

[3] سورۃ الذاریات:51/:19

ارتکاز دولت احادیث نبویہ کی روشنی میں

کلام پروردگار کی طرح زبان مقدس خاتم المرسلین سے بھی ارتکاز دولت کی ممانعت صریح ترین الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ حضرت ابوذر غفاری روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ دوران سفر رسول خداؐ نے مجھ سے پوچھا:

((يَا أَبَا ذَرٍّ أَتُبْصِرُ أُحُدًا؟ قَالَ: فَنَظَرْتُ إِلَى الشَّمْسِ مَا بَقِيَ مِنَ النَّهَارِ، وَأَنَا أُرَى أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُرْسِلُنِي فِي حَاجَةٍ لَهُ، قُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: مَا أُحِبُّ أَنَّ لِي مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَبًا، أُنْفِقُهُ كُلَّهُ، إِلَّا ثَلاَثَةَ دَنَانِيرَ» وَإِنَّ هَؤُلاَءِ لاَ يَعْقِلُونَ، إِنَّمَا يَجْمَعُونَ الدُّنْيَا، لاَ وَاللَّهِ، لاَ أَسْأَلُهُمْ دُنْيَا، وَلاَ أَسْتَفْتِيهِمْ عَنْ دِينٍ، حَتَّى أَلْقَى اللَّهَ))[1]

ترجمہ: اے ابو ذر کیا تو احد پہاڑ کو دیکھتا ہے۔ تو میں نے سورج کی طرف دیکھا جو ایک روشن دن میں پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، تو مجھے اندازا ہو کہ رسول خدا کسی خاص مقصد کے تحت مجھ سے ایسا پوچھ رہے ہوں گے تو میں نے جواباً کہا: اے خدا کے پیغمبر میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ نے ارشاد کیا: اگر میں احد پہاڑ جتنا سونا بھی رکھتا ہوتا تو میں تین دینار کے علاوہ سب اللہ کی راہ میں دے دوں۔ یہ لوگ نا سمجھ ہیں جو مال دنیا کو جمع کرنے لگتے ہیں، خدا کی قسم میں ان سے ہرگز دنیا کی کسی چیز کا سوال نہ کروں گا اور نہ ہی کوئی دین کی بات پوچھوں گا یہاں تک کہ اللہ سے جا ملاقات کروں۔

حضرت ابوذر کو بیان کیے گئی اس حدیث میں رسول گرامیؐ ان لوگوں کو نا سمجھ اور کم عقل کہتے ہیں جو مال دنیا جمع کرنے کی فکر میں مگن ہیں، اور پھر ان سے ایک لحاظ سے بیزاری بھی فرمائی کہ اگر مجھے ضرورت بھی پڑے تو ان سے سوال نہ کروں۔

اسلام در حقیقت اشیاء کو چھپانے، دوسرے لوگوں کو اس کے فوائد سے محروم کرنے اور چیزوں کو ذخیرہ کر کے ان کی قلت پیدا کرنے جیسے عوامل سے روکتا ہے، اور اس کے برعکس تاجر حضرات کو اشیاء خرید و فروخت کو تجارت کی غرض سے بازار اور منڈیوں میں لانے اکساتا اور ابھارتا ہے اور ان کی اس طرح کی مصروفیات کی بھرپور حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

امام نووی قائل ہیں کہ یہاں خاطئ سے مراد غلطی کرنے والا نہیں بلکہ گناہگار ہے۔ چنانچہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] صحیح بخاری، محمد ابن اسماعیل بخاری، کتاب الزکاۃ، باب ما ادی زکاتہ فلیس بکنز، حدیث رقم 1408، ص2/107

" قال اهل اللغة الخاطی بالهمز هو العاصی الاثم و هذ الحدیث صریح في تحریم الاحتکار "[1]

ترجمہ: اہل لغت کے مطابق جب خاطئ کو ہمزہ کے ہمراہ لکھا جائے تو اس سے مراد گناہگار اور عاصی لیا جاتا ہے۔ لہذا یہ حدیث صریحاً احتکار کی حرمت پر دلالت کرتی ہے۔

اسلامی معاشی روایات میں ذخیرہ اندوزی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے طرز عمل کی بھی حوصلہ شکنی کی گئی ہے کہ جو ہمیشہ اشیاء صرف کے بھاؤ اور قیمتوں میں مزید اضافے کے خواہشمند ہوتے اور ایسا ہونے کی صورت میں خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ احادیث نبوی میں ایسے لوگوں کو جو احتکار کرتے ہوں، قیمتوں کے اضافے پر خوش ہوتے ہوں اور نرخ کم ہونے پر غم زدہ ہوتے ہوں، برے تاجر کہا گیا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل نے خاتم الانبیاء سے احتکار کے بارے میں دریافت کیا تو سرکار دوعالم نے فرمایا:

((إِذَا سَمِعَ بِرُخْصٍ سَاءَهُ، وَإِذَا سَمِعَ بِغَلَاءٍ فَرِحَ بِهِ، بِئْسَ الْعَبْدُ الْمُحْتَكِرُ، إِنْ أَرْخَصَ اللهُ الْأَسْعَارَ حَزِنَ، وَإِنْ أَغْلَاهَا اللهُ فَرِحَ))[2]

ترجمہ: احتکار یہ ہے کہ جب وہ نرخ کم ہونے کا سنے تو اسے دکھ پہنچے جب کہ قیمتیں بلند ہونے پر اس کو خوشی ہو۔ بے شک ذخیرہ اندوزی کرنے والا بہت برا آدمی ہے، کہ اگر بھاؤ کم ہو جائیں تو اسے پریشانی ہو جاتی ہے اور جب مال مہنگا ہو تو وہ خوش ہوتا ہے

احادیث نبویہ میں مال کی ذخیرہ اندوزی کرنے والے، اس کو اپنی ملکیت میں روکنے والے اور احتکار کرنے والے کو صرف گناہگار کہنے پر اکتفاء نہیں کیا گیا بلکہ فرمایا:

((مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا أَرْبَعِينَ يَوْمًا فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللَّهِ وَبَرِئَ اللَّهُ مِنْهُ))[3]

ترجمہ: جو کھانے پینے کی اشیاء کو روک کر چالیس دن تک ذخیرہ کیے رکھے تو گویا وہ ذاتِ احدیت سے بری الذمہ ہے اور پروردگار بھی اس سے بیزار ہے۔

---

[1] المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج (شرح النووی علی المسلم)، محی الدین یحیی بن شرف النووی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، طبع ثانی، 1392ھ، کتاب البیوع، باب تحریم الاحتکار فی الاقوات، 11/43

[2] المعجم الکبیر، سلیمان بن احمد بن ایوب طبرانی، دارالنشر مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ، طبع ثانیہ، 20/95

[3] معجم ابن الاعرابی، ابوسعید بن الاعرابی، دار ابن جوزی، المملکۃ العربیہ السعودیہ، طبع اول 1997ء، 1/249

ذخیرہ اندوز بظاہر تو اپنے مال و متاع میں اضافے کے لیے مال کو ذخیرہ کر رہا ہوتا ہے مگر وہ اس بات سے لاعلم ہوتا ہے کہ پروردگار اس کے اس فعل کے بدلے اس کو کن کن مشکلات اور مصیبتوں میں گرفتار کرے گا۔ حضرت عمرؓ سے منقول ایک روایت میں حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا:

((من احتکر علی المسلمین طعامھم ضربہ اللہ بالجذام والافلاس))[1]

ترجمہ: جو کوئی بھی مسلمانوں کے کھانے پینے کی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کرے گا پروردگار اس کے جذام اور افلاس میں مبتلا کر دے گا۔

تعلیمات اسلامی میں کثرتِ دولت کو صرف اسی صورت میں پسندیدہ قرار دیا گیا ہے جب وہ خداوند متعال کے بتائے ہوئے رستوں کے مطابق استعمال ہو۔ اس کے ذریعے محتاجوں، محروموں، سائلوں اور ضرورت مندوں کی احتیاجات اور ضروریات کا بندوبست کیا جائے۔ اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو یہی دولت قیامت کے دن وبال جان بن جائے گی۔ چنانچہ حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے کہ

((إِنَّ المُكْثِرِينَ هُمُ المُقِلُّونَ يَوْمَ القِيَامَةِ، إِلَّا مَنْ أَعْطَاهُ اللَّهُ خَيْرًا، فَنَفَحَ فِيهِ يَمِينَهُ وَشِمَالَهُ وَبَيْنَ يَدَيْهِ وَوَرَاءَهُ، وَعَمِلَ فِيهِ خَيْرًا))[2]

ترجمہ: بے شک قیامت کے دن مال و ثروت کی کثرت والے لوگ (اعمال کے حساب سے) بڑے نادار ہوں گے، مگر وہ کہ جنہیں اللہ نے اس دنیا میں مال واموال عطا کیے تو انہوں نے اللہ کی اس عطا کردہ دولت کو دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے ہر طرف اللہ کی راہ میں لٹا دیا ہو اور اس مال سے بھلائی اور نیکی کمائی ہو۔

اسلام جہاں مال کے ذخیرہ کرنے کو معیوب و ممنوع قرار دیتا ہے وہیں لوگوں کی اپنی حاجات کے لیے بچائے گئے ضرورت بھر مال کو استثناء دیتا ہے کہ لوگوں کو اتنی سی اجازت ہے کہ وہ اچانک سے پیش آنے والے مالی معاملات اور مسائل کے لیے ضرورت بھر مال اپنے پاس رکھ سکتے ہیں البتہ ضرورت سے زائد اپنے پاس رکھنا لوگوں کی ذات کے لیے نہایت برا جب کہ اضافی مال کا انفاق اچھائی، نیکی اور خیر کا موجب ہے۔ مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ فرزند آدم! اگر تو اپنی ضرورت سے زائد مال خرچ کر دے تو یہ

---

[1] سنن ابن ماجہ، ابن ماجہ، دار الاحیاء الکتب العربیہ، کتاب التجارات، باب الحکرۃ والجلب، حدیث رقم 2155، ص 2/729

[2] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب الرقاق، باب المکثرون ہم المقلون، حدیث رقم 6443، ص 8/94

تیرے لیے زیادہ اچھا ہے۔ جب کہ اس زائد مال کو اپنے پاس روکے رکھنا تمہارے لیے شر کا باعث ہے، البتہ ضرورت بھر مال کو روکے رکھنا برا نہیں ہے۔[1]

شاہ ولی اللہ عیش پرستی کی ممانعت کے ضمن میں رقمطراز ہیں: "یہ بات بھی عیش پرستی میں شامل ہے کہ انسان زیادہ تعداد میں مویشی اور فرنیچر وغیرہ حاصل کرنے کے پیچھے پڑ جائے جبکہ ان چیزوں کے حصول کا مقصد تکمیلِ حاجات نہیں بلکہ لوگوں کے سامنے نمود و نمائش اور فخر ومباہات ہو۔ رسول اکرم کا فرمان ذیشان ہے کہ کہ کسی گھر میں ایک بستر صاحبِ خانہ کے لیے، ایک اس کی زوجہ کا، تیسرا مہمان کی خاطر، جبکہ چوتھا شیطان کے لیے ہے"۔[2]

ارتکازِ دولت کی ممکنہ صورتیں

ویسے تو ذخیرہ اندوزی کی کئی اقسام متصور ہو سکتی ہیں، مگر ان میں سے چند اہم ترین اور بڑی صورتیں کہ جن کے بارے میں اسلام نے سختی سے اور دوٹوک انداز میں منع کیا ہے، پیش کی جا رہی ہیں۔

(i) احتکار(Hoarding)

عربی زبان کے لفظ (حکر) سے بنا ہے جس کے لفظی معنی بدی اور ظلم کے ہیں۔ ابن منظور افریقی رقم طراز ہیں کہ:

"الحکر: الظلم والتنقض و سوء العشرۃ"[3]

ترجمہ: حکر سے مراد ظلم، اشیاء ضروریہ کی قلت کرنا اور برا معاشرہ تشکیل دینا ہے۔

اصطلاح میں احتکار اشیاء ضروریہ اور غذائی اجناس وغیرہ کو اس مقصد کے لیے ذخیرہ کرنا ہے کہ جب ان کی قیمتیں بلند ہو جائیں اور بازار میں ان اشیاء کی قلت پیدا ہو جائے تو ان اشیاء کی من چاہی قیمت وصول کی جائے۔ گویا احتکار ایک اعتبار سے اشیاء اور اجناس کو روک کر ان کی مصنوعی قلت پیدا کرنا ہے۔ جس کے باعث معاشرہ بے سکونی اور بے چینی کی زد میں آ جاتا ہے اور یوں شدید معاشی بحران جنم لیتے ہیں۔

ابن منظور افریقی لکھتے ہیں:

"الاحتکار: جمع الطعام و نحوہ مما یؤکل ، و احتباسه انتظار وقت الغلاء به"

---

[1] صحیح مسلم، مسلم بن حجاج، کتاب الزکاۃ، باب بیان ان ید العلیا خیر من الید السفلی، حدیث رقم 1036، ص 2/718

[2] شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغۃ، 2/163

[3] لسان العرب، ابن منظور، 4/208

[1] ترجمہ: کھانے پینے اور غذائی اجناس کو ذخیرہ کرنا اور ان کو اس مقصد کے لیے روکے رکھنا کہ بازار میں ان کی قیمت بلند ہو جائے (تو انہیں فروخت کے لیے پیش کیا جائے) احتکار کہلاتا ہے۔

فقہاء اسلام نے احتکار کے حوالے سے مختلف تعبیرات اور تعریفات پیش کی ہیں۔ ابن عابدین کے مطابق:

"اشتراء طعام ونحوه، وحبسه إلى الغلاء أربعين يوماً"[2]

ترجمہ: کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ کو خرید کر قیمت بڑھ جانے کی نیت سے چالیس روز تک ذخیرہ کر لینا احتکار کہلاتا ہے۔

مذکورہ تعریف کے مطابق احتکار کا تعلق کھانے پینے کی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی سے ہے۔ جیسا کہ احناف کا نکتہ نظر بھی یہی ہے۔[3] اور دوسرے یہ بھی کہ یہ ذخیرہ اندوزی قیمتوں میں اضافے کی خاطر ہو اور اس کا یہ عمل معاشرے کے افراد کے لیے ضرر رساں ہو، پس ان اجناس کو اس انداز سے ذخیرہ کرنا کہ جس سے کوئی نقصان دہ پہلو نہ نکلتا ہو مثلاً اس کے اس عمل کا مقصد یہ ہو کہ اگر بالفرض بازار میں یہ جنس عدم دستیابی کی شکل اختیار کر لے تو یہ ذخیرہ شدہ مال اس صورت میں بازار میں لا کر لوگوں کی ضروریات کو پورا کیا جائے گا تو ایسا عمل جائز بلکہ مستحسن بھی ہے، چونکہ اس کا مقصد لوگوں کو فائدہ پہنچانا ہے۔

الباجی اپنی کتاب المنتقی شرح الموطا میں احتکار کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

"الاحتكار:هو الادخار للمبيع، وطلب الربح بتقلب الأسواق"[4]

ترجمہ: احتکار کا مطلب ہے مبیع کو بچا کر اپنے پاس محفوظ کر لینا، اور (اس کی مصنوعی قلت پیدا کر کے) بازار میں اس کے نرخ بڑھنے کی وجہ سے اپنے منافع کو بھی بڑھا لینا۔

امام نووی کے نزدیک احتکار فقط غذا اور خوراک کے طور پر استعمال ہونے والی چیزوں میں ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

" قال اصحابنا الاحتكار المحرم هو الاحتكار فى الاقوات خاصة ، و هو ان يشترى الطعام فى وقت الغلاء للتجارة ولا يبيعه فى الحال بل يدخره ليغلوا ثمنه فاما اذا جاء

---

[1] لسان العرب، ابن منظور افریقی، 4/208

[2] رد المحتار، ابن عابدین، 6/398

[3] بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، ابو بکر بن مسعود، دار الکتب العلمیہ، طبع ثانی 1986ء، 5/129

[4] المنتقی شرح الموطا، سلیمان بن خلف القرطبی الباجی، مطبعۃ السعادۃ، مصر، طبع اولی 1332ھ، 5/15

من قريته او اشتراه فی وقت الرخص وادخره او ابتاعه فی وقت الغلاء لحاجته الی اکله او ابتاعه لیبیعه فی وقته فلیس باحتکار ولا تحریم فیه "[1]

ترجمہ: ہمارے علماء قائل ہیں کہ وہ احتکار جو حرام ہے اس کا تعلق فقط کھانے پینے کی اشیاء یعنی اقوات سے ہے۔ مثلاً اگر کوئی اناج وغیرہ کو تجارت کی غرض سے ایسے وقت میں خریدے جب اس کی قیمت زیادہ ہو اور پھر اس کو اس وقت تک روکے رکھے جب تک کہ اس کی قیمت بڑھ نہ جائے تو ایسا کرنا حرام ہے۔ لیکن اگر وہ اس مال کو اپنے علاقے سے ہی اپنے ہمراہ لایا ہو یا پھر اس کو اس کی دستیابی کے زمانہ میں خریدا ہو اور اپنے پاس محفوظ کر لیا ہو یا پھر اس کی قلت کے زمانے میں اپنی ضرورت کے لیے خریدا ہو یا اس نیت سے خرید کر ذخیرہ کیا ہو کہ جب اس کی قلت واقع ہو جائے تو لوگوں کو بیچ سکے تو ان تمام صورتوں میں اس کا خریدنا اور اس کو محفوظ کر لینا احتکار کے حکم میں نہیں ہے اور نہ ہی حرام ہے۔

البتہ بعض افراد احتکار کے دائرہ کار کو فقط کھانے پینے کی اشیاء تک محدود نہیں سمجھتے اور اس میں دیگر کئی کاموں کو بھی داخل سمجھتے ہیں۔ الدرینی لکھتے ہیں کہ:

"الاحتكار: هو حبس مال، أو منفعة، أو عمل، والامتناع عن بيعه، وبذله، حتى يغلو سعره غلاء فاحشاً غير معتاد، بسبب قلته، أو انعدام وجوده في مظانه، مع شدة حاجة الناس أو الدولة أو الحيوان إليه"[2]

ترجمہ: احتکار یہ ہے کہ کسی بھی مال، اس کی منفعت یا کسی عمل کو روک کر اس کی خرید و فروخت کے معاملات سے الگ کر دینا، یہاں تک کہ لوگ، حکومت یا حیوانات اس چیز کے لیے اس طرح سے محتاج ہو جائیں کہ اس چیز کی قیمت میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے۔

الدرینی کا یہ قول اور نظریہ موجودہ حالات و واقعات کے تناظر میں زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ اور فقہاء کی تعریفوں میں بیان کیا گیا احتکار کا مفہوم دراصل اس زمانے میں ممکنہ طور پر رائج احتکار کی عکاسی کرتا ہے، چونکہ اس زمانے میں غالبا انسانی زندگی اور اس کی معیشت نہائت سادہ شکل میں تھے اور دونوں کا زیادہ تر تعلق فقط اقوات سے رہتا تھا۔ لیکن آج کل کے زمانے میں

---

[1] شرح نووی علی المسلم، امام نووی، کتاب البیوع، باب تحریم الاحتکار فی الاقوات، 11 / 43

[2] الفقه الإسلامي المقارن مع المذاهب، ڈاکٹر محمد فتحی الدرینی، منشورات جامعة دمشق، طبع ثالثة 1992، ص90

احتکار کا مفہوم اور اس کی اشکال اور صورتیں نہایت وسعت اختیار کر چکے ہیں۔ اور اس کے لیے کئی جدید طریقے متعارف ہو چکے ہیں کہ جن کے ذریعہ انسانی زندگی کو اجیرن بنایا جاتا ہے اور مصنوعی قلتیں پیدا کر کے پوری انسانی معیشت کو بری طرح متاثر کیا جاتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کی انسانی زندگی کی ضرورتیں بدل جانے کی وجہ سے احتکار کے مفہوم کو اسی انداز سے وسیع تر تناظر میں لیا جائے۔

جیسا کہ امام ابو یوسف اسی قول کے قائل ہیں کہ ہر اس چیز کا احتباس کہ جس سے عمومی انسانی زندگی کو نقصان پہنچے حرام ہے اور احتکار کہلاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"كل ما أضر بالعامة حبسه فهو احتكار، وإن كان ذهباً أو فضة أو ثوباً"[1]

ترجمہ: ایسی تمام اشیاء جن کی ذخیرہ اندوزی عوام الناس کو نقصان پہنچائے، اگرچہ وہ سونا، چاندی یا لباس ہی کیوں نہ ہو (احتکار کے حکم میں داخل ہے)۔

امام ابن قیم بھی احتکار کے دائرہ کار کو تمام اشیاء تک وسیع جانتے ہیں، چنانچہ اس ضمن وہ رقم طراز ہیں کہ:

"ومن ذلك – أي من أقبح الظلم – أن يلزم الناس ألا يبيع الطعام، أو غيره من الأصناف إلا ناس معروفون، فلا تباع تلك السلعة إلا لهم، ثم يبيعونها هم بما يريدون، فلو باع غيرهم ذلك منع، وعوقب، فهذا من البغي في الأرض، والفساد، والظلم الذي يحبس به قطر السماء"[2]

ترجمہ: ظلم کی قبیح ترین اقسام واشکال میں شامل ہے کہ لوگوں پر اس بات کی پابندی عائد کر دی جائے کہ کھانا یا دیگر اشیاء چند مخصوص اور معروف افراد کے علاوہ کوئی نہیں بیچے گا، اور ان اشیاء کے بیچنے کا حق فقط انہی مخصوص اور من پسند افراد کو دے دیا جائے تاکہ وہ ان اشیاء کو اپنی مرضی سے بیچیں۔ اگر ان کے علاوہ

کوئی اور ان اشیاء کو بیچے تو اس کو منع کر دیا جائے اور اس کو سزا دی جائے۔ ایسا رویہ اور قانون درحقیقت فساد فی الارض، ظلم اور بغاوت ہے کہ جس کی وجہ سے باران رحمت تک رک جائے۔

---

[1] فتح القدير، محمد بن عبد الله الشوكاني، دار ابن كثير، دار الكلم الطيب، دمشق، بيروت، طبع اول 1414ھ، 10/58

[2] الطرق الحكمية، محمد بن ابي بكر ابن قيم الجوزية، مكتبة دار البيان، بدون طبعة وبدون تاريخ، ص356

اس قول اور نظریے کی مزید تائید حبیبِ کبریاء کے فرمان سے ہوتی ہے جس میں فرمایا:

((من احتكر حكرة يريد ان يغلى بها على المسلمين ، فهو خاطى))[1]

ترجمہ: جس کسی نے بھی مسلمانوں میں مہنگائی پیدا کرنے کی خاطر کسی چیز میں ذخیرہ اندوزی کی تو وہ گناہ کا مرتکب ہوا۔

یہاں خاطئ سے مراد گناہگار ہے جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ یہاں ذخیرہ اندوزی کے بیان میں اطلاق موجود ہے یعنی اس کا ارتکاب جیسی بھی اشیاء میں کیا گیا ہو، حرام ہو گا۔

(ii) اکتناز (Accumulation)

عربی زبان کے لفظ کنز سے نکلا ہے۔ کنز وہ مال ہے جس کو جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے کی نیت سے کسی برتن وغیرہ میں محفوظ کر لیا گیا ہو یا پھر زیر زمین دفن کر دیا گیا ہو۔ لسان العرب میں ہے کہ:

"الكنز فى الاصل المال المدفون تحت الارض"[2]

ترجمہ: کنز زمین میں دفن شدہ مال کو کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں دولت کی بہت بڑی مقدار کے لیے بھی کنز کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ارشاد پروردگار ہے:

﴿ فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ صَدْرُكَ أَن يَقُولُوا لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ كَنزٌ أَوْ جَاءَ مَعَهُ مَلَكٌ إِنَّمَا أَنتَ نَذِيرٌ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ وَكِيلٌ ﴾[3]

ترجمہ: شاید تم کچھ چیز وحی میں سے جو تمہارے پاس آتی ہے چھوڑ دو اور اس (خیال) سے کہ تمہارا دل تنگ ہو کہ (کافر) یہ کہنے لگیں کہ اس پر کوئی خزانہ کیوں نہ نازل ہوا یا اس کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں آیا۔ اے محمد ﷺ! تم تو صرف نصیحت کرنے والے ہو۔ اور خدا ہر چیز کا نگہبان ہے۔

شرعی اصطلاح میں ایسے اموال کنز کے ضمرے میں آتے ہیں جن میں زکاۃ کی ادائیگی نہ ہوئی ہو۔ حدیث میں وارد ہوا ہے کہ:

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل، مؤسسۃ الرسالۃ، طبع اولی 2001، 14/ 265

[2] لسان العرب، ابن منظور افریقی، 5/ 402

[3] سورۃ ہود: 11/ 12

((كُلُّ مَال لَا تُؤَدى زَكَاتُه فهُوَ كَنز))[1]

ترجمہ: جس مال کی زکاۃ ادانہ کا جائے وہ کنز ہے۔

احتکار و اکتناز در حقیقت دو الگ الگ رویے ہیں جن کا تعلق بالآخر ارتکاز ثروت و دولت سے ہو تا ہے۔ البتہ ان میں باہم فرق بھی موجود ہے۔

ارتکاز دولت کی وہ صورت کہ جس میں صنعتی اشیاء، تجارتی اموال اور غذائی اجناس جیسی چیزوں کو مارکیٹ میں جانے سے روک دیا جائے اور انہیں ذخیرہ کر لیا جائے یا مثلاً کسی بھی چیز کو اس کی پیدائش کی جگہ سے ہی کاملاً خرید لینا اور اوپن مارکیٹ میں جانے سے اس کو روک لینا اور اس کی مصنوعی قلت پیدا کر دینا اور جب مارکیٹ میں ناپید ہو جانے کی وجہ سے اس کے دام اور قیمت بڑھ جائے تو تب اس کو بلند قیمت کے ساتھ اور مہنگے داموں فروخت کرنا احتکار کہلاتا ہے اور یہ شرعاً ممنوع اور حرام ہے۔ عموماً اس طرح کے حالات میں محتکر کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو صرف جائز اور مناسب منافع ہی نہ ملے بلکہ اس کی قلت کی وجہ سے جب اس چیز کی قیمت کئی گنا بڑھ جائے تو تب اسے کئی گنا منافع ملے اور وہ یوں راتوں رات بڑی چھلانگ لگا کر دولت مندوں اور امراء کی صف میں جا کھڑا ہو۔

جب کہ ذخیرہ اندوزی کی وہ صورت حال کہ جس میں اصل زر، مثلاً تجارت وصنعت وغیرہ سے جو روپیہ پیسہ یا سونا، چاندی یا سرمایہ حاصل ہو اس کو جمع کر کے ذخیرہ کیا جائے، اکتناز کہلاتی ہے۔ عموماً اس طرح کی صورت حال میں دولت ایک جگہ اکٹھی ہوتی رہتی ہے، اس کی گردش رک جاتی ہے اور لوگ اس سے بہرہ مند نہیں ہو پاتے یوں وہ معاشرے کی معیشت کے لیے تباہ کن اثرات پیدا کرنے لگتی ہے۔ اور جو اس مال و دولت کا مالک ہو تا ہے اس کا اس طرح کے رویے پر خیال یہ ہو تا ہے کہ یہ اس کے ذاتی اموال ہیں اور ان میں فقط اس کے اپنے حقوق ہی مربوط ہیں، لہذا اس کی مرضی چاہے تو اس کو خرچ کرے، چاہے تو اس کو جمع کرے اور چاہے تو کسی کاروبار میں لگائے۔ بالآخر وہ اس دولت کا مالک ہے۔

(iii) سٹہ بازی (Speculation)

سٹہ بازی بھی ذخیرہ اندوزی اور بازار میں اشیاء کی قلت پیدا کر دینے کی ایک قسم ہے۔ دراصل اس کے ذریعے اشیاء کی مصنوعی قلت پیدا کر کے لوگوں کا استحصال کیا جاتا ہے اور آج کل کے تجارتی حلقوں میں اس طرح کی سرگرمیاں بکثرت رواج پکڑ چکی ہیں۔ عموماً اس طرح کی قلت پیدا کرنے والے سیٹھ قسم کے مالدار لوگ ہوتے ہیں جو کسی بھی چیز کی تمام تر مقدار کو مارکیٹ میں

---

[1] السنن الکبری، احمد بن حسین ابو بکر البیھقي، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبع ثالثہ 1424ھ، حدیث 7022، 4/82

آنے سے قبل ہی خرید کر روک لیتے ہیں اور جب بازار میں پہلے سے موجود پیداوار ختم ہو جاتی ہے تو اس چیز کے مارکیٹ میں نایاب ہونے کی وجہ سے اس کی طلب بھی بڑھ جاتی ہے۔اور جب طلب بڑھ جائے تو اس کی قیمت نہایت بلند ہو جاتی ہے جس کا براہ راست اثر ان اشیاء کے استعمال کرنے والے غریب لوگوں پر پڑتا ہے۔

سٹے بازی کا کام کرنے والے لوگ عموماً یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ کسی بھی چیز کی قیمت اگلے چندماہ میں بڑھنے والی ہے۔مثلاً ماہ رمضان کی آمد سے قبل عموما بیسن کی قیمت میں خاصہ اضافہ ہو جاتاہے۔سٹے باز افراد ماہ رمضان سے قبل کسی مخصوص علاقے کو بیسن سپلائی کرنے والی کمپنی یا فیکٹری سے اگلے چندماہ کی ساری پیداوار موجودہ ریٹ پر یا اس سے بھی کم قیمت پر خرید لیتے ہیں اور ماہ مبارک سے قبل مال کی سپلائی بند کر کے اس میں شدید قلت پیدا کر دیتے ہیں، دوسری طرف بازار میں معاملہ اضافی طلب تک پہنچ چکا ہوتا ہے، جب کہ مارکیٹ میں دستیاب مال ختم ہو چکا ہوتا ہے یوں اس چیز کی قیمت کا بڑھ جانا بظاہر فطرتی امر ہوتا ہے۔اب تمام دکاندار اور ضرورتمند لوگ اس فیکٹری یا مال کے ڈسٹری بیوٹر سے مال کا مطالبہ کرتے ہیں لیکن وہ تو اپنے آرڈر کو پورا کرنے کی فکر میں مگن ہوتا ہے۔بعض اوقات قیمتوں میں ارزانی کا رجحان دیکھتے ہوئے فیکٹری کے مالک ہی سیٹھ صاحب سے اس چیز کو خریدی گئی رقم سے کئی گنا اضافی رقم دے کر خود ہی خرید لیتے ہیں اور سیٹھ صاحب وہ مال فیکٹری مالکان کو بیچے یا بازار میں جا کر بیچے ہر دو صورت میں اس کو کئی گنا اضافی قیمت وصول ہو جاتی ہے جس کی وجہ اس کی پیدا کی گئی مصنوعی قلت ہوتی ہے۔

ان تمام تر حالات میں کیے گئے معاملے کا مقصد اس چیز کو خریدنا نہیں بلکہ اس کو خرید کر بازار میں مصنوعی قلت اور کمی پیدا کرنا ہوتا ہے اور پھر لوگوں کی ضرورتوں اور مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کا استحصال کرنا اور اصل قیمت سے کئی گنا زیادہ اضافی منافع بٹورنا ہوتا ہے۔[1]

آج کل کے دور میں اس قسم کی مثالیں ہمارے سامنے عام ہیں۔پٹرول کا بحران ہو یا آٹے کی قلت، عید سے قبل ٹماٹر وغیرہ کا مارکیٹ سے ناپید ہونا ہو یا چینی کا بحران آئے روز پیش آنے والے بحرانوں کی وجہ یہی سٹہ بازی ہوتی ہے۔

سٹہ بازی کی حرمت کی ادلہ

سٹہ بازی یا Speculation کے انداز میں کیا گیا معاملہ چند وجوہ کی بنا پر شریعت مقدسہ اسلام کی روح سے جائز نہیں ہے۔

1: حضرت ابن عباس کہتے ہیں کہ: **أَمَّا الَّذِي نَهَى عَنْهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ((فَهُوَ الطَّعَامُ أَنْ يُبَاعَ حَتَّى يُقْبَضَ))**[1]

---

[1] احکام تجارت اور لین دین کے مسائل، عبد الرحمن کیلانی، مکتبۃ السلام،لاہور، طبع ششم، 2013ء ص80

ترجمہ: رسول خداؐ نے کھانے پینے کی اشیاء کو قبضے میں لیے بغیر بیچنے سے منع فرمایا۔

ایک اور حدیث میں وارد ہوا ہے کہ:

زَادَ إِسْمَاعِيلُ: ((مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلاَ يَبِعْهُ حَتَّى يَقْبِضَهُ))[2]

ترجمہ: اسماعیل اس حدیث میں اضافہ کرتے ہیں کہ قبضہ کرنے سے پہلے کھانے پینے کی اشیاء کی فروخت سے منع کیا گیا ہے۔

یوں اس طرح کی بیع اس اسلامی اصول کی مخالفت ہوئی کہ جو چیز اپنے قبضے میں نہ ہو اس کی بیع مت کرو۔ کیونکہ سٹہ بازی میں فیکٹری کا مالک ایسی چیز کا معاملہ کرتا ہے جو فعلاً اس کے پاس نہیں ہوتی۔ یا اسی طرح بعد میں جب سٹے باز اپنی خریدی گئی چیز کو اسی فیکٹری کے مالک کو بیچتا ہے تو در حقیقت وہ ایک ایسی چیز کو بیچ رہا ہوتا ہے جو اس کے قبضے میں نہیں آئی ہوتی، یوں یہ بیع قبضۃ میں لی گئی چیز کی بیع نہ ہونے کی بنا پر اسلامی اقتصادی اصولوں کے مطابق باطل اور ممنوع معاملہ ہوتی ہے۔

2: نبی کریم سے ایک اور روایت میں نقل ہوا کہ کھانے پینے کی اشیاء کو پورا کیے بغیر (یعنی ان کی ناپ، تول، وزن یا گنتی وغیرہ کیے بنا) بیچنا جائز نہیں ہے۔[3]

اس روایت کی روشنی میں اسلامی اصول تجارت کے مطابق کسی بھی چیز کی جب تک ماپ تول کر تسلی نہ کر لی جائے اس کی بیع جائز نہیں ہوتی۔ جب کہ مندرجہ بالا مفروضہ شکل میں ناپ تول یا وزن وغیرہ کی کوئی صورت وقوع پذیر نہیں ہوتی۔

3: ہر وہ کام جس سے مسلمانوں کو بلکہ عموماً انسانوں کو نقصان پہنچے ممنوع و حرام ہے۔ چونکہ سٹے بازی کی اس صورت میں مقصد لوگوں کی ضروریات کو روک کر اس سے ناجائز استفادہ کرنا اور ان کا استحصال کر کے منافع کمانا ہے لہذا یہ کام شرعی نکتہ نگاہ سے کاملاً اور بالوثوق حرام کام ہے۔ خاص طور پر کہ جب اس کی تائید رسول گرامی قدر کے فرمان سے یوں ہو رہی ہے:

((من احتكر حكرة ، يريد ان يغلى بها على المسلمين فهو خاطى))[4]

---

[1] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب البیوع، باب بیع الطعام قبل ان یقبض، حدیث رقم 2135، 3/68

[2] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب البیوع، باب بیع الطعام قبل ان یقبض، حدیث رقم 2135، 3/68

[3] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب البیوع، باب بیع الطعام قبل ان یقبض و بیع مالیس عندک، حدیث رقم 2136، 3/68

[4] مسند حنبل، احمد بن حنبل، 14/265

ترجمہ: جو شخص بھی بھی لوگوں میں مہنگائی ایجاد کرنے کی غرض سے اموال و وسائل کو ذخیرہ کرلے تو وہ گناہگار ٹھہرا۔

تقسیم دولت کا اصول

اللہ تبارو تعالی نے سبھی انسانوں کو برابر درجے کی شرف انسانیت سے نوازا ہے۔ اللہ کی کائنات میں موجود سبھی انسان شرفِ انسانیت میں برابر ہیں۔ اب جب کہ سب کی ضرورتیں یکساں احترام کے لائق ہوں یعنی جب ہر شخص کی ذہنی اور جسمانی توانائیوں کی پرورش کے لیے عمدہ غذا درکار ہے، سب کو ایسے صحیح و سالم ٹھکانے کی ضرورت ہے کہ جس میں وہ زندگی کے دن اطمینان سے گزار سکے، اس کی صحت مناسب دوا اور علاج کی سہولتوں سے بہرہ مندی کی طالب ہے، نیز سب کی روحانی و اخلاقی یا فنی تربیت متقاضی ہے کہ اس کے لیے بغیر کسی امتیاز کے دانشگاہوں، کالجوں اور دیگر قومی اداروں کے دروازے کھلے رہیں تو پھر یہ کیا اندھیر نگری ہے کہ ہمارے ہاں ان حقائق سے قطع نظر ایک ہی انسانی معاشرہ دو الگ الگ حالتوں اور کیفیتوں میں بدل چکا ہے، معاشرے میں موجود ایک ہی معاشرے کے کئی متضاد رخ نمایاں ہیں۔ سماج میں ایک گروہ کو نہ صرف زندگی کی تمام سہولیات بآسانی اور وافر مقدار میں میسر ہیں بلکہ وہ تعیش اور تمول کے اس مقام پر فائز ہے جہاں دولت کی فراوانی اس کو اخلاق کے حدود سے تجاوز کر کے گناہ اور معصیت کی وادیوں میں ڈال دیتی ہے۔ اور دوسرا گروہ پیٹ بھرنے کے لیے روٹی اور تن ڈھانپنے کے لیے لباس تک کا محتاج ہے۔ ایک گروہ سر بفلک محلات اور بڑی بڑی کوٹھیوں میں براجمان ہے اور دوسرے کو تنگ و تاریک کوٹھڑی بھی میسر نہیں۔ ایک گروہ کو اعلی طبی سہولیات میسر ہیں جب کہ دوسرا گروہ بیماری کی حالت میں ایڑھیاں رگڑ کر جان دینے پر مجبور ہو ہے۔

معاشرے میں پایا جانا والا یہ معاشی خلل و تفاوت محض ایک اتفاق ہی نہیں ہے بلکہ یقینا اس بگاڑ اور انحراف میں کچھ اسباب کارفرما ہوں گے جب تک ان اسباب کا تعین نہیں ہو گا اس انحراف کی درستگی بھی مشکل ہے۔ ضروری امر ہے کہ ان اسباب اور عوامل کے بارے میں دین و مذہب اور شریعت نے بھی ضرور توجہ دلائی ہو گی اور اگر نہ بھی دلائی ہو تو جب وہ اسباب اور وجوہ کسی معاشرے پر مسلط ہونے لگیں تو یقینا ان کی نشاندہی کر کے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا حل ضرور پیش کیا جاتا ہو گا۔

اسلام روزاول سے غربت او اس کے علاج، غریبوں کے حقوق کی پاسداری اور روحانی کے ساتھ ساتھ ان کی مادی ضروریات کی کفالت پر بھی زور دیتا رہا ہے۔ اسلامی تعلیمات دولت کی پیداوار اور حصول سے لیکر معاشرے میں موزوں تقسیم اور خرچ تک کی ہدایات ارشاد فرماتا ہے۔ دولت اللہ تعالی کی ایک امانت ہے لہذا ضروری ہے کہ مالک حقیقی کی ہدایات کے مطابق اس کو خرچ کیا جائے۔ محنت، کاوش اور جدوجہد کرنا بندے کا کام ہے لیکن اس پر ثمرات فقط اللہ تعالی کی مرضی اور منشا سے مترتب ہوتے ہیں۔

اسلام مال و دولت کی حقیقت اور ملکیت کے بارے میں دیگر معاشی مکاتب اور فکر سے یکسر جداگانہ اور منفرد سوچ کا حامل ہے۔ مناسب محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی اصول دولت بیان کرنے سے قبل اسلام کی نظر میں مال و دولت کی حقیقت کے بارے میں کچھ بیان کیا جائے۔

اسلام کا نظریہ مال و دولت

اسلامی نکتہ نگاہ سے دنیا میں پیدا کی گئی تمام موجودات، چاہے وہ جاندار ہوں یا بے جان، عقل و فہم رکھتی ہوں یا اس سے عاری ہوں، سب پروردگار کی ملکیت میں ہیں حتیٰ کہ نفس انسان اور اس کی جان بھی پروردگار کی ملکیت میں ہے۔

﴿ لِّلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ﴾ [1]

ترجمہ: جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔

لہٰذا دنیا کے تمام مال، اموال اور املاک سبھی کچھ پروردگار کی ملکیت ہے۔

﴿ وَآتُوهُمْ مِنْ مَالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ ﴾ [2]

ترجمہ: اور خدا نے جو مال تم کو بخشا ہے اس میں سے ان کو بھی دو۔

﴿ وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِينَ فِيهِ ﴾ [3]

ترجمہ: اور جس (مال) میں اس نے تم کو (اپنا) نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

اس نے ہی ان تمام اشیاء کو انسانوں کے لیے پیدا کیا اور پھر ان کو انسان کی دسترس میں دیا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ﴾ [4]

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں۔

﴿ وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ ﴾ [5]

---

[1] سورۃ البقرۃ:284/2

[2] سورۃ النور:33/24

[3] سورۃ الحدید:7/57

[4] سورۃ البقرۃ2/:29

[5] سورۃ الجاثیہ:13/45

ترجمہ: اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنے (حکم) سے تمہارے کام میں لگا دیا۔

تمام اشیاء کو انسان کے لیے پیدا کیا گیا مگر ان اشیاء کے استعمال کے حوالے سے انسان کو مکمل اور بے مہار آزادی نہیں دی کہ وہ جیسے چاہے ان کو اچکتا پھرے اور کسی چیز کی رو رعایت تک نہ کرے۔ چاہیے کہ انسان خلاقِ عالم کی عطا کردہ تمام نعمتوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھنے کی بجائے اللہ کی عطا سمجھیں اور اس کے اجازت دیے گئے طریقے کے مطابق حاصل بھی کریں اور استعمال بھی۔ اس کے حکم کو کاملاً ملحوظ خاطر رکھیں۔ اور ان تمام چیزوں میں اس کے بتائے گئے شرائط و قوانین کی مکمل پیروی اور رعایت کریں۔ اور اگر ان تمام چیزوں کا لحاظ نہ کیا تو یہ اس کی عطا کی گئی امانت میں خیانت اور غداری کے مترادف ہو گا۔ اور چونکہ ان تمام چیزوں میں نیابت کے اصول کے مطابق انسانی کو تصرف کو جائز قرار دیا ہے لہذا اس سے پھر سوال بھی ہو گا کہ اس نے اس حق کا غلط استعمال تو نہیں کیا یا پھر اس امانت میں غداری کا مرتکب تو نہیں ہوا۔

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الْمَآبِ﴾[1]

ترجمہ: لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں یعنی عورتیں اور بیٹے اور سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ڈھیر اور نشان لگے ہوئے گھوڑے اور مویشی اور کھیتی بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں (مگر) یہ سب دنیا ہی کی زندگی کے سامان ہیں اور خدا کے پاس بہت اچھا ٹھکانا ہے۔

البتہ ساتھ میں یہ بھی بتایا ہے کہ مال سے لگاؤ اور اس کی محبت فطرت انسان میں ودیعت کی گئی ہے۔ لہذا مال و ثروت سے محبت فطرت انسانی میں اس کے ساتھ ہی اس دنیا میں آتی ہے، اور پھر ہر گزرتے لمحے ساتھ ساتھ مزید پروان چڑھتی ہے۔

﴿ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ ﴾[2]

ترجمہ: وہ تو مال سے سخت محبت کرنے والا ہے۔

اسلامی روایات کی بنیاد پر مال کا زیادہ ہونا رضاء پروردگار اور اس کی خوشنودی کی وجہ و علامت نہیں ہے جیسا کہ مال کا نہ پایا جانا غضب پروردگار اور سخط الٰہی پر دلالت نہیں کرتا۔ عموماً معاشرے کے اکثر لوگوں کا خیال یہی ہوتا ہے مال اللہ کی خوشنودی، اس

---

[1] سورۃ آل عمران: 14/3

[2] سورۃ العادیات: 8/100

کی خوشی ورضا اور اس کے قرب پر دال ہے جب کہ غربت اس کے قہر اور غضب کی نشانی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے اس حوالے سے عوامی سوچ کے عکاس اس مطالبے کا ذکر بھی کیا ہے کہ اگر نبی اللہ کا برگزیدہ اور انتخاب کردہ ہے تو اس کے پاس پھر مال و دولت کی بہتات کیوں نہیں ہے۔ چنانچہ جب طالوت خدا کے حکم سے انکے بادشاہ بنے تو بنیادی اعتراضیہ تھا کہ جو مال و دولت میں ہم سے کم تر ہے وہ کیوں کر اور کیسے ہمارا امور کا ولی اور ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ﴾[1]

ترجمہ: اور پیغمبر نے ان سے (یہ بھی) کہا کہ خدا نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر فرمایا ہے۔ وہ بولے کہ اسے ہم پر بادشاہی کا حق کیونکر ہو سکتا ہے بادشاہی کے مستحق تو ہم ہیں اور اس کے پاس تو بہت سی دولت بھی نہیں۔

ان کا یہ سوال در حقیقت معاشرے میں رائج اس سوچ کا عکاس ہے کہ ان کے سماج میں معیار فضیلت کسی بھی شخص کی ملکیت میں موجود مال و دولت کی مقدار ہے۔ کفار میں موجود امراء، غریب اور تنگدست مومنین سے اس بات کا باقاعدہ اظہار کرتے کہ ہمارے پاس تم سے زیادہ مال و دولت اور ثروت موجود ہے جس کی وجہ سے وہ عذاب جیسی صورت حال سے دوچار نہیں ہوں گے۔

﴿ وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ﴾[2]

ترجمہ: اور (یہ بھی) کہنے لگے کہ ہم بہت سا مال اور اولاد رکھتے ہیں اور ہم کو عذاب نہیں ہو گا۔

تقرب پروردگار کے لیے فقط مال و اموال کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ جو چیز عند اللہ کامیابی کا سبب ہے وہ ایمان اور عمل ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿ وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُم بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ جَزَاءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ﴾ [3]

---

[1] سورۃ البقرۃ:247/2

[2] سورۃ سبا:35/34

[3] سورۃ سبا:37/34

ترجمہ: اور تمہارا مال اور اولاد ایسی چیز نہیں کہ تم کو ہمارا مقرب بنا دیں۔ ہاں (ہمارا مقرب وہ ہے) جو ایمان لایا اور عمل نیک کرتا رہا۔ ایسے ہی لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب دگنا بدلہ ملے گا اور وہ خاطر جمع سے بالاخانوں میں بیٹھے ہوں گے۔

اسی لیے اللہ کے نبی نے نہایت جامع کلام کے اندر ارشاد فرمایا:

((نعم المال الصالح للرجل الصالح))[1]

ترجمہ: صالح اور نیک مال، صالح اور نیک افرد کے لیے کتنا ہی اچھا ہے۔

اچھا مال یا مالِ صالح دراصل ایسا مال ہے جس کو خون پسینے کی محنت اور حلال طریقے سے کمایا گیا ہو اور خرچ کرتے وقت اس کو اس کے جائز مقام پر خرچ کیا جائے۔

معلوم ہوا کہ مال و ثروت کے بارے میں اسلامی نکتہ نظر درج ذیل نکات کو شامل ہے

1 مال صرف اللہ کی ملکیت ہے۔

2 انسان کو اللہ نے مال و دولت میں صرف مشروط تصرفانہ حقوق دیے ہیں۔

3 انسان کو فقط اللہ کی عطا کردہ اور اجازت دی گئی حدود میں مال دولت کمانے اور اس کو صرف کرنے کی اجازت ہے۔

4 مال و دولت دنیاوی زندگی کا سامان زینت ہیں۔

5 مال و دولت کی زیادتی اللہ کی خوشنودی کی علامت نہیں، اور مالی تنگدستی پروردگار کی ناراضگی پر دال نہیں۔

6 مال و دلت فقط انسانی مقاصد کی راہ میں وسیلہ ہے، غرض و غایت نہیں۔

مال و دولت وسیلہء آزمائشِ بشر ہے۔

اسلام کا نظریہ صرفِ دولت قرآن مجید کی روشنی میں

مذہب اسلام میں مال و ثروت کو شرافت و بزرگی کا معیار نہیں، بلکہ ان چیزوں کو اللہ کی رضا کے حصول اور اپنی آخرت کے کامیاب بنانے کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ لہذا مال کو امتحان و آزمائش کی وجہ قرار دیا ہے کہ اگر کسی کو مال و دولت مل جائے تو اس صورت میں وہ اس کا استعمال کیسے اور کس صورت میں کرے گا اور اگر کوئی اس نعمت سے محروم ہو تو اپنی محرومی کو کس نگاہ سے دیکھے

[1] شعب الایمان، البیہقی، 446/2

گا اور کس طرح اس کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کرے گا بالخصوص ایسی حالت میں کہ جب اس کے آس پاس والے لوگ مال و دولت اور آسائشوں میں غرق ہوں۔

قرآن مجید روزگار، رزق اور وسائلِ زندگی کی تلاش و حصول کو ہر شخص کا بنیادی حق قرار دیتا ہے۔ پروردگار نے روزی رزق کے تمام وسائل اور انسانی زندگی کی تمام ضروریات کو فراہم کرنے کے ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے۔ اس سلسلے میں وہ سب کی معاشیات کا ضامن ہے۔ اس کی یہ کفالت کسی رنگ، کسی نسل اور کسی خاص عقیدے کے لیے خاص و مختص نہیں ہے بلکہ چونکہ وہ رب العالمین ہے لہذا تمام عالمین اور پوری کائنات کو اس نے رزق خود مہیا کرنا ہے۔

چنانچہ صرف انسان ہی نہیں بلکہ تمام مخلوقات کو رزق فراہم کرنے کے بارے حکم الٰہی ہے:

﴿ وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ﴾[1]

ترجمہ: اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا جانور نہیں ہے مگر یہ کہ اس کا رزق خدا کے ذمے ہے۔

اس آیت یا اس جیسی دیگر آیات میں خداوند عالم نے روزی کے ذخائر اور رزق کے تمام وسائل و اسباب مہیا کرنے کو اپنے ذمہ لیا ہے پھر اس کے بعد تمام موجودات کو رزق کے لیے نکل کھڑے ہونے کا درس دیا کہ رزق کی تلاش تمہاری اپنی ذمہ داری ہے اور تم جس حد تک اور جس انداز میں اپنی ذمہ داری نبھاؤ گے اتنا ہی رزق تمہارے حصے میں آئے گا کیونکہ ہر چیز حسب سعی و محنت ہی میسر ہوتی ہے۔ چنانچہ اللہ کے رزق کو زمین و آسمان کی وسعتوں میں تلاش کرو۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ ﴾[2]

ترجمہ: پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور خدا کا فضل (رزق) تلاش کرو۔

﴿ إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِندَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ وَاشْكُرُوا لَهُ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾[3]

ترجمہ: تو جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو وہ تم کو رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے پس خدا ہی کے ہاں سے رزق طلب کرو اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر کرو اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے۔

---

[1] سورۃ ہود: 6/11

[2] سورۃ الجمعہ: 10:/62

[3] سورۃ العنکبوت: 17/29

اگرچہ زمین و آسمان رزق کے وسائل سے بھرے پڑے ہیں لیکن مخلوقات کی دسترس میں وہ رزق تب آئے گا جب ان وسائلِ روزی اور سامانِ معیشت سے مخلوقات خود استفادہ کریں گی۔ یہ نظام اتنا عادلانہ بنایا کہ ان تمام وسائل معیشت پر تمام مخلوقات کا حق مساوی قرار دیا۔ کسی کو بھی یہ اجازت نہیں دی کہ تمام کے تمام ذرائع معاش کو اچک کر اپنی ملکیت میں لے آئے اور دیگر مخلوقات کا حق استفادہ ان سے سلب کرلے۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿ هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ ﴾[1]

ترجمہ: وہی تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم کیا تو اس کی راہوں میں چلو پھرو اور خدا کا (دیا ہو) رزق کھاؤ۔

یوں روزی کی راہوں کو ڈھونڈنا اور وہاں اپنا رزق تلاش کرنا سبھی مخلوقات کی اپنی ذمہ داری ہے۔

خلاصہ کلام: ان آیات کی روشنی میں درج ذیل نکات واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔

1 رزق و روزی فراہم کرنا پروردگار عالم نے اپنے اوپر لازم قرار دیا ہے۔

2 سامان معیشت اور وسائل روزی پروردگار نے زمین و آسمان کی وسعتوں میں رکھ دیے ہیں۔

3 اپنا اپنا رزق تلاش کرنا اور روزی کی راہوں کو ڈھونڈنا سبھی مخلوقات کی اپنی ذمہ داری ہے۔

تقسیم دولت قرآن مجید اور احادیث نبوی کی روشنی میں

کسب دولت و معاش کا مرحلہ جس قدر پر خطر اور مشکل تصور کیا جاتا ہے کہ ہر وقت انسان کو یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کسب روزی و رزق میں کوئی لغزش واقع نہ ہو جائے جس کی وجہ سے انسان اپنے لیے مال حرام کو کہیں اکٹھا نہ کرتا پھرے اور اکل مال بالباطل کا شکار نہ ہو جائے، اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک پہلو کسب معاش کے بعد تقسیم دولت کا ہے۔

انسان کی مال کے ساتھ محبت نہایت گہری ہے۔ اسلام کی ترویج و اشاعت میں اس چیز کو شروع ہی سے مد نظر رکھا گیا کہ انسان اور مال کے درمیان پائے جانے والے اس میلان اور ربط کو کم از کم اس کے ماننے والوں کے لیے کم کر دیا جائے۔ وگرنہ عموماً زندگی کے ہر گزرتے دن اس میلان میں اضافہ ہی متوقع ہوتا ہے۔ آپؐ نے انسانوں کی مال کے ساتھ بڑھتی ہوئی محبت کے حوالے سے ارشاد فرمایا:

---

[1] سورۃ الملک: 67/15

((یکبر ابن آدم ویکبر معه اثنان: حب المال وطول العمر))[1]

ترجمہ: انسان جوں جوں بڑا ہوتا ہے تو دو چیزیں اس کے ساتھ بڑھتی چلی جاتی ہیں، مال کی محبت اور لمبی عمر کی آرزو۔

لہذا اپنے وجود میں پائی جانے والی مال کی اس قدر پختہ محبت کے باوجود اپنے آپ کو مالی معاملات کی رغبت سے بچانا بہت دشوار ہو جاتا ہے، اس لیے کہ انتھک محنت اور کاوش سے وسائل روزی ورزق کمانے کے بعد اکثر و بیشتر افراد یہ سمجھ بیٹھتے ہیں کہ یہ انکی ذاتی محنت و ذہانت کے بل بوتے پر انہیں حاصل ہوا ہے لہذا وہ بلا شرکت غیرے اس مال کے مالک و مختار ہیں۔ پس اس مال میں تصرف اور استعمال کا حق صرف انہی کو ہے۔ اپنی کمائی میں سے فقراء و مساکین کو اپنی مرضی سے کچھ عطا کر دیں تو یہ ان کی اپنی شرافت و بزرگی ہے ورنہ قدرت نے تو اکتساب مال کی صلاحیتیں سبھی لوگوں کو دی ہیں لہذا باقی لوگ بھی محنت کریں اور اپنی صلاحیتوں کا استعمال کر کے اپنی روزی خود کمائیں۔ اس طرح کے حالات میں یہ دولت مند حضرات اگر ان فقراء و غرباء کی ازراہ ہمدردی کوئی مدد کر دیں تو یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے وگرنہ کوئی ان سے باز پرس نہیں کر سکتا۔

مگر اسلامی روایات اس طرح کی فسطائی ذہنیت کی حوصلہ شکنی اور نفی کرتی ہیں کہ ان کا کمایا ہوا سبھی مال بلا شرکت غیرے صرف انہی کا ہے اور کوئی اس حوالے سے پرسش بھی نہیں کر سکتا۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق مال و دولت کو فقراء و غرباء میں تقسیم کرنا کسی شخص کی ذاتی پسند و نا پسند اور مرضی (Choice) کا نام نہیں ہے بلکہ ان تعلیمات کے تناظر میں اس وقت تک کامیابی اور خیر کسی بندے تک پہنچ ہی نہیں سکتی مگر یہ کہ وہ اپنی پسندیدہ ترین چیزیں راہِ خدا میں اور دوسرے لوگوں کے استفادے کے لیے وقف نہ کر دے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

﴿ لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾[2]

ترجمہ: (مومنو!) جب تک تم ان چیزوں میں سے جو تمھیں عزیز ہیں (راہِ خدا میں) صرف نہ کرو گے کبھی نیکی حاصل نہ کر سکو گے اور جو چیز تم صرف کرو گے خدا اس کو جانتا ہے۔

مذکوہ وجوہات کی بنا پر ایمان باللہ والرسول کے بعد جس حکم کو بلا فاصلہ اور فوری بیان کیا ہے وہ انفاق فی سبیل اللہ کا حکم ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

---

[1] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب الرقاق، باب من بلغ ستین سنة، حدیث رقم 6421، 8/90

[2] سورۃ آل عمران: 3/92

﴿آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَأَنفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ﴾[1]

ترجمہ: خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس (مال) میں اس نے تم کو (اپنا) نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور (مال) خرچ کرتے رہے ان کے لئے بڑا ثواب ہے۔

((ان لکل امة فتنة ، و ان فتنة امتی المال))[2]

ترجمہ: تمام امتیں آزمائش سے گزری ہیں میری امت کو مال و دولت سے آزمایا جائے گا۔

تقسیم دولت کی ہر شکل اسلامی نہیں اور نہ ہی اسلام اس حق میں ہے کہ دولت کی گردش ہونی چاہیے، چاہے وہ جس انداز میں بھی وقوع پذیر ہو اور معاشرے کے جن مرضی طبقات میں گردش کرتی رہے۔ بلکہ اسلام کہتا ہے کہ جب تک معاشرے کے محروم اور مالی طور پر کمزور طبقے تک تقسیم و گردش دولت کا چکر نہیں پہنچے گا اس وقت تک وہ ثمر آور نہیں ہو سکتا۔ مثلاً امراء کا طبقہ خود ایک دوسرے کو ہی اگر تحفے تحائف یا دیگر مالی تبادلے کرتے رہیں تو اس سے معاشرے کی خوش حالی کے رستے ہرگز نہیں کھل سکتے، لہذا اسلامی نکتہ نگاہ سے گردش دولت معاشرے کے نچلے طبقے تک جانی چاہیے۔

اسلام کے مطابق رزق اللہ کریم کا پیدا کردہ ہے اور اسی کے حکم اور منشا کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ اور رزق تقسیم کرنے کی ذمہ داری اس نے اپنے ذمہ لی ہے۔ لہذا وہ خود ہی رزق کی وسعت و تنگی کو بمصلحت عطا کرتا ہے۔ اگر کوئی اس کے دیے گئے رزق سے محروم و مجبور افراد کو کچھ دے تو وہ اس کا عوض ادا کرنے اور اس کو کئی گنا بڑھا دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس طرح محروم لوگوں کو عطا کرنے سے مال کی تقسیم و گردش عمل میں آتی ہے جب کہ صاحب انفاق افراد کو جو اضافہ اور بڑھوتری من جانب اللہ ملتی ہے اس کے سبب پوری مخلوقات پر اللہ کی عطا کردہ رحمت و برکت پھیل جاتی ہے۔ ارشاد پروردگار ہے:

﴿قُلْ إِنَّ رَبِّي يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَهُ وَمَا أَنفَقْتُم مِّن شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ وَهُوَ خَيْرُ الرَّازِقِينَ ﴾[3]

---

[1] سورۃ الحدید: 7/57

[2] مسند احمد بن حنبل، امام احمد ابن حنبل، حدیث رقم 17471، 15/29

[3] سورۃ سبا: 34/39

ترجمہ: کہہ دو کہ میرا پروردگار اپنے بندوں میں سے جس کے لئے چاہتا ہے روزی فراخ کردیتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے اور تم جو چیز خرچ کرو گے وہ اس کا (تمہیں) عوض دے گا۔ اور وہ سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔

ایک اور جگہ اللہ کی راہ میں انفاق اور خرچ کرنے والے افراد کو سات گنا عطا کرنے کا وعدہ فرمایا۔ ان کی مثال ایک سنبلہ سے دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿مَّثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّئَةُ حَبَّةٍ وَاللهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاء وَاللهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾[1]

ترجمہ: جو لوگ اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان (کے مال) کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں اور خدا جس (کے مال) کو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔ وہ بڑی کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

اسلام نے جہاں لوگوں کو مال و دولت کے انفاق کی طرف رغبت دلائی ہے وہیں ان لوگوں کی صریحا مذمت بھی کی جو تقسیم دولت کے رستے میں رکاوٹ ہیں۔ اور بڑی وضاحت سے اس بات کو بیان کیا کہ وہ لوگ اس لیے دولت کی تقسیم و گردش کی راہ میں رکاوٹ ہیں تاکہ ان کا تسلط معاشرے پر برقرار رہے اور کوئی ان کی برابری تک کبھی نہ آسکے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾[2]

ترجمہ: اور خدا نے رزق (و دولت) میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو جن لوگوں کو فضیلت دی ہے وہ اپنا رزق اپنے مملوکوں کو تو دے ڈالنے والے ہیں نہیں کہ سب اس میں برابر ہو جائیں۔ تو کیا یہ لوگ نعمت الہیٰ کے منکر ہیں۔

اسلام چونکہ مال و دولت کی طرف نہایت زیادہ رغبت پانے والی فطرتِ انسانی سے آگاہ تھا۔ اس لیے یہاں اس چیز کا سد باب شروع ہیں میں کر دیا گیا کہ اگر مال نہ ہو تو اس صورت میں کس طرح قناعت و شکر گزاری والی زندگی کے لیے کوشش کرنی ہے

[1] سورۃ البقرۃ:261/2

[2] سورۃ النحل:71/16

اور اگر ذات حق تعالی کی طرف سے مال و دولت کی کثرت عطا ہوتی ہے تو پھر کس طرح اس کو فی سبیل اللہ جیسے موارد میں نچھاور کرنا ہے۔ حضرت عمرو ابن عوف روایت کرتے ہیں کہ جب ابو عبیدہ جراح بحرین سے جزیہ کا مال لے کر آئے اور نماز صبح کے بعد جب رسول خداؐ گھر جانے لگے مگر اپنے اصحاب کو جزیہ کا مال آ جانے کی وجہ سے اپنی طرف مائل پایا تو آپؐ نے تبسم فرمایا اور ان سے مخاطب ہو کر کہا:

((فأبشروا وأملوا ما يسركم، فوالله لا الفقر أخشى عليكم، ولكن أخشى عليكم أن تبسط عليكم الدنيا كما بسطت على من كان قبلكم، فتنافسوها كما تنافسوها، وتهلككم كما أهلكتهم))[1]

ترجمہ: خوش ہو جاؤ اور امید باندھ لو اس چیز کی جس نے تمہیں خوش کر دیا ہے (یعنی مالِ جزیہ)، خدا کی قسم مجھے تم لوگوں کی نسبت فقر و غربت کا ڈر نہیں ہے، لیکن مجھے تم لوگوں کی نسبت یہ ڈر ہے کہ کہیں تم لوگوں پر دنیا اس طرح غلبہ نہ پالے جیسا کہ اس نے تم سے پہلوں پر پالیا تھا۔ کہیں تم بھی پہلوں کی طرح اس کے مقابلے میں آؤ اور ان کی طرح ہلاک نہ ہو جاؤ جیسا کہ وہ اس کی وجہ سے ہلاک ہو گئے تھے۔

اسلام نے مال و دولت کے امتحان کو عبد مومن کے لیے زیاہ مشکل قرار دیا بنسبت غربت کے امتحان کے۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مال تو آ جائے مگر اس کے حقوق کی ادائیگی کے حوالے سے سستی کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اور روایات نبی اکرمؐ میں بارہا اور جا بجا انفاق فی سبیل اللہ اور سائلیں، محرومین اور غارمین وغیرہ جیسے مصارف میں مال و دولت کو استعمال کرنے اور اس بہت بڑے امتحان سے سرخرو ہونے کی بار بار تلقین ہوئی ہے۔

خلاصہ کلام

1 انسان جو کچھ بھی اپنی محنت و مشقت سے کماتا ہے وہ اس سب کچھ کا بلا شرکت غیرے مالک نہیں ہوتا بلکہ جو بھی اس کی ضرورت سے زائد ہو تو اسلام نے اس مال میں اس کو امین ٹھہرایا ہے اور یہ اسکا فرض بھی ہے اور امتحان بھی کہ وہ زائد بر ضرورت مال کا ایک خاص حصہ محرومین، مستحقین اور مجبور و مقہور لوگوں تک کس طرح اور کس انداز میں پہنچاتا ہے اور ان تک پہنچاتا بھی ہے یا نہیں۔ یہی دار اصل اس کا امتحان و اختبار ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب الجزیہ، باب الجزیہ والموادعہ، حدیث رقم 3158، 4/96

2 اسلام میں اچھائی، بھلائی، کامیابی اور خیر کا حصول اس بات پر موقوف ہے کہ انسان اپنی عزیز ترین اور پسندیدہ ترین چیز یعنی مال، جس پر خدا نے اس کو اپنا نائب اور امین بنایا ہے، اپنے قرابتداروں، یتیموں اور حاجتمندوں وغیرہ پر خرچ کرے۔ اس انفاق کے بدلے اس کے لیے بلند ترین درجات، بہترین عوض اور اعلی ترین ثواب کے میزان مقرر کیے گئے ہیں۔

3 تقسیم دولت کے اصول کی راہ میں حائل لوگوں کو ناپسندیدہ اور گناہگار افراد کہا گیا ہے۔ انکو بتلایا گیا ہے کہ مال و دولت ان کے امتحان کی خاطر ان کو عطا ہوا ہے، لہذا آگاہ رہیں کہ کہیں اس کو اپنی برتری اور عظمت کی وجہ اور معاشرے میں اپنے تسلط و اجارہ داری کا سبب نہ بنا بیٹھیں۔

اقتصاد واعتدال کا حکم

اسلام تقسیم دولت اور اس کی گردش کا حامی و داعی ہے۔ لیکن اس معاملے میں وہ کمائی گئی دولت کو ہر جائز و ناجائز کام میں اڑا دینے کا قائل نہیں بلکہ قرآن مجید اور تمام احکام اسلامی اس بات کی شدید مذمت کرتے ہیں کہ دولت کو بے مقصد اور فضول کاموں میں استعمال کیا جائے حتی کہ صحیح اور جائز کاموں میں بھی اس کو حد سے زیادہ خرچ کرنا ناپسندیدہ ہے۔

جب صحابی رسول کعب انصاری نے اپنا تمام مال فی سبیل اللہ انفاق کرنے کا ارادہ کیا خاتم المرسلین نے ان سے فرمایا:

((أَمْسِكْ عَلَيْكَ بَعْضَ مَالِكَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ))[1]

ترجمہ: اپنا کچھ مال اپنے پاس رکھ لو، یہی تمہارے حق میں بہترین ہے۔

یعنی سب کا سب مال اللہ کی راہ میں نہ دو بلکہ اس میں سے کچھ اپنی ضروریات کے لیے بچا لو۔ یوں آپؐ نے مالی امور میں یہاں تک کہ صدقہ جیسے کام میں بھی اعتدال کی روش اپنانے پر زور دیا۔

ان تعلیمات کا منشا یہ ہے کہ افراد کو اپنے اخراجات میں میانہ روی اور اعتدال و اقتصاد اپنانے پر مائل کیا جائے تا کہ غلط سلط کاموں بلکہ یہاں تک کہ نیکی کے امور میں بھی بے قید و بند دولت کا استعمال ہونے کی وجہ سے اس کے توازن کے عمل کو بگڑنے سے بچایا جا سکے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہوتا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ وَالنَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا أُكُلُهُ وَالزَّيْتُونَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا وَغَيْرَ مُتَشَابِهٍ كُلُوا مِن ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾[2]

ترجمہ: اور وا ہی تو ہے جس نے باغ پیدا کئے چھتریوں پر چڑھائے ہوئے بھی اور جو چھتریوں پر نہیں چڑھائے ہوئے وہ بھی اور کھجور اور کھیتی جن کے طرح طرح کے پھل ہوتے ہیں اور زیتون اور انار جو (بعض باتوں میں) ایک دوسرے سے ملتے ہیں جب یہ چیزیں پھلیں تو ان کے پھل کھاؤ اور جس دن (پھل توڑو اور کھیتی) کاٹو تو خدا کا حق بھی اس میں سے ادا کرو اور بے جانہ اڑاؤ کہ خدا بیجا اڑانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

---

[1] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب الزکاۃ، باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی، 112/2

[2] سورۃ الانعام: 141/6

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ﴾[1]

ترجمہ: ور فضول خرچی سے مال نہ اُڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں۔

خداوند متعال کی نعمتوں کو اپنے بھرپور استعمال میں لانا اور ان سے استفادہ کرنا ممدوح اور انتہائی پسندیدہ عمل ہے لیکن اس میں کسی قسم کی سرکشی اور بغاوت یا ان چیزوں کا بے جا استعمال ہرگز جائز نہیں قرار دیا گیا۔ بلکہ ایسے لوگوں کے بارے میں سخت وعید کی صورت میں ارشاد فرمایا:

﴿كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِي وَمَن يَحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِي فَقَدْ هَوَىٰ﴾[2]

ترجمہ: جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں ان کو کھاؤ۔ اور اس میں حد سے نہ نکلنا۔ ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہو گا۔ اور جس پر میرا غضب نازل ہوا وہ ہلاک ہو گیا۔

اس آیت میں اللہ کے دیے گئے رزق کو کھانے اور اپنے استعمال میں لانے کی مکمل اجازت دی گئی ہے البتہ اس میں ایک شرط لگائی گئی ہے کہ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ-

اس لفظ کے معانی بیان کرتے ہوئے علامہ آلوسی تحریر کرتے ہیں کہ:

"وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ أي فيما رزقناكم بالإخلال بشكره وتعدي حدود الله تعالى فيه بالسرف والبطر والاستعانة به على معاصي الله تعالى ومنع الحقوق الواجبة فيه"[3]

ترجمہ: "اور میری حد سے نہ نکلنا" کے معانی یہ ہیں کہ اللہ کے عطا کردہ رزق میں اس کی ناشکری نہ کرو اور اس مال کے صرف و خرچ کے حوالے سے اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہ کرو، اس مال سے معصیت پروردگار والے اُمور میں استعانت اور مدد مت لو۔ اور اس مال پر واجب حقوق کو مت روکو۔

---

[1] سورۃ الاسراء: 17/ 27،26

[2] سورۃ طہٰ: 20/ 81

[3] روح المعانی، علامہ آلوسی، 8/ 550

یہ اسراف و تبذیر کی وہ روش ہے جس کو اسلام نے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔یعنی کسی بھی جگہ اور کسی بھی مقام پر کیفیتاً یا کمیتاً مال و دولت کو حد سے بڑھ کر خرچ کرنا۔ البتہ اسلام جائز اور ضروری مواقع پر بخل اور کنجوسی کو بھی اسی طرح ناپسند کرتا ہے جس طرح اسراف و تبذیر کو۔ چنانچہ اس روش کی بھی اتنی ہی سرزنش کی ہے جتنی فضول خرچی کی۔ چنانچہ اس طرح کا رویہ رکھنے والوں کو خبردار کیا کہ بخل کے ذریعے اپنی رقم اور پیسہ بچا لینے والے اور واجبات کو ادا نہ کرنے والے اور اپنے مالی حقوق کی عدم ادائیگی والے لوگ اس خوش فہمی میں نہ رہیں کہ اس طرح وہ اپنا پیسہ بچا لیں گے اور اس کو کئی گنا کرتے جائیں گے بلکہ ایسا کرنا ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔

بخل سے کام لینے والوں کو اور اپنے مالی واجبات ادا نہ کرنے والوں کو قرآن مجید میں مخاطب کر کے فرمایا:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ﴾[1]

ترجمہ: جو لوگ مال میں جو خدا نے اپنے فضل سے ان کو عطا فرمایا ہے بخل کرتے ہیں وہ اس بخل کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں۔(وہ اچھا نہیں) بلکہ ان کے لئے برا ہے وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔

ایک اور جگہ مال کو جمع کرنے والوں اور پھر اس کے خرچ میں رکاوٹ بننے والوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿الَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾[2]

ترجمہ:اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو خدا کے رستے میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو اس دن عذاب الیم کی خبر سنا دو۔

ان تمام آیات کی روشنی میں معلوم ہوا کہ اسلام کی نگاہ میں کنجوسی و بخل اور فضول خرچی یا اسراف و تبذیر، سبھی رویے نامطلوب اور ناپسندیدہ ہیں۔ اسلامی معاشی اصولوں کے مطابق بہترین رستہ درمیانہ یعنی اعتدال کا راستہ ہے، یعنی نہ ہی کنجوسی اور نہ پیسے کو پانی کی طرح بہایا جائے۔ انسان اپنے نفس پر، اپنے متعلقین اور اہلخانہ پر نیز اللہ کے بتلائے گئے تمام رستوں پر اپنی استطاعت اور حیثیت کے مطابق خرچ کرے جس کا تعین اسلامی احکام میں ہوا ہے۔

---

[1] سورۃ آل عمران:3/180

[2] سورۃ التوبہ:9/34

کلام الٰہی ہے کہ:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾[1]

ترجمہ: اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کرلو (کہ کسی کچھ دو ہی نہیں) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سبھی دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔

رسول خداؐ سے منقول ایک حدیث میں اقتصاد یعنی میانہ روی کو نصف المعیشہ کہا گیا ہے۔ آپؐ کا ارشاد گرامی ہے:

((الاقتصاد في النفقة نصف المعيشة، والتودد إلى الناس نصف العقل، وحسن السؤال نصف العلم))[2]

ترجمہ: اپنے اخراجات میں میانہ روی اختیار کرنا نصف معیشت، انسانوں کے ساتھ اخوت و محبت سے پیش آنا نصف عقل اور اچھے طریقے پر سوال کرنا نصف علم ہے۔

مال و دولت کے صرف و خرچ کے حوالے سے اسلامی نکتہ نظر یہ ہے کہ اپنے مال و دولت کو نہ تو الٹے تلّلے کاموں میں اڑا کر فضول میں ضائع کیا جائے اور نہ ہی دنیا کی حرص و لالچ میں مبتلا ہو کر پیسے کا بندہ بن جانا اور مال پر مال اکٹھا کرنا ٹھیک ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ مال و دولت کو اپنی اخروی زندگی کے لیے وسیلہ بنایا جائے اور اس کے ذریعہ آخرت کی زندگی کی کامیابی اور فلاح کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ البتہ اسلام دنیا میں رہ دنیاوی ضروریات اور حاجات دنیا کو اپنی جائز حد میں رہتے ہوئے پورا کرنے کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد پروردگار ہے:

﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾[3]

ترجمہ: اور جو (مال) تم کو خدا نے عطا فرمایا ہے اس سے آخرت کی بھلائی طلب کیجئے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلایئے اور جیسی خدا نے تم سے بھلائی کی ہے (ویسی) تم بھی (لوگوں سے) بھلائی کرو۔

نتیجہ کلام گزشتہ آیات و روایات کی روشنی میں درج ذیل نکات کا استفادہ ہوتا ہے۔

---

[1] سورۃ الاسراء: 17/29

[2] کنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، علاء الدين علي بن حسام الدين القادری، مؤسسۃ الرسالۃ، طبع خامسہ 1981، حدیث رقم 5434، ص 3/49

[3] سورۃ القصص: 28/77

1 اسلام مال و دولت کو بے جا اور الے تللے کاموں میں اڑانے، بے جا خرچ کرنے اور فضول خرچی کرنے سے منع فرماتا ہے، اور ایسا کرنے والوں کو شیطان کا بھائی قرار دیتا ہے۔

2 فضول خرچی چاہیے کمیت میں ہو یا کیفیت میں ہر دو شکل میں مذموم ہے۔یعنی چاہے دولت کو غیر ضروری کاموں پر خرچ کیا جائے یا ضروری مواقع پر غیر ضروری اخراجات کیے جائیں دونوں ہی قابل مذمت و نفرت ہیں اور دونوں سے اجتناب کرنے کا حکم ہوا ہے۔

3 اسلام صرف و خرچ کے معاملے میں بخل و کنجوسی کے رویے کو بھی ناپسند کرتا ہے اور مال و دولت جمع کرنے والوں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے والوں کو سخت عذاب کی وعید سناتا ہے۔

4 کنجوسی و بخل ہو یا فضول خرچی و اسراف و تبذیر، یہ سبھی رویے اسلام کی نظر میں ناپسندیدہ اور نامطلوب ہیں۔اور اس کی نظر میں پسندیدہ رستہ اعتدال و میانہ روی یعنی اقتصاد کا راستہ ہے۔

اسلام میں تقسیم دولت کے مختلف اشکال و اسلوب

کسی بھی نظام معیشت میں کسبِ معاش کے بعد صرف و خرچ کے موقع و محل اور مقام پر بنیادی طور پر یہ تین نکات و سوالات زیر بحث آتے ہیں۔یہ تینوں سوالات صرف سوالات کی حد تک ہی نہیں بلکہ یہ در حقیقت دولت کی گردش و تقسیم کے تین مرحلے ہیں کہ جن مراحل سے گزر کر ہی تقسیم دولت کا عمل مکمل ہوتا ہے۔یہ مراحل درج ذیل ہیں:

1 کیا خرچ کیا جائے؟

2 کہاں خرچ کیا جائے یا کن چیزوں پر خرچ کیا جائے؟

3 کس قدر اور کتنا خرچ کیا جائے؟

یہ تینوں نکات کسی بھی معاشی فکر کے تقسیمِ دولت کے نظریے اور مختلف اشکال و اسالیب کو واضح کرتے ہیں۔اسلامی معاشی فکر ان تینوں مراحل کی مکمل تفسیر و تشریح کو بیان کرتی ہے۔جس کا مختصر تعارف یوں ہے۔

پہلا مرحلہ

تقسیم دولت کے سلسلے میں جو پہلا مرحلہ پیش آتا ہے وہ یہ کہ کون کونسی چیزیں یا کون سی اشیاء خرچ کی جائیں۔اس موقع و محل پر اسلام جداگانہ، ممتاز اور مختلف موقف پیش کرتا ہے۔اسلامی معاشی اصولوں کی روشنی میں جب بھی کسی چیز کو خرچ کیا جانے لگے، چاہے وہ اپنی ذات پر خرچ کی جارہی ہو یا ہو یا فی سبیل اللہ کے کسی مورد میں، تو سب سے پہلے اس کی طہارت و پاکیزگی کا یقین کر

لینا ضروری ہے۔یعنی جو چیز بھی استعمال یا خرچ کی جا رہی ہو اس سے پہلے یہ بات جان لینا ضروری ہے کہ خرچ کی جانے والی چیز یا روپے پیسے کو حلال طریقے سے کمایا گیا ہے یا نہیں اور اس کی پاکیزگی کی ضمانت کیا ہے۔ اپنی استعمال یا خرچ کی جانے والی چیزوں کو دو زاویوں سے پرکھ لینا ضروری ہے، پہلا یہ کہ جو کچھ زیر استعمال ہے وہ "حلال" ہو، اور جس طریقے سے اس کو حاصل کیا گیا ہے وہ "طیب"یعنی پاک و پاکیزہ اور اجازت دیا گیا ہو۔[1]

ایک اور جگہ انبیاء کرام بالخصوص سید الانبیاء کے وظائف کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ وہ پاک چیزوں کو ان کے لیے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔[2]

فی سبیل اللہ یا نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کے حوالے سے کچھ لوگ اللہ کے نبی کے پاس آئے اور دریافت کیا کہ اپنی حلال کی کمائی میں سے کس قدر مال اللہ کے راہ میں انفاق کرنا مناسب اور ضروری ہے۔ان کے جواب میں قرآن مجید کی آیت نازل ہوئی جس میں ارشاد پروردگار ہوتا ہے کہ :

﴿ وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ﴾[3]

ترجمہ:لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ (راہِ خدا میں) کیا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے جو کچھ (تمہاری ضروریات سے)زائد ہو!

پس اسلامی نکتہ نظر کے مطابق جب یہ طے ہو جائے کہ مال حلال وطیب ہے تو اپنی معقول حاجتوں اور ضروری کاموں پر خرچ کر کے جو مال و دولت بچ رہے،اس کو اللہ کی خاطر انسانیت کی بھلائی اور بہتری کے لیے خرچ کرنا پسندیدہ عمل اور اسلامی معاشی تعلیمات کے عین مطابق ہے۔

دوسرا مرحلہ

دوسرے مرحلے،یعنی کس قدر اور کتنا خرچ کرنا چاہیے،کے حوالے سے اسلام خرچ کرنے کی مقدار و تعداد کی بجائے اس کی کمیت و کیفیت کو مد نظر رکھتا ہے اور ضروری قرار دیتا ہے کہ مواقعِ صرف و خرچ پر نہ تو کیفیت میں اور نہ ہی کمیت میں

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام ،حفظ الرحمن سیوہاروی، ص64

[2] سورۃالاعراف:157/7

[3] سورۃالبقرۃ:219/2

اسراف، تبذیر، بخل یا کنجوسی کا مظاہرہ عمل میں آئے۔اب چاہے کسی کی انفرادی زندگی ہو یا عائلی زندگی، یا پھر معاشرتی و اجتماعی زندگی، تمام میں ان قواعد وضوابط اور اصولوں کی پیروی کو لازم قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾[1]

ترجمہ: اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کرلو (کہ کسی کچھ دو ہی نہیں) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سبھی دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔

یوں دوسرے مرحلے میں اسلام میانہ روی، اعتدال اور اقتصاد کی روش اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔

تیسرا مرحلہ

تیسرا اور اہم مرحلہ اس چیز کے بارے میں ہے کہ اپنا مال و دولت کہاں پر اور کن کن مقامات پر خرچ کرنا ہے۔اس حوالے سے اسلام اپنی جائز اور معقول ضروریات زندگی پوری کر لینے کے بعد جو مال بچ جاتا ہے اس میں مختلف اشیاء کے مختلف نصاب بیان کرتا ہے اور پھر ان کو خرچ کرنے کے حوالے سے مختلف مدیں اور متعدد مستحقین کی نشاندہی کرتا ہے، کہ جہاں پر اس مال و دولت اور اشیاء کا استعمال کرنا ضروری اور ادا کرنا واجب ہوتا ہے۔یہی مرحلہ عملاً معاشرے میں ارتکاز دولت اور اس جیسی دیگر معاشرتی و معاشی برائیوں کی روک تھام اور ان کے خاتمے کا سبب بنتا ہے۔اس سلسلے میں اسلام نے معاشرے میں گردشِ دولت کے اضافے کے لیے اور مال و دولت کی عادلانہ ومنصفانہ تقسیم کے لیے موثر اقدامات تجویز کیے ہیں۔

یہ اقدامات دو قسم کے ہیں

1 قانونی اقدامات Legal Measure

2 اختیاری اقدامات Optional Measures

پھر قانونی اقدامات کی مزید دو قسمیں ہیں

1 اثباتی اقدامات Positive Measures

2 امتناعی اقدامات Prohibitive Measures

اثباتی اقدامات کی پھر دو قسمیں بنتی ہیں۔

1 نظام زکاۃ کا قیام، مال غنیمت اور رکاز میں خمس نکالنے کا حکم

---

[1] سورۃ الاسراء 17/ :29

2 قانون وراثت

پھر امتناعی اقدامات کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔

1 ارتکاز دولت کی ممانعت

2 سود کی حرمت

3 حرام قرار دی گئی اشیاء کے لین دین کی ممانعت

4 اسراف اور بخل کی ممانعت

5 سٹہ بازی کی ممانعت

6 غرر یعنی دھوکہ دہی کی ممانعت[1]

اختیاری اقدامات کا جہاں تک تعلق ہے تو ان کی بھی متعدد اقسام ہیں۔

1 انفاق فی سبیل اللہ

2 صدقہ

3 ایثار

[1] معیشت و اقتصاد کا اسلامی تصور، محمود احمد ظفر، ص554

فصل دوم

غریب پروری اور فقر کے خاتمے کی ترغیب و تلقین

اسلامی تعلیمات کی رو سے عقل و حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانیت کو ذاتی مفادات کی بھینٹ چڑھانے کی بجائے انسانی معاشروں میں اہل قبیلہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور دردمندی وبہی خواہی کا ثبوت دیں، اور ایک دوسرے کے نفع و نقصان کو اپنا ذاتی نفع و نقصان سمجھیں۔ اسی اصول و ضابطے کے تحت اسلام نے فرد کے بعد خاندان کی اکائی کو مضبوط کیا، پھر پڑوسیوں کے حقوق اور اہل علاقہ وہم مذہب لوگوں کے حقوق یہاں تک کہ انسانوں اور دیگر مخلوقات کے حوالے سے بھی ہم سب کو مسؤول ٹھہرایا۔ غرباء اور مستحقین کے حوالے سے خصوصی قوانین وضع فرمائے کہ وہ ذاتی منافع کی ریل پیل میں فراموش نہ کر دیے جائیں۔

اسلام نے زائد از ضرورت دولت کے جمع کرنے کو معیوب قرار دیا ہے۔ وہ کلمہ گویوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ جو کچھ مال تمہارے پاس ہے یا تو اسے اپنی ضروریات خریدنے پر صرف کرو، یا کسی جائز کاروبار میں لگاؤ، یا دوسروں کو دو کہ وہ اس سے اپنی ضروریات خریدیں اور اس طرح پوری دولت برابر گردش میں آتی رہے۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں کرتے اور جمع کرنے پر ہی اصرار کرتے ہو تو تمہاری جمع کردہ اس دولت میں سے از روئے قانون ڈھائی فیصد سالانہ رقم نکلوالی جائے گی اور اسے ان لوگوں کی اعانت پر صرف یا جائے گا جو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل نہیں، یا سعی و جدوجہد کرنے کے باوجود اپنا پورا حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں۔

البتہ اسلام نے تقسیمِ دولت کی راہ میں رکاوٹ بننے والے نیز غربت، معاشی ناہمواریوں اور دیگر معاشرتی جرائم کی وجہ بننے والے مسائل سے نبٹنے کے لیے زکوۃ کے علاوہ خمس، عشر، نذر و کفارہ، وراثت اور وقف جیسے دیگر مالی قوانین متعارف کروائے جن کی وجہ سے تقسیمِ دولت کے قوانین کو مزید جلا ملتی ہے اور معاشرے میں گردشِ دولت کے عمل کو یقینی بنانے میں مدد ملتی ہے۔ لہذا اسلام نے صاحبانِ ثروت و دولت پر کچھ خاص قیود کے ساتھ مالی حقوق واجب قرار دیے ہیں تا کہ ان کی فاضل دولت معاشرے میں کساد بازاری کا سبب بننے کی بجائے معاشی و اقتصادی ترقی کا سبب بنے اور اسی دولت سے غریب پروری اور غربت کے خاتمے کا کام لیا جاسکے۔

غریب پروری قرآن مجید کی نگاہ میں

تعلیمات اسلام کے نمایاں ترین احکامات میں سے ایک حکم غریب پروری یا محروم و مجبور اور بے آسرا لوگوں پر اللہ کی دی گئی نعمتوں کو تقسیم کرنا اور انہیں اپنے ساتھ ان میں شریک رکھنا ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنْفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِينَ فِيهِ فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَأَنْفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ﴾[1]

ترجمہ: تو) خدا پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس (مال) میں اس نے تم کو (اپنا) نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور (مال) خرچ کرتے رہے ان کے لئے بڑا ثواب ہے۔

قرآن مجید کسی بھی نیک کام میں سب لوگوں کو شمولیت کی دعوت دیتا ہے اور برے کاموں میں ان سے بچتے رہنے کا حکم صادر کرتا ہے، اور تلقین کرتا ہے کہ کہ اگر صاحب نصاب نہ ہونے کے سبب ان پر مالی واجبات ادا کرنا ضروری نہ ہو تب بھی حصولِ رضائے پروردگار کی خاطر وہ نیکی اور اچھائی کے کاموں میں حسب توفیق شریک ہوں۔ ارشاد باری تعالی ہوتا ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَان﴾[2]

ترجمہ: اور (دیکھو) نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور ظلم کی باتوں میں مدد نہ کیا کرو۔

قرآن مجید کی جتنی بھی آیات انفاق فی سبیل اللہ کے موارد کو بیان کرتی ہیں وہ سب کی سب غریب پروری پر ہی تلقین کر رہی ہیں۔ وہ اس طرح سے کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق انفاق فی سبیل اللہ کے موارد میں جو مستحقین بیان کیے گئے ہیں ان کی اکثریت مال و دولت کی قلت کا شکار اور تنگدستی و کسمپرسی میں زندگی گزارنے والے افراد ہیں۔ جیسا کہ سورہ نساء کی اس آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا﴾[3]

ترجمہ: اور خدا ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسائیوں اور اجنبی ہمسائیوں اور رفقائے پہلو (یعنی پاس بیٹھنے والوں)

---

[1] سورۃ الحدید: 57/7

[2] سورۃ المائدہ: 5/2

[3] سورۃ النساء: 4/36

اور مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو کہ خدا (احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور) تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

اس آیت میں بیان کیے گئے اکثر افراد یا تو قرابت دار ہیں یا پھر معاشرے کے محروم طبقے سے ان کا تعلق ہے۔ یوں قرآن مجید محرومین کے ساتھ احسان کرنے اور ان کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کرنے کے لیے مومنین کو ابھارتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق وہ لوگ جو مساکین، فقراء، یتیموں اور دیگر محتاجوں کے حقوق ادا نہیں کرتے قیامت کو دن سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ اور جب اس عذاب میں ان سے ان کا عذر اور اس عذاب کی وجہ کا پوچھا جائے گا تو ان کا جواب کچھ یوں ہو گا:

﴿قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ﴾[1]

ترجمہ: وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے، اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے، اور اہل باطل کے ساتھ مل کر (حق سے) انکار کرتے تھے۔

یوں غریب پروری نہ کرنے والوں اور فقراء و غرباء کا حصہ ادا نہ کرنے والوں کو ان کے عبرتناک انجام سے ڈرایا گیا ہے۔ کہ اگر ان کا جو حصہ تمہارے مال میں موجود ہے وہ ادا نہیں کرو گے تو اس جرم کی پاداش میں تمہیں جہنم رسید کر دیا جائے گا۔

یوں اللہ کی ذات پر ایمان نہ لانے اور فقیروں کو ان کا حق نہ دینے کی وجہ سے اس دن ان لوگوں کا برا حال ہو گا۔ قرآن مجید میں ان کی روداد کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد پروردگار ہے:

﴿وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ﴾[2]

ترجمہ: اور کا نامہ (اعمال) اس کے بائیں ہاتھ میں یاد جائے گا وہ کہے گا اے کاش مجھ کو میرا (اعمال) نامہ نہ دیا جاتا۔ اور مجھے معلوم نہ ہو کہ میرا حساب کیا ہے۔ اے کاش موت (ابد الآباد کے لئے میرا کام) تمام کر چکی ہوتی (آج) میر امال میرے کچھ بھی کام بھی نہ آیا۔ (ہائے) میری سلطنت خاک میں مل گئی

---

[1] سورۃ المدثر: 74/42 تا 45

[2] سورۃ الحاقہ: 69/25 تا 34

۔(حکم ہو گا کہ) اسے پکڑ لو اور طوق پہنا دو۔ پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دو۔ پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے جکڑ دو۔ یہ نہ تو خدائے جل شانہ پر ایمان لاتا تھا اور نہ فقیر کے کھانا کھلانے پر آمادہ کرتا تھا۔

غریب پروری سنت نبوی کی روشنی میں

اسلام اپنے احکامات میں خدمت خلق اور انسانیت کے دکھ درد کو بانٹنے کو خصوصی اہمیت دیتا ہے۔ صرف فقر و افلاس ہی کے مسئلے میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں انسانوں کے کام آنے و، ان کے دکھ درد میں شریک ہونے، ان کی خدمت کرنے اور انسانیت کے عزت و احترام کے لیے کام کرنے کے مسئلے کو دیگر اسلامی احکام سے کہیں زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ حدیث نبوی میں ہے:

((يَسِّروا ولا تُعسِّروا، وبشِّروا ولا تُنفِّروا)) [1]

ترجمہ: آسانیاں پیدا کرو اور مشکلات پیدا نہ کرو، لوگوں سے اچھی بات کیا کرو اور ان میں نفرت کے بیج نہ بویا کرو۔

اس کی وجہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

((المومن للمومن کالبنیان یشد بعضه بعضا و شبک بین اصابعه)) [2]

ترجمہ: مومنین آپس میں ایک جسم یا عمارت کی مانند ہیں کہ جس میں بعض حصے بعض دوسرے حصوں کے لیے سہارے کا کام کرتے ہیں۔ (آپؐ نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈالتے ہوئے ایسا فرمایا)

یعنی زندگی کا مقصد و ہدف دیگر افراد معاشرہ کو سہارا دینا اور ان کو مضبوطی فراہم کرنا ہے۔ جس طرح عمارت کی اینٹیں ، بلاکس، سیمنٹ اور بجری باہم مل کے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہیں اور بلڈنگ کی مضبوطی کا سبب بنتے ہیں اسی طرح معاشرے کا ہر گھر بلکہ ہر فرد معاشرے کو تعمیر کرتا اور اس کی مضبوطی کی وجہ بنتا ہے۔ معاشرے کی تعمیر و ترقی اس کی بلڈنگز یا سڑکوں اور پلوں سے نہیں بلکہ اس کے اخوت اور بھائی چارے سے ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کسی بھی حادثے، سانحے یا امتحان کا مل کر اور آسانی سے مقابلہ کرتے ہیں اور معاشرے کو متزلزل ہونے سے بچائے رکھتے ہیں۔

---

[1] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبی یتخولہم بالموعظۃ والعلم کی لا ینفروا، حدیث رقم 69، 1/25

[2] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب المظالم والغصب، باب نصر المظلوم، حدیث رقم 2446، 3/129

اسلام کی نظر میں مندرجہ بالا قدم ابتدائی اور بنیادی قدم ہے۔ اور جب لوگ اس راستے پر چل نکلتے ہیں تو معاشرہ ترقی اور کامیابی کرتے ہوئے اس منزل پر پہنچ جاتا ہے کہ جب افراد معاشرہ کو دوسروں کی ترقی اور کامیابی بھی ایسی ہے اچھی لگتی ہے جیسے ان کا اپنا کامیاب ہونا ان کے لیے مسرت کا باعث بنتا ہے۔ چنانچہ وہ دوسروں کی کامیابی و اچھائی کے لیے ویسے ہی کوشاں نظر آنے لگتے ہیں جیسے اپنے ذاتی مفادات کے لیے وہ جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔

اسلام اپنے ماننے والوں کو ایک دوسرے کی مشکلات میں کام آنے اور ہاتھ بٹانے کی تاکید کرتا ہے۔ چاہے وہ مشکل غربت وافلاس کی شکل میں ہو یا کسی بھی اور شکل میں۔ چنانچہ حضرت ابو موسی اشعری روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

((أَطْعِمُوا الْجَائِعَ وَفُكُّوا الْعَانِيَ وَعُودُوا الْمَرِيض))[1]

ترجمہ: بھوکے کو کھانا کھلاؤ، تکلیف والے انسان کی مشکل کو رفع کرو اور مریض کی عیادت کرو

البتہ اسلامی اخوت اور بھائی چارے کا باب یہاں پر بھی ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے اگلے درجے اور مرتبے کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو کہ ایثار اور قربانی کا مرحلہ ہے۔ ایثار کا مرتبہ یہ ہے کہ اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر اپنے دینی بھائیوں کی ضروریات کو فوقیت دینا اور ضرورت کے باوجود اپنی اشیاء دوسروں کے حوالے کر دینا۔

سید قطب غرباء کے ساتھ کیے جانے والے ایثار کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”وهذا علي – رضي الله عنه – وأهل بيته يتصدَّقون بثلاثة أرغفة مِن سويق كانت لهم، على مسكين ويتيم وأسير، ثم يَبيتون على الطوى، وقد شبع المسكين واليتيم والأسير“[2]

ترجمہ: یہ علی مرتضی اور ان کے اہل خانہ ہیں جو اپنے حصے کی تین روٹیاں مسکین یتیم اور اسیر کو صدقہ کر دیتے ہیں اور ان کی بھوک مٹا کر خود بھوکے سو جاتے ہیں۔

قرآن مجید رحمۃ اللعالمین کے اصحاب کے ایثار و قربانی کے وصف کو واشگاف الفاظ میں بیان کرتا ہے کہ اور کہتا ہے کہ:

﴿وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِن قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾[3]

---

[1] مسند ابو داؤد، امام ابو داؤد طیالسی، حدیث رقم 491، 1/394

[2] العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام، سید قطب، دار الشروق، قاہرہ، 1395ھ، ص: 197و198

[3] سورۃ الحشر: 59/9

ترجمہ: اور (ان لوگوں کے لئے بھی) جو مہاجرین سے پہلے (ہجرت کے) گھر (یعنی مدینے) میں مقیم اور ایمان میں (مستقل) رہے (اور) جو لوگ ہجرت کر کے ان کے پاس آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہش (اور خلش) نہیں پاتے اور ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔ اور جو شخص حرص نفس سے بچا لیا گیا تو ایسے لوگ مراد پانے والے ہیں۔

اسلام میں اپنی جانوں پر دوسروں کو مقدم جاننے والے تعاونِ باہمی کے اس نظریے میں مادی و روحانی ہر دو طرح کا تعاون شامل ہے۔ یعنی جس طرح دوسروں کی مالی امداد اور امور دنیا میں تعاون کی تاکید کی گئی بعینہ لوگوں کو ساتھ ان کے روحانی اور معنوی مسائل میں تعاون کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ جس کا ثبوت اسلامی تعلیمات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے عنوان کی موجودگی ہے۔

تعاون و امدادِ باہمی کے ان دونوں شعبوں کے بارے میں شیخ محمود شلتوت لکھتے ہیں کہ:

"بَيْدَ أننا نؤكد – مرة أخرى – على حقيقة شمولية التكافل الاجتماعي في الإسلام للجوانب المادية والروحية؛ لأنه في النهاية يَعني شعور الجميع بمسؤولية بعضهم على بعض، وأن كل واحد منهم حامل لتبعات أخيه ومحمول على أخيه، ويُسأل عن نفسه، ويُسأل عن غيره"[1]

ترجمہ: ہم ایک بار پھر تاکید کرتے ہیں کہ اسلام میں تکافل اجتماعی کا مفہوم، روحانی و مادی ہر دو قسم کے تعاون اور امداد کو شامل ہے۔ جس کا ہدف یہ ہے کہ پورے معاشرے کو یہ شعور دیا جائے کہ وہ سب ایک دوسرے کے حوالے سے مسئول ہیں۔ پس ان میں سے ہر کوئی اپنے دیگر بھائیوں کا بوجھ بھی اٹھائے ہوئے ہے، پس اس سے جب اپنی ذات کے بارے میں سوال ہو گا تو اپنے دینی بھائیوں کے حقوق کی ادائیگی کے بارے بھی پوچھا جائے گا۔

پس اسلام میں باہمی اخوت و ایثار کا نظریہ دو شعبوں پر مشتمل ہوا۔

(i) مادی تعاون

---

[1] الاسلام عقیدۃ وشریعۃ، شیخ محمود شلتوت، دار القلم، مصر، طبع ثالثۃ 1966، ص444

(ii) روحانی و معنوی تعاون

تکافل کا پہلا شعبہ مادی شعبہ ہے۔ اور اس شعبہ کا مقصد کسی محتاج کے ہاتھ کو پکڑ کر اس کی احتیاج کو ختم کرنا، کسی پریشان حال کی احوال پرسی، کسی مشکل میں گھرے کی مدد، کسی خوف زدہ کی ڈھارس، کسی بھوکے کی بھوک مٹانا اور معاشرے کے مصالح عامہ کے لیے عملاً پیش پیش رہ کر اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ اس طرح کے مادی تعاون کے لیے اسلام نے مختلف عنوان اور نام دیے ہیں جو کہ ان مسائل کے حل اور امداد باہمی کے مختلف انواع پر مشتمل ہیں۔ مثلاً احسان، زکاۃ، صدقہ، انفاق فی سبیل اللہ، یتیم کی کفالت اور رشتہ داروں سے صلہ رحمی وغیرہ۔ لیکن تکافل کے ان سبھی عناوین کا دائرہ کار اجتماعی زندگی کے مالی و مادی معاملات کی تکمیل کرنا ہے۔

دوسرا شعبہ، ادبی شعبہ ہے جس سے مراد تمام انسانیت کے ساتھ (فقط محرومین و مجبور افراد سے نہیں بلکہ پوری انسانیت سے) امداد باہمی اور ان کے ساتھ معنوی تعاون ہے۔ تمام لوگوں کے ساتھ تعلیم، اچھی باتوں کی تلقین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر جیسے افعال میں قولاً و فعلاً تعاون کرنا ہے۔ اسلام تکافل کی اس شکل کو تمام مسلمانوں پر لازمی قرار دیتا ہے، بلکہ نبی کریمؐ کی زبان مبارک سے یہ بھی وارد ہوا ہے کہ تمام لوگوں کی نسبت دین کا لب لباب یہی چیز ہے۔

اسلام صاحبانِ ثروت کو غریب افراد کی مدد و امداد پر ابھارتا اور غریبوں کو ان کی ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ اگر وہ اپنی اس ذمہ داری سے منہ موڑ لیں تو اس کے متبادل کا بھی بندوبست کرتا ہے تاکہ غریب لوگ بھوک کا ہاتھوں ہلاک نہ ہو جائیں۔ امیروں کے اپنے کام کی ذمہ داری نبھانے سے غافل ہونے کی صورت میں کون سے متبادل موجود ہیں۔

اگر حالات و واقعات ایسے ہوں کہ نہ تو دولت مند افراد اور نہ ہی سلطان غرباء کے نان و نفقہ اور ضروریات کو پورا کر رہے ہوں تو ایسی حالت میں یہ لوگ مضطر کہلائیں گے۔ علامہ ابن حزم اپنی کتاب المحلی میں رقم طراز ہیں کہ ایسے حالات میں ان لوگوں کے پاس ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ:

> **"ولا يحل لمسلم مُضطر أن يأكل ميتة أو لحم خنزير وهو يجد طعامًا فيه فضل على صاحبه لمسلم أو لذمي؛ لأنه فرض على صاحب الطعام إطعام الجائع، فإذا كان ذلك كذلك، فليس بمُضطر إلى الميتة ولا إلى لحم الخنزير، وله أن يقاتل عن ذلك، فإن قتل المانع فالى لعنة الله لانه منع حقا وهو طائفة باغية "**[1]

---

[1] المحلی بالآثار، ابن حزم، مسئلہ 725، 4/284

ترجمہ: کسی مضطر اور مجبور انسان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مردار یا خنزیر کا گوشت کھائے درحالانکہ اس کے قرب میں ہی کسی مسلمان یا ذمی کے پاس فاضل مقدار میں کھانا موجود ہو۔ چونکہ صاحب طعام پر بھوکے کو کھانا کھلانا اور اس کی غذائی ضروریات کا خیال رکھنا واجب ہے لہذا کھانا نہ رکھنے والا مردار یا خنزیر کھانے پر مجبور نہیں سمجھا جائے گا۔ اگر ان حالات میں صاحب طعام اس کو طعام دینے سے مانع ہو تو اس بھوکے فرد کا قتال کرنا بھی جائز ہے، اور اس قتال میں صاحب طعام کی موت واقع ہو جائے تو وہ اللہ کی لعنت کا مستحق ہوا، چونکہ وہ حق سے مانع ہوا اور ایسے لوگ باغی لوگ ہیں۔

اسلام ضروریات زندگی کے کافی ووافی ہونے کا قائل ہے کہ جہاں تک وسائل کا تعلق ہے ان میں کوئی کمی نہیں مسئلہ ان کی تقسیم کا ہے۔ پس اگر ہر علاقے اور منطقے کے امیر لوگ اپنی فاضل اور بچی ہوئی دولت سے صرف اپنے علاقے کے محرومین کی نگہداشت کریں تو دنیا میں شاید ہی کوئی جگہ ایسی بچے جہاں ضرورت مند افراد وسائل زندگی کو ترس جائیں اور بھوک کی وجہ سے خودکشیاں کرنے لگیں یا اپنی اولادوں کو اپنے ہی ہاتھوں مار دیں۔

سیرت نبوی کے اس واقعہ سے فقط سفر والے کاروان کی مشکلات اور تکالیف کے دور ہونے کا بیان کرنا ہی مقصود نہیں ہے، بلکہ یہ واقعہ وسیع تر تناظر میں نظر آتا ہے کہ اگر دنیا کے صاحبِ حیثیت و ثروت افراد اور دنیاوی نعمتوں کے مالک لوگ اپنے مال و ثروت اور دیگر اشیاء میں محروموں اور محتاجوں کو شامل کرنا شروع کر دیں اور ان کی احوال پرسی کی عادت اپنا لیں اور ان کی ضروریات کو اپنے فاضل مال سے پورا کرنے کی کوشش کریں تو فقر کے مسئلہ سے نبٹا جا سکتا ہے۔

حضرت عمر کے نزدیک کسی بھی جگہ فقراء و غرباء کی مسکنت کی وجہ وہاں کے امراء ہوتے ہیں۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ:

”لَوْ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْتُ لَأَخَذْتُ فُضُولَ أَمْوَالِ الْأَغْنِيَاءِ فَقَسَّمْتُهَا عَلَى فُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ؟ هَذَا إِسْنَادٌ فِي غَايَةِ الصِّحَّةِ وَالْجَلَالَةِ“[1]

ترجمہ: اگر میرے لیے ممکن ہوتا تو میں امیروں سے ان کا فاضل مال لے کر غرباء مہاجرین میں تقسیم کر دیتا۔

[1] تاریخ الرسل والملوک (المعروف بہ تاریخ الطبري)، محمد ابن جریر الطبری، دار التراث، بیروت، طبع ثانیہ 1387ھ، 4/226

غریب پروری کا ایک اور درجہ بھی ہے جس کا عملی مظاہر اصحاب صفہ کے مسئلے میں دیکھنے میں آتا ہے اور وہ یہ کہ کسی کے پاس فالتو مال و دولت تو نہ ہو لیکن دستیاب وسائل کو آپس میں بانٹ لیا جائے اور یوں غربت و محرومی کو معاشرے سے باہر نکال کیا جائے۔ حضرت عبد الرحمن بن ابو بکر روایت کرتے ہیں کہ:

أَنَّ أَصْحَابَ الصُّفَّةِ كَانُوا أُنَاسًا فُقَرَاءَ، وَأَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَرَّةً: ((مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ اثْنَيْنِ، فَلْيَذْهَبْ بِثَالِثٍ. مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ أَرْبَعَةٍ، فَلْيَذْهَبْ بِخَامِسٍ بِسَادِسٍ))[1]

ترجمہ: اصحاب صفہ غریب اور فقراء لوگ تھے، ایک مرتبہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: جس کے گھر میں دو لوگوں کا کھانا ہے وہ تیسرا فرد (یعنی اصحاب صفہ میں سے ایک شخص کو) اپنے ساتھ لے جائے، اور جس کے گھر میں چار لوگوں کا کھانا ہے وہ چوتھا پانچواں آدمی اپنے ساتھ لے جائے۔

یعنی غرباء پروری کی مثال قائم کی جارہی تھی کہ جو کھانا دو افراد سیر ہو کر کھاتے ہیں وہ تین افراد کی بھوک مٹانے کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔ لہذا اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم سب سیر ہو کر کھانے کی بجائے اپنی بھوک مٹانے کی حد تک کھانے کو ترجیح دو اور اپنے تنگدست اور غریب و بھوکے مومن بھائیوں کو اپنے ساتھ شریک کرلو۔

امداد باہمی کی مختلف شکلیں

اسلامی احکامات انفرادی و اجتماعی دونوں طرح کی ذمہ داریوں پر مشتمل ہیں۔ دراصل یہ احکام انفرادی سطح پر کچھ امور کو انجام دینے پھر معاشرتی سطح پر رہنے اور معاشرے کے حق میں اپنا مثبت کردار ادا کرنے کا درس دیتے ہیں۔ اسلامی نکتہ نظر سے کسی بھی شخص کو صرف اپنی ذات ہی کو نکتہ التفات نہیں قرار دینا چاہیے بلکہ اس کا خاندان، محلہ، پڑوسی، گاؤں اور شہر والے یہاں تک کہ جس معاشرے میں وہ زندگی گزارتا ہے ان سب لوگوں کا اس پر حق عائد ہوتا ہے لہذا اگر ان میں سے کوئی بھی کسی مشکل یا پریشانی میں گھر جائے تو معاشرے کے تمام افراد پر اس کے ساتھ تعاون اور اس کی مدد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اسلام امداد باہمی اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر یقین رکھتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا مشاہدہ و مطالعہ اس بات کا عکاس ہے کہ اسلام درحقیقت اخوت و محبت اور خدمت خلق کا دوسرا نام ہے کہ جس میں افراد معاشرہ کے ساتھ تعاون، ہمدردی اور محبت کو کلیدی اہمیت دی جاتی ہے۔

---

[1] مسند احمد بن حنبل، ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل، حدیث رقم 1712، 3/236

اسلامی سماج ایک ایسے جسم کی طرح ہے جس کے کسی حصے کا درد اور تکلیف پورے جسم اور پورے وجود کو محسوس ہوتی ہے۔ایسے ہی معاشرے کے کسی ایک فرد کی پریشانی اور مشکل درحقیقت اس پورے معاشرے کی پریشانی ہے۔ایسی صورت میں اسلام امدادِ باہمی یا باہمی تعاون کا اصول متعارف کراتا ہے اور پھر اس کو اسلامی تعلیمات میں مرکزی اور کلیدی اہمیت کا اصول قرار دیتا ہے، جو کہ معاشرے میں لوگوں کے احساسات کو زندہ رکھنے اور ان کو اخوت و محبت کے رشتے میں پرو دینے کا سبب بنتی ہے۔

افراد معاشرہ کا ایک دوسرے سے تعاون کرنے، اور ایک دوسرے کے کام آنے کو عربی زبان میں تکافل کہتے ہیں۔عربی زبان کے لفظ "تکافل" کا مطلب ہوتا ہے ایک دوسرے کی مدد کرنا، ایک دوسرے کی کفالت کرنا اور ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔

امدادِ باہمی یا تکافل اجتماعی کی اسلام میں مختلف شکلیں اور اقسام موجود ہیں، چند اہم اور چیدہ چیدہ اشکال ذیل میں بیان کی جارہی ہیں۔

(i) تکافل خلقی یعنی امر بالمعروف و نہی عن المنکر

تعاون خلقی سے مراد افراد معاشرہ کا ایک دوسرے سے ایسے عمومی اور اجتماعی امور میں تعاون ہے کہ جن کا مقصد برائیوں کی روک تھام اور اچھائیوں کا میلان پیدا کرنا اور روحانی و اخلاقی امور میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا ہے تا کہ معاشرتی اخلاقیات کا زاویہ بلند ہو اور معاشرہ تمام اخلاقی امور کی رعایت کرے۔اخلاقی امور میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے لیے قرآن مجید افراد کا باقاعدہ ایک گروپ بنانے اور اس کام کو بخوبی نبھانے کے لیے احکامات صادر کرتا ہے۔البتہ اسلام اس گروپ کے علاوہ دیگر افراد کو بھی دعوت دیتا ہے کہ اچھائیوں میں شریک ہو جائیں اور برائی کے راستے میں رکاوٹ بن جائیں، اور مل کر برائیوں کا مقابلہ کریں۔

نہ صرف یہ بلکہ معاشرے میں امن و امان، اچھائی و بھلائی، محبت و اخوت اور انسانی قربتیں بڑھانے کے لیے تمام انسانوں اور ان سے وابستہ تمام اشیاء کو ایک دوسرے کے لیے محترم قرار دیا۔چنانچہ حبیب کبریاء کا ارشاد ہے:

((كل المسلم على المسلم حرام دمه و ماله و عرضه))[1]

ترجمہ: ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون، مال اور عزت حرام ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، امام مسلم بن حجاج، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم، حدیث رقم 2564، 4/1986

(ii) تکافلِ ذاتی یعنی تزکیہ نفس

تکافل ذاتی یعنی اپنی ذات اور نفس کے ساتھ تعاون میں رہنا۔ اپنے آپ کو تزکیہ نفس، ایمان اور عمل صالح کی راہ میں چلنے کی تلقین کرنا اور اپنی ذات کو ہمہ وقت ان سبھی کاموں کے لیے آمادہ اور بیدار رکھنا۔

یوں تزکیہ نفس اور معنوی پاکیزگی کے ان راستوں پر چل کر اپنے نفس کو ہلاکت و بربادی سے بچالینا، درحقیقت اپنے ساتھ کیا گیا تعاون اور ہمکاری ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ وَأَحْسِنُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾[1]

ترجمہ: اور خدا کی راہ میں (مال) خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو اور نیکی کرو بے شک خدا نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

گویا اپنے نفس کی ہدایت و کامیابی کی طرف راہمائی، تکافلِ ذاتی کہلائے گی۔

(iii) خاندان کا آپس میں باہمی تعاون

خاندان کے باہمی تعاون سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے اہل و عیال، اپنے والدین، بہن بھائیوں، اپنی زوجہ و اولاد کے حقوق کی رعایت کرے اور ان کے ساتھ بھلائی و خیر کا برتاؤ کرے۔ ان کی لغزشوں سے درگزر کرے اور ان کے احسان اور اچھائی کو یاد رکھے۔ اپنے قول و عمل سے ان کا فائدہ کرنے کی کوشش کرے۔

طارق محاربی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ جب وہ مدینہ آئے تو انہوں نے سنا کہ اللہ کے نبی ان الفاظ میں لوگوں کو خطبہ دے رہے تھے:

((يَدُ الْمُعْطِي الْعُلْيَا، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ: أُمَّكَ، وَأَبَاكَ، وَأُخْتَكَ، وَأَخَاكَ، ثُمَّ أَدْنَاكَ، أَدْنَاكَ))[2]

---

[1] سورۃ البقرۃ:2/195

[2] المجتبی من السنن۔ السنن الصغری للنسائی (المعروف بسنن نسائی)، ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب النسائی، مکتب المطبوعات الاسلامیۃ، حلب، طبع ثانیہ 1986، کتاب الزکاۃ، حدیث رقم 2532، 5/61

ترجمہ:عطا کرنے والا ہاتھ اوپر ہوتاہے،اور دینے کا آغاز اپنے عیال سے کرو یعنی اپنے ماں باپ،بہن،بھائی،پھراس کے بعد کے قریبی افراد اور پھر بعد کے قریبی افراد۔

قرآن مجید میں بھی اَقرباءواعزاءاور والدین کو ان کے دینے کے حوالے سے بیانات موجودہیں،ارشاد پروردگار ہوتا ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾[1]

ترجمہ:لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ وہ(راہِ خدامیں)کیاخرچ کریں؟کہہ دیجیے!کہ تم جو مال بھی صرف کرو(اس میں تمہارے)ماں باپ،قریبی رشتہ داروں،یتیموں،مسکینوں اور مسافروں کا حق ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا﴾[2]

ترجمہ:اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو۔اور فضول خرچی سے مال نہ اُڑاؤ۔

(iv) پڑوسیوں کے ساتھ تعاونِ باہمی

اسلام پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے اور ان سے حسنِ تعامل کے ساتھ پیش آنے کی تلقین کرتا ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ مُخْتَالًا فَخُورًا﴾[3]

ترجمہ: اور خدا ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسائیوں اور اجنبی ہمسائیوں اور رفقائے پہلو(یعنی پاس بیٹھنے والوں)

---

[1] سورۃالبقرۃ:215/2

[2] سورۃالاسراء:17/ 26:

[3] سورۃالنساء:36/4

اور مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو کہ خدا (احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور) تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

پڑوسیوں کے اعزاز و اکرام اور ان سے حسن معاشرت کے حوالے سے بہت سارے آثار وارد ہوئے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ آپ ؐ نے فرمایا:

((مَا زَالَ يُوصِينِي جِبْرِيلُ بِالْجَارِ، حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ))[1]

ترجمہ: جبرائیل امین مجھے اس قدر پڑوسیوں کے حقوق کی تلقین فرماتے رہے کہ مجھے یوں گمان ہونے لگا کہ عنقریب انہیں وراثت میں بھی حقدار قرار دیا جائے گا۔

حضرت ابوذر غفاری سے اللہ کے نبی نے پڑوسیوں کے بارے میں مخاطب ہو کر فرمایا:

((يَا أَبَا ذَرٍّ، إِذَا طَبَخْتَ مَرَقَةً فَأَكْثِرْ مَاءَهَا وَتَعَاهَدْ جِيرَانَكَ))[2]

ترجمہ: اے ابوذر جب سالن بناؤ تو اس میں پانی زیادہ ڈالو (اور شوربے والا بناؤ) تاکہ اس میں سے اپنے پڑوسیوں کو بھی دو۔

پڑوسیوں کے حقوق کی رعایت کرنے اور ان سے تعاون کرنے کے حوالے سے وارد ہونے والی دیگر بہت ساری احادیث میں سے ایک میں آپ ؐ نے فرمایا:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ))[3]

ترجمہ: وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو سکتا جس کے شر سے اس کا پڑوسی محفوظ نہ ہو۔

یوں اسلام پڑوسیوں سے حسن معاشرت کے ساتھ پیش آنے اور انہیں ایذا نہ دینے کا حکم دے کر ان سے تعاون کرنے کی تلقین کرتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب الادب، باب الوصاۃ بالجار، حدیث رقم 6014، 8/10

[2] شعب الایمان، احمد بن الحسین ابو بکر البیہقی، باب اکرام الجار، حدیث رقم 9092، 12/90

[3] صحیح مسلم، امام مسلم بن حجاج، کتاب الایمان، باب تحریم ایذاء الجار، حدیث رقم 46، 1/68

(v) یتیم کی کفالت

معاشرے میں رائج امدادِ باہمی کی ان صورتوں میں سے ایک صورت جس کا اسلام نے بالخصوص حکم فرمایا ہے یتیم کی کفالت اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔ماں باپ کے سائے سے محروم بچوں کو ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ماں باپ کی شفقت کی بھی شدید ضرورت اور کمی محسوس ہوتی ہے۔اسلام اس حوالے سے ان حقوق کو ادا کرنا اس معاشرے کا حق بتلاتا ہے کہ جس میں وہ یتیم بچے موجود ہوں۔اس حوالے سے تفصیلی احکام وارد ہوئے ہیں۔

ایک اور جگہ یتیموں کے مال کو استعمال کرنے کے حوالے سے خبر دار کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ﴾[1]

ترجمہ: اور یتیم کے اموال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سنِ رشد و کمال تک پہنچ جائے۔

یوں محروم ترین افرادِ معاشرہ یعنی یتیموں کی کفالت اور ان کی نگہداشت کے لیے معاشرے کے تمام افراد کو متحرک کیا ہے تاکہ ان کی پرورش و نگہداشت بھی ہو اور معاشرے کے اندر سے محروموں اور بے آسرا لوگوں کی سرپرستی بھی ہوتی رہے اور یہ محروم طبقہ معاشرے کے اوپر بوجھ بننے کی بجائے اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے اور سماج کا مفید و متحرک شہری بن سکے۔

معاشرے کے ہر فرد کو فقر کے خاتمے کے لیے متحرک کرنا

مہذب اور مستحکم معاشروں میں جب کسی چیز کو معاشرے کے لیے نقصان دہ اور ضرر رساں خیال کیا جائے تو اسے معاشرے کے لیے آفت اور بیماری قرار دیا جاتا ہے۔ریاستی اور حکومتی سطح پر مہم چلائی جاتی ہے کہ اس چیز کے بارے لوگوں میں شعور اور آگاہی کو اجاگر کیا جائے،لوگوں کے اس کے نقصانات اور منفی اثرات پر متوجہ کیا جائے اور معاشرے کے تمام افراد کو اپنی حیثیت کے مطابق اس برائی، بیماری یا نقصان دہ چیز سے لڑنے کے لیے آمادہ و تیار کیا جائے۔

غربت و افلاس ایک کثیر الجہتی معاشی مسئلہ ہے، جغرافیائی اور ثقافتی حدود سے قطع نظر یہ مسئلہ انسانوں میں نسل در نسل اور ہر معاشرے میں موجود رہا ہے۔اگرچہ فقر و افلاس کی نوعیت مختلف سماج، معاشروں، ثقافتوں اور زمان و مکان کے بدلنے سے بدلتی رہی ہے لیکن بہر حال یہ بات مسلم ہے کہ غربت شہری اور دیہی ہر دونوں طرح کی زندگیوں میں موجود ہے۔اسی طرح ترقی پذیر اور ترقی یافتہ ہر دو طرح کے سماج اور معاشرے اس کے وجود سے خالی نہیں ہیں بلکہ سبھی میں اس کے شکار افراد ملیں گے۔

---

[1] سورۃ الانعام: 152/6

اسلام غربت کے خاتمے کے مقابلے کے لئے معاشرے میں انصاف کے قیام کے ساتھ لوگوں میں تعاون اور بخشش کے حوصلے کی ترویج کرتا ہے تاکہ غریبوں اور مالداروں کے درمیان فاصلے میں کمی واقع ہو۔ خمس، زکات اور انفاق جیسے نظام معاشرے کے مختلف لوگوں کے درمیان موجود طبقاتی فاصلے کو کم کرنے میں مؤثر و مفید قدم ہے۔ جب کہ دوسری جانب اسلام یہ خیال کرتا ہے کہ سماجی تعلقات میں عدم توازن زیادہ خواہی اور مالداروں کے ہاتھوں میں ثروت کا ذخیرہ معاشرے میں غربت وافلاس کے اضافے میں اہم ترین سبب ہے۔ اسلام کی نظر میں غربت وفقر ایک قدرتی اور ناقابل برداشت واقعہ نہیں ہے کہ انسان اس کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کردے۔

عام مشاہدے کی بات ہے کہ اجتماعی زندگی کا ایک بہت اہم شعبہ انسان کی معاشی واقتصادی زندگی ہے کہ جس پر اس کی مادی زندگی کا بہت بڑا دارومدار ہے۔ اگر معاشی زندگی ناکام ہو، اگر انسان فقر وفاقہ کا شکار ہو اور اگر اسے مادی وسائل میسر نہ ہوں تو اس کے لیے اپنے دیگر دنیوی اور دینی تقاضوں کی انجام دہی بھی بعض حالات میں انتہائی مشکل اور کبھی کبھی بالکل ہی ناممکن ہو جاتی ہے۔ ان حالات میں کہا جاسکتا ہے کہ انسان اپنے سماجی معاملات، اخلاقی تقاضوں اور دینی ذمہ داریوں کی تکمیل اسی وقت کر سکتا ہے جب وہ معاشی اور اقتصادی طور پر مستحکم اور مضبوط نہ ہو۔

اسلام نے فقر کے حوالے سے جو نقطہ نظر بیان کیا ہے وہ انتہائی عادلانہ اور متوازن ہے۔ اسلام فقراء و مساکین کو تو پسند کرتا اور ان سے محبت وانس کا درس دیتا ہے لیکن فقر وغربت کو ناپسندیدہ امر قرار دیتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ ڈاکٹر اپنے مریض سے انس ومحبت رکھتا ہے لیکن اس مرض کے پریشان ہوتا ہے اور اس مرض سے اس کو چھٹکارا اور نجات دلانا چاہتا ہے۔ اسلام فقراء و مساکین کے ساتھ تراحم برتنے، ان کے ساتھ میل جول رکھنے، ان سے ت ہمدردی کرنے اور ان سے مالی ومادی اور معاشرتی وسماجی ہر طرح کا تعاون کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف فقر وغربت کو خود طاری کرنے اور adopt کرنے کو نہایت برا اور غلط سمجھتا ہے۔

اس تناظر میں اسلانے معاشرے کے ہر فرد کو فقر وغربت کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے اور انسانی معاشرے کو اس سے نجات دلانے کی ترغیب دلائی ہے۔ اس مقصد کے لیے اسلام اپنے کام کا آغاز لوگوں کو اس بارے میں آاہی فراہم کرنے اور انہیں اس حوالے سے شعور دینے کے قدم سے کرتا ہے۔ اسلام کا اس حوالے سے شعور کا پروگرام دو مختلف جہتوں پر مشتمل ہے۔ ایک جہت واجبات کی ادائیگی تک محدود ہے جب کہ دوسری جہت کا تعلق مستحب اور متطوع صدقات ہیں۔

(i) مالی واجبات کی ادائیگی

اقتصاد اسلامی کی حدود و قیود میں چند ایک چیزوں کو مخصوص شرائط کے ساتھ مالی واجبات کا درجہ دیا گیا ہے۔ در حقیقت یہ اقتصاد کا مثبت اور مفید پہلو ہے جس کے نفاذ کے ذریعے اسلام ارکاز دولت اور انفرادی و اجتماعی غربت کے سامنے رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہے۔

اسلام کے مالی واجبات اور مالی نظام کا ایک اہم حصہ زکاۃ و خمس ہیں جو کہ مال میں بطور اشتراک مقرر کیے گئے ہیں۔ دونوں کا ایک خاص نصاب ہے اور ان کا وجوب تب نافذ العمل ہو گا جب یہ اس نصاب اور اس سے جڑی دیگر اہم شرائط کو پورا کرتا ہو۔ اسلام کہتا ہے کہ جس شخص کا مال و دولت اس خاص نصاب اور حد تک پہنچ جائے جہاں سے زکاۃ وغیرہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے تو ان افراد کو اپنے مال کا ایک خاص مقرر حصہ غربت کے خلاف جنگ مالی جنگ میں بطور مالی واجبات ادا کرنا چاہیے۔

زکاۃ و خمس میں سے خمس سے مراد آمد پر مالیات کا نفاذ ہے جیسا کہ ارشاد قدرت ہوتا ہے:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّهِ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾[1]

ترجمہ: اور تمہیں معلوم ہو کہ جو کچھ مال غنیمت تم نے حاصل کیا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے اگر تم ایمان لائے ہو اللہ پر اور اس چیز پر جو فیصلے کے روز، یعنی دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ کے دن، ہم نے اپنے بندے پر نازل کی تھی، (تو یہ حصہ بخوشی ادا کرو) اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جب کہ زکاۃ سے مقصود پیداوار پر مالیات کا نفاذ ہے،

اسی طرح اسلام نے زکاۃ و خمس کے علاوہ مثلاً ان غیر مسلموں سے جو اسلام کی پناہ میں زندگی بسر کر رہے ہوں "جذیہ" کے نام سے ایک مالیاتی ٹیکس وصول کرنے کا قانون جاری فرمایا ہے جو کہ افراد کی تعداد کے مطابق وصول کیا جاتا ہے۔ اس کی مقدار کا تعین حکومت اسلامی کے اختیار میں ہے۔ چونکہ غیر مسلم اقلیتیں خمس و زکاۃ ادا نہیں کرتیں لیکن اسلامی امتیازات سے بحر حال بہرہ مند ہوتی ہیں اس لیے اسلامی قوانین کے مطابق ان پر لازم ہے کہ وہ بھی مالیات کی مخصوص مدوں میں ادائیگی کریں جن کو صرف

[1] سورۃ الانفال:8/41

غیر مسلموں کے پر واجب کیا گیا ہے۔ یہ اگرچہ ان کے اموال میں اشتراک کی حیثیت سے مقرر نہیں کیا گیا لیکن حکومت اسلامی کو حق دیا گیا ہے کہ ان سے اس کو وصول کرے اگرچہ جبراً ہی کیوں نہ ہو۔

اسی قسم کا ایک اور ٹیکس "خراج" ہے۔ یہ وہ مخصوص مالیاتی ٹیکس ہے جو ان زمینوں پر عائد کیا جاتا ہے جو بذریعہ جنگ اسلام کے زیر تسلط آئی ہوں اس کی مقدار کا تعین بھی حاکم اسلامی کے اختیار میں ہے۔

اگر کسی جائیداد و اراضی پر اسلام کا قبضہ جنگ کے بغیر ہو گیا ہو تو اس پر بھی مالیاتی ٹیکس لاگ ہوتا ہے جس کو فقہ کی اصطلاح میں "فیئ" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کا اختیار بھی حاکم اسلامی کو ہے۔

مالیاتی سسٹم کا ایک اور مہم حصہ "انفال" ہے، جو حکومت کے اموال میں شمار ہوتا ہے۔ جس کو گذشتہ صفحات میں ذکر کیا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ بھی فقہ اسلامی کے متعدد واجباتِ مالی کا گذشتہ صفحات میں تفصیل سے تذکرہ ہو چکا ہے۔

(ii) مستحب یا متطوع انفاقات

قرآن مجید کی ایک ہزار سے زائد آیات میں انفرادی و اجتماعی فقر و غربت دور کرنے کے لیے اموال صرف کرنے کی خاص تاکید نازل ہوئی ہے۔ خاتم الرسل اور اصحاب کرام کی سیرت بھی یہی تھی۔ رات کی تاریکی میں ضرورت مندوں کی خفیہ طور پر حاجت روائی کرنا ان سب کا معمول تھا۔ قرآن کریم کی تعلیمات کے مطابق مسلمان انفاق کی صفت پر قائم رہنے کی کوشش کریں تاکہ ان میں انفاق کا ملکہ پیدا ہو جائے، سب کو پیغمبر اکرم اور اصحاب کی سیرت پر عمل کرتے ہوئے حاجت مندوں کی ضروریات کو پورا کرنے اور وسائل کی کمی کو دور کرنے میں فعال رہنا چاہیے اور اس سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔

راہ خدا میں انفاق اور بخشش کرنا، محروم، خصوصاً آبرومند لوگوں کی مالی امداد کرنا، جو خلوصِ نیت سے لی ہوئی ہو، ایسے امور میں ہے جس کا قرآن مجید کی آیات میں بار بار ذکر ہوا ہے، اور اس کو ایمان کی نشانیوں سے لیا گیا ہے۔ اس بارے میں اسلامی روایات بھی تاکید سے بھری ہوئی ہیں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ اسلامی معاشرے اور تمدن میں مالی انفاق کرنا،

بشرطیکہ اس کا محرک پروردگار کی رضا کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، اور وہ ہر قسم کی ریاکاری، احسان جتانے اور آزار سے خالی ہو، تو بہترین اعمال میں سے ہے۔

دنیا اور اسباب دنیا میں غرق ہونے کے سبب الٰہی واجبات و فرائض میں رہ جانے کمی اور غفلت کا سب سے زیادہ موئثر اور کار گر علاج مستحب انفاقات ہیں۔ تزکیہ نفس اور احسان کے نقطہ نظر سے دین میں جس چیز کی اہمیت ہے وہ انفاق کی ہے، صرف زکوٰۃ کی نہیں ہے۔ زکوٰۃ تو کم سے کم مطالبہ ہے جو اسلام میں ایک صاحب مال سے کیا گیا ہے، اسلام کا اصلی مطالبہ تو انفاق کے لیے ہے جو سراً بھی ہو، اعلانیہ بھی ہو، تنگی میں بھی ہو، فراخی میں بھی ہو، دوست اور عزیز کے لیے بھی ہو، مخالف اور دشمن کے لیے بھی۔

عربوں کے ہاں انفاق کا لفظ اضافی رقم کو بھلائی اور نیکی کا امور میں خرچ کرنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔الہی قوانین کی آخری کتاب یعنی قرآن حکیم میں یہ لفظ جابجا استعمال ہوا ہے۔

انفاق کے معنی کے بارے ابن فارس رقم طراز ہیں کہ:

"النون والفاء والقاف أصلان صحيحان يدل احدهما على انقطاع شيء وذهابه ، والآخر على إخفاء شيء وإغماضه"[1]

ترجمہ:نون،فے اور قاف سے دو معانی کے الفاظ اخذ ہوتے ہیں۔ایک معنی کسی شے کا منقطع ہونا اور ختم ہونا ہے،جب کہ دوسرا معنی کسی چیز کو چھپانے اور پوشیدہ رکھنے کے ہیں۔

معجم الفقہاء میں ہے کہ:

"مصدر الفعل الرباعي "أنفق"، زيدت به الهمزة على الأصل "نفق" ؛للدلالة على توفر الصفة في الفعل ، " فالإنفاق – بكسر الهمزة – مصدر انفق"[2]

ترجمہ: انفاق،عربی زبان کے رباعی فعل "انفق"کا مصدر ہے جس کے حروف اصلی "نون،فے اور قاف" پر مشتمل ہیں لیکن ان پر ایک الف کا اضافہ کیا گیا ہے تاکہ وہ فعل میں کسی صفت کے وافر مقدار میں پائے جانے پر دلالت کرے۔پس "انفاق" الف کے نیچے زیر کے ساتھ "اَنفقَ"کا مصدر ہے۔

علامہ مناوی لکھتے ہیں کہ:

"صرف المال فى الحاجة"[3]

یعنی کسی بھی حاجت میں اپنے مال کو صرف کرنا انفاق کہلاتا ہے۔

معجم الوسیط میں ہے کہ:

"الانفاق: بذل المال و نحوه ، فى وجه من وجوه الخير"[4]

ترجمہ:انفاق کا مطلب ہے کہ اپنے مال کو اچھائی اور نیکی کے کسی بھی کام میں خرچ کرنا۔

---

[1] معجم مقاییس اللغۃ،احمد بن فارس بن زکریا،5/455

[2] معجم لغۃ الفقہاء، محمد رواس قلعجی،حامد صادق قنیبی،دار النفائس للطباعۃ والنشر والتوزیع، طبع ثانیہ 1988،ص:93

[3] التوقیف علی مھمات التعاریف،زین الدین محمد المناوی،عالم الکتب،القاھرۃ،طبع اول 1990،ص65

[4] معجم الوسیط،مجمع اللغۃ العربیۃ بالقاھرہ(ابراھیم مصطفی،احمد الزیات،حامد عبد القادر،محمد النجار)،دار الدعوۃ،سن واشاعت ندارد،2/942

انفاق کی اہمیت وترغیب

انفاق فی سبیل اللہ سے مراد ضرورت مندوں، یتیموں اور بے سہارا لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو مدنظر رکھتے ہوئے مال خرچ کرنا ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر غریبوں محتاجوں پر مال خرچ کرنے کے احکامات بیان کیے گئے ہیں تاکہ لوگوں کو چند روزہ زندگی میں جو مال نصیب ہوا ہے اور جسے وہ چھوڑ کر جانے والے ہیں اسے تقرب پروردگار کے لیے خرچ کر کے آخرت کا سامان تیار سکیں۔

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُمْ دَرَجَاتٌ عِندَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَرِزْقٌ كَرِيمٌ﴾[1]

ترجمہ: (کامل) ایمان والے تو بس وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل دھل جاتے ہیں اور جب ان کے سامنے اس کی آیتوں کی تلاوت کی جائے تو ان کے ایمان بڑھ جاتے ہیں اور وہ ہر ایک حال میں اپنے پروردگار پر توکل (بھروسہ) رکھتے ہیں۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔

راہ خدا میں انفاق اور بخشش کرنا، محروم، خصوصاً آبرومند لوگوں کی مالی امداد کرنا، جو خلوصِ نیت سے لی ہوئی ہو، ایسے امور میں ہے جس کو ایمان کی نشانیوں سے لیا گیا ہے۔ اس بارے میں اسلامی روایات بھی تاکید سے بھری ہوئی ہیں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی نشادہی کرتی ہیں کہ اسلامی معاشرے اور تمدن میں مالی انفاق کرنا، بشرطیکہ اس کا محرک پروردگار کی رضا کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، اور وہ ہر قسم کی ریاکاری، احسان جتانے اور آزار سے خالی ہو، تو بہترین اعمال میں سے ہے۔

رسول خدا ﷺ انفاق فی سبیل اللہ اور صدقات کی ادائیگی کا اس قدر اہتمام فرماتے کہ حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ:

((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَجْوَدَ النَّاسِ بِالخَيْرِ، وَكَانَ أَجْوَدُ مَا يَكُونُ فِي رَمَضَانَ حِينَ يَلْقَاهُ جِبْرِيلُ، وَكَانَ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلاَمُ يَلْقَاهُ كُلَّ لَيْلَةٍ فِي رَمَضَانَ، حَتَّى يَنْسَلِخَ،

---

[1] سورۃ الانفال:8/2-4

يَعْرِضُ عَلَيْهِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ القُرْآنَ، فَإِذَا لَقِيَهُ جِبْرِيلُ عَلَيْهِ السَّلاَمُ، كَانَ أَجْوَدَ بِالخَيْرِ مِنَ الرِّيحِ المُرْسَلَةِ))[1]

ترجمہ: محمد مصطفی ﷺ نیکی میں سب لوگوں سے زیادہ سخی تھے اور رمضان میں بہت ہی سخاوت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ رمضان گزر جاتا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام آپؑ کے پاس آتے اور آپؐ کو قرآن سناتے۔ پس جب جبریل علیہ السلام آپ ﷺ سے ملتے تو آپ ﷺ نیکی میں تیز چلنے والی ہوا سے بھی زیادہ سخی ہوتے۔

دنیا میں اللہ کی نعتوں میں سے "ہوا" اللہ کی مخلوقات پر فیاضی اور مہربانی کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ کیونکہ یہ دنیا کی ہر چیز کو محنت و کوشش کے بغیر ہر جگہ اور ہر مقام پر آسانی سے دستیاب ہے۔ مگر نبی کریم ﷺ کی سخاوت و فیاضی کے بارے آپؐ کے اصحاب کی رائے میں ہوا بھی مدمقابل نہ ہو سکتی تھی، اور آپ اس سے بھی بڑھ کے سخی اور فیاض تھے۔

عمومی دنیاوی دستور یہ ہے کہ چیزوں کے استعمال اور خرچ سے ان کی مقدار کم ہونا شروع ہو جاتی ہے لیکن صدقات و انفاقات کے معاملے میں ایسا نہیں ہے۔ اس بات کی یقین دہانی اللہ کی ذات عطا کرتی ہے کہ نیکی کی اس صورت کو اختیار کرنے سے مال میں کمی نہیں بلکہ اس میں اضافہ ہی واقع ہو گا۔ نبی رحمت نے اس بات کو یوں بیان فرمایا:

((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ، إِلَّا عِزًّا، وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلَّهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللهُ))[2]

ترجمہ: صدقہ مال و دولت میں کمی کا ہرگز سبب نہیں ہے۔ صدقہ و خیرات سے سے اللہ بندے کی عزت و شرافت میں اضافہ کرتا ہے، اللہ کے سامنے جو بھی انکساری اپناتا ہے اللہ اس کو سربلند کر دیتا ہے۔

نیز آپؐ نے فرمایا کہ اپنے آپ کو دوزخ کے عذاب سے بچانے کی تدبیر کرو اگرچہ آدھی کھجور بطور صدقہ دے کر ہی کیوں نہ ہو، اگر اتنا بھی اپنے پاس موجود نہ پاؤ تو ایک خوبصورت بات کے ذریعہ (اس مقصد کو پاؤ)[3]

اس قاعدہ اور قانون کے ذریعے مالی محرومی و تنگدستی کے شکار افراد کو خوشخبری سنائی گئی ہے کہ وہ صدقات اور انفاقات کے ثواب سے خود کو محروم مت سمجھیں بلکہ وہ اپنی حیثیت کے مطابق آدھی کھجور کو راہِ خدا میں دے کر بھی اجر کے مستحق بن سکتے

---

[1] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب الصوم، حدیث رقم 1902، 3/26

[2] صحیح مسلم، امام مسلم ابن حجاج، کتاب البر والصلہ والآداب، حدیث رقم 2588، 4/2001

[3] مسند احمد، احمد ابن حنبل، حدیث رقم 18253، 30/188

ہیں، اور اگر وہ مال و دولت سے یکسر محروم ہو تو بھی اس کو اس کارِ خیر میں حصہ ڈالنے کا بھرپور موقع دیا گیا ہے کہ ایک اچھی بات دوسروں کو بتا کر بھی تم انفاق کرتے ہو۔ یوں کسی بھی چیز کی کم مقدار کو مد نظر رکھنے سے منع فرمایا تاکہ ہر شخص یہاں تک کہ آدھی کھجور کا مالک شخص بھی اس مہم میں شریک رہے اور اس کے قلع قمع میں مقدور بھر معاونت کرے، اور پھر بظاہر کم مقدار کے حامل اس انفاق کو کم تصور نہ کرے کیونکہ پروردگار صرف کمیت کو ہی نہیں بلکہ نیت اور کیفیت کو مد نظر رکھتا ہے۔

انفاق یا نفلی صدقات کے معاشرے پر اثرات

اللہ تعالیٰ کے ساتھ حقیقی لگاؤ:

غریبوں اور محتاجوں کے اوپر انفاق کرنا دیگر مثبت اثرات کے علاوہ آدمی کے دل کو خدا کی طرف یوں مائل کر دیتا ہے کہ پھر اس کے لیے خدا سے غافل رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ آدمی کی مال سے محبت کا فطری اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ جس جگہ اپنا مال رکھتا ہے یا جس کام میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے، اسی جگہ یا اسی کام کے ساتھ اس کا دل بھی اٹکا رہتا ہے۔ اگر وہ اپنا مال کسی مخفی جگہ میں دفن کرتا ہے تو اس کا دل ہر وقت اسی گوشے اور اسی خرابے میں گردش کرتا رہتا ہے اگر وہ کسی بنک میں رکھتا ہے تو اس بنک کے ساتھ اس کا دل بندھ جاتا ہے۔ اگر کسی کاروبار یا کسی کمپنی میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے تو رات دن اس کاروبار یا کمپنی کی فکریں اس کے سر پر سوار رہتی ہیں۔ الغرض جہاں آدمی اپنا سرمایہ لگاتا ہے، تجربہ شہادت دیتا ہے کہ وہیں اس کا دل بھی رہتا ہے اس حقیقت کے آئینے میں دیکھیے تو یہ امر بالکل واضح نظر آتا ہے کہ جو شخص اپنا مال خدا کے راستے میں خرچ کرے گا اس کا دل بھی خدا ہی کے ساتھ رہے گا کیوں کہ اس کا مال خدا ہی کے پاس ہے۔

معاشرے کے ساتھ حقیقی ربط: اس کی دوسری برکت یہ ہے کہ صاحب انفاق کا اپنے معاشرے کے ساتھ بھی صحیح ربط قائم ہو جاتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ چیز بھی کوئی معمولی چیز نہیں ہے بلکہ فلسفہ شریعت کے اعتبار سے یہ دین کی دو بنیادوں میں سے دوسری ہے۔ پہلی یہ کہ رب کے ساتھ اس کا تعلق ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے۔ دوسری یہ کہ خلق کے ساتھ وہ صحیح طور پر مربوط ہو جائے۔ پہلی چیز آدمی کو نماز و عبادات وغیرہ سے حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ دوسری چیز یعنی مخلوقِ خدا سے ربط، انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی رمز ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا ذکر قرآن میں ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ یہ دونوں چیزیں در حقیقت وہ دو بنیادیں ہیں جن پر خلق اور خالق کے ساتھ آدمی کے سارے تعلقات کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ اس وجہ سے یوں سمجھنا چاہیے کہ انہی دو چیزوں پر در حقیقت پورے دین و شریعت کی عمارت قائم ہے۔

پڑوسیوں کے حقوق کی رعایت کا اولین تقاضا یہ کہ اسکے دکھ درد میں شریک رہاجائے اور اس کی مشکلات دور کرنے خاطر اپنامال مال خرچ کیا جائے اور اس کی مشکلات میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا اولین مظہر نماز ہے، اسی طرح اس کی مخلوق کے ساتھ محبت کا اولین مظہر انفاق ہے۔ گو کہ ظاہر میں یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں لیکن ذرا گہری نظر سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ ان میں سے دوسری چیز در حقیقت پہلی چیز کا ثمرہ اور نتیجہ ہے جو آدمی خالق سے محبت کرے گا وہ اس کی مخلوق سے ضرور محبت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو اپنی عیال سے تعبیر فرمایاہے۔ انسان کی یہ فطرت ہے کہ جس سے اسکو محبت ہوتی ہے، اس کے متعلقین سے بھی محبت ہو جاتی ہے، اپنی اس فطرت کے تقاضے سے جو شخص ذاتِ کبریا سے محبت شروع کرتا ہے تو اس کی مخلوق سے بھی محبت کرنے لگتا ہے اور یہ محبت قدرتی طور پر خلق کی ہمدردی اور ان کے لیے مالی ایثار کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں انسان کو اللہ تعالیٰ سے جو محبت ہوتی ہے وہ اس کے جذبہ شکر گزاری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ جب اپنی ذات اور اپنے گردوپیش پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالتا ہے تو ہر پہلو سے اپنے آپ کو خدا کی نعمتوں سے گھرا ہوا پاتا ہے۔ ان نعمتوں کا احساس اس کو ایک طرف تو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ اپنے رب کی بندگی اور پرستش کرے چنانچہ اسی تحریک سے وہ نماز پڑھتا ہے اور پھر یہی جذبہ دوسری طرف اس کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ جس طرح اس کے رب نے اس کے اوپر احسان فرمایا ہے اسی طرح وہ اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کے دوسرے بندوں پر احسان فرمائے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوا کہ دونوں چیزوں کا باہم گہرا ربط ہے، پھر انہی دونوں پر تمام دین وشریعت کی بنیاد بھی ہے۔ ایک تمام حقوق کا سرچشمہ ہے اور دوسری تمام حقوق العباد کی اصل ہے جو آدمی دوسروں کے لیے اپنا مال خرچ کر سکتا ہے وہ ان کے دوسرے حقوق ادا کرنے میں بھی تنگ دل نہیں ہو گا۔ انسان کا دل اگر مال کی محبت اور بخل کی بیماری سے پاک ہو جائے تو اس کے لیے وہ تمام نیکیاں آسان ہو جاتی ہیں جن سے ایک آدمی اپنے معاشرے کا بہترین فرد بنتا ہے اور اگر اس کا دل مال کی محبت میں گرفتار رہے تو اس کے لیے نیکی کا ہر کام دشوار بن جاتا ہے۔

کتاب الٰہی میں اس حقیقت کا ان الفاظ میں تذکرہ ہوا ہے:

﴿فَأَمَّا مَن أَعْطَى وَاتَّقَى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَى وَأَمَّا مَن بَخِلَ وَاسْتَغْنَى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَى﴾[1]

---

[1] سورة اللیل:92/5-10

ترجمہ: پس جس نے دیا اور خدا سے ڈرا اور اچھے انجام کو سچ مانا، اس کے لیے ہم راہیں کھولیں گے آسانی کی اور جس نے بخیلی کی اور خدا سے بے نیاز ہوا اور اچھے انجام کو جھوٹ جانا تو اس کو ڈالیں گے ہم تنگی کی راہ پر۔

حکمت کا حصول: انفاق کی تیسری برکت یہ ہے کہ یہ دین کے دوسرے تمام عقائد و اعمال کے لیے بمنزلہ غذا اور پانی کے ہے۔ اس سے آدمی کی وہ نیکیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں جو کمزور و ناتواں ہوتی ہیں اور اس کے وہ عقائد مستحکم اور پائیدار ہو جاتے ہیں جو ابھی اچھی طرح دل میں راسخ نہیں ہوئے ہوتے ہیں۔ دین کے عقائد اور اعمال کا یہی رسوخ و استحکام ہے جس کو کتاب اللہ میں حکمت سے معنون کیا گیا۔ قرآن کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حکمت کے خزانہ کی کلید در حقیقت انفاق ہی ہے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کے آخر میں انفاق کی برکتیں بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ:

﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاء وَاللّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلاً وَاللّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ يُؤتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاء وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا﴾[1]

ترجمہ: شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے اور بے حیائی کا مشورہ دیتا ہے اور اللہ اپنی طرف سے تمہارے لیے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور اللہ بڑی سمائی اور بڑا علم رکھنے والا ہے، وہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جسے حکمت ملی اسے خیر کثیر ملا۔

یہ اس انفاق کی برکت بیان ہوئی ہے جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنے دل کو دین کے احکام پر جمانے کے لیے کیا جائے۔ چنانچہ دل کی خواہشات کے علی الرغم جب انسان اپنے مال و اموال خدا کے احکام کی تکمیل اور اس راہ میں ہر قربانی کے آسان ہو جانے کی خاطر صرف و خرچ کرتا ہے تو اس کا کم سے کم صلہ خدا کی مغفرت اور فضل ہے۔

مال میں برکت انفاق کا چوتھا اثر آدمی کے مال میں برکت کی صورت ظاہر ہوتا ہے۔ ارشاد پروردگار ہے:

﴿مَّثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِّئَةُ حَبَّةٍ وَاللّهُ يُضَاعِفُ لِمَن يَشَاء وَاللّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾[2]

---

[1] سورۃ البقرۃ: 2/269،268

[2] سورۃ البقرۃ: 2/261

ترجمہ: ان لوگوں کی مثال جو اللہ کے راستہ میں اپنے مال لٹاتے ہیں، اس ایک دانے کے مثل ہے جس نے (اپنے بوئے جانے کے بعد) سات بالیاں اگائیں اور ہر بالی میں سو دانے ہیں اور خدا جس کے لئے چاہتا ہے اور بڑھا دیتا ہے (دونا کر دیتا ہے) خدا بڑی وسعت والا اور بڑا جاننے والا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبَا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾[1]

ترجمہ: اللہ سود (اور اس کے ظاہری فوائد) کو مٹاتا ہے اور خیر و خیرات کو اضافہ دیتا ہے۔

وہ برکت جو آخرت میں ظاہر ہو گی وہ تو ہو گی ہی، اس دنیا میں بھی اس شخص کے مال میں برکت ہوتی ہے جو خلقِ خدا کی بہتری کی خاطر اپنا مال لٹا دیتا ہے، خدا کے بے شمار بندے جو اس کے مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اس کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ یہ دعائیں کرنے والے بالعموم اہل حاجت ہوتے ہیں جو اپنی حاجت مندی کے سبب سے اس بات کے مستحق ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرمائے بلکہ بعض روایات میں ہے کہ ایسے شخص کے واسطے خدا کے فرشتے بھی برکت کی دعا کرتے ہیں۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ برکت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے والے کی تجوریاں بھر جاتی ہیں یا اس کے بنک بیلنس میں اضافہ ہو جاتا ہے یا اس کے املاک و جائیداد کی مقدار اور تعداد کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے بلکہ برکت کا مفہوم یہ ہے کہ مال کا جو حقیقی فائدہ اور نفع ہے جس مقدار میں وہ حاصل کرتا ہے، اس کے مقابل میں دوسرے حاصل نہیں کر پاتے۔ خلق خدا کی جو خدمت اس کے مال سے انجام پاتی ہے، دوسروں کے مال سے انجام نہیں پاتی۔ معاشرے اور تمدن کی اصلاح و ترقی میں جو حصہ اس کے مال کا ہوتا ہے، دوسروں کے مال کا نہیں ہوتا۔ خدا کی خوشنودی کا جو لازوال خزانہ وہ اپنے مال کے بدلے میں حاصل کر لیتا ہے، دوسرے اس سے محروم رہتے ہیں۔ خلق خدا کے دلوں میں عزت اور محبت کا جو مقام اسے ملتا ہے، روپے کو گن گن کر رکھنے والے اور کوٹھیوں اور کاروں کے مالک اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو فراغ خاطر، جو سکون قلب، جو اعتماد علی اللہ، جو قلبی مسرت اور دل اور روح کی جو بادشاہی اس کو حاصل ہوتی ہے، دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کو کبھی خواب میں بھی وہ چیز نظر نہیں آتی۔

اس برکت کی ایک انفاق کرنے والے کا مال چونکہ دوسروں کے دبائے ہوئے حقوق کی فاسد ملاوٹ سے پاک ہوتا ہے، اس وجہ سے صالح بیج کی طرح اس کی قوت نشو و نما میں بڑا اضافہ ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی اس قدر و قیمت کو مضاعف کر دیتا ہے اور

---

[1] سورۃ البقرۃ: 2/276

ان آفتوں سے وہ محفوظ ہو جاتا ہے جو آفتیں اندر اندر ان مالوں کو چٹ کرتی رہتی ہیں جن کے اندر دوسروں کے حقوق کی آلائش ملی ہوئی ہوتی ہیں۔

جذبہ ءایثار اور اسلام

اللہ تعالیٰ کی رضا کے پیش نظر دوسروں کی ضروریات وحاجات کو اپنی حاجتوں اور ضرورتوں پر ترجیح دینا ایثار کہلاتا ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کا تعلق دل اور نیت سے ہے کیونکہ جب کوئی اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر دوسرے کی ضرورت کو پورا کرتا ہے تو اس وقت اللہ اس سے پوری طرح راضی ہوتا ہے اور اس کا وہ فعل بارگاہ رب العزت میں بڑا مقبول ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام میں اس کی بے پناہ فضیلت ہے۔

کتب لغت کی رو سے کسی کو خود پر مقدم کرنا یا فوقیت دینا ایثار کہلاتا ہے۔ علماء لغت کے مطابق ایثار کا لفظ عربی زبان کے تین حروف (آ ث ر) سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہوتا ہے:

"آثره على نفسه: قدّمه واختصَّه بالخير"[1]

ترجمہ: کسی نیکی اور اچھائی کے موقع پر دوسروں کو خود پر مقدم کرنا یا فوقیت دینا ایثار کہلاتا ہے۔

ایثار کا تعلق اپنے علاوہ دیگر لوگوں کے لیے جلبِ منفعت یا دفعِ ضرر دونوں کے لیے عام ہے، چنانچہ علامہ شریف جرجانی "ایثار" کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"الإيثار: أن يقدم غيره على نفسه في النفع له والدفع عنه، وهو النهاية في الأخوة"[2]

ترجمہ: کسی نفع کے حصول میں یا نقصان کے دور کرنے میں دوسروں کو خود پر مقدم کرنا ایثار کہلاتا ہے ،انسانی بھائی چارے کی یہ آخری حد اور آخری منزل ہے۔

اللہ کی راہ میں کوئی سے بھی مفید اور قابل استفادہ چیز کا دوروں کے دے دینا انفاق فی سبیل اللہ کہلاتا ہے اور باعث اجر عظیم ہے لیکن "ایثار" کا عنوان تب متحقق ہے کہ جس چیز کو دوسروں کے استفادہ کے لیے دے دیا گیا ہو خود بھی اس کی احتیاج اور سخت ضرورت ہو۔

چنانچہ تکملۃ المعاجم العربیہ کے مطابق:

---

[1] معجم اللغة العربية المعاصرة، احمد مختار عبد الحميد عمر، عالم الكتب، طبع اول 2008ء، 1/ 61

[2] کتاب التعریفات، الشریف جرجانی، ص:40

"الإيثار بالشيء أن تعطيه لغيرك مع احتياجك إليه"[1]

ایثار کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی ضرورت و احتیاج ہونے کے باوجود اس چیز کو (نیکی کی غرض سے) کسی غیر کو دے دینا۔

ایثار انانیت کی ضد ہے کہ جس میں انسان کی تمام تر توجہ اپنی ذات پر ہی مرکوز رہتی ہے اور زندگی کا مقصد نفعِ ذات ٹھہرتا ہے۔جب کہ ایثار ایک ایسا جذبہ ہے کہ جس میں انسان کی اپنی ذات کو ثانوی جب کہ دیگر انسانوں یا ذی روح مخلوقات کو مرکزی حیثیت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایثار دوسروں کی ضرورتوں کو اپنے اوپر ترجیح دینے اور انہیں اپنی ضرورتوں پر فوقیت دینے کا نام ہے، ایثار در حقیقت خود بھوکے ہو کر بھی دیگر انسانوں کو کھلانے اور خود تکلیف اٹھا کر اپنے معاشرے کے لوگوں کو راحت پہنچانے سے عبارت ہے۔ ایثار کا لفظ ہر اس مقام پر اطلاق رکھتا ہے کہ جس میں انسان کے کسی بھی فعل اور تصرف کا مقصد اپنے علاوہ دیگر اشخاص کو فائدہ اور بھلائی پہنچانا ہو۔ گویا کہ ایثار، مصالحِ عامہ کو مصالحِ شخصیہ پر مقدم کرنے کا نام ہے۔

اسلام میں انفاق فی سبیل اللہ کے جو مقامات اور موارد بیان ہوئے ہیں ان میں ایثار سے بلند کوئی مرتبہ نہیں ہے۔ اگر کوئی محتاجوں کو اللہ کے دیے گئے رزق میں سے عطا کرتا ہے اور اس کا یہ فعل مالی کمی یا خسارہ ہونے کی طرف متوجہ ہونے کی بجائے تقرب الی اللہ کی خوشی کو محسوس کرے تو ایسا شخص یقیناً سخی ہے، لیکن اگر کوئی اپنا زیادہ مال دوسروں کی ضروریات کے لیے جب کہ کم مال اپنی ذات کے لیے استعمال کرے تو وہ جواد ہے۔ لیکن اگر صورت حال ایسی ہے کہ خود کسی چیز کا ضرورت مند ہو مگر کسی اور انسان کو جب اسی چیز کا ضرورت مند دیکھے تو اس کی ضرورت کو خود پر مقدم کرکے اس کی ضرورت کو پورا کر دے تو یہ فعل ایثار کہلائے گا ۔اور ایثار کا مرتبہ تمام مراتب سے بلند و ارفع ہے۔ انسان کے اندر یہ جذبہ اس کے یقین و ایمان کی طاقت، اللہ کی مخلوقات سے بے پایاں محبت، مشکل اور مشقت پر صبر کرنے کے طاقت اور اللہ کی طرف سے عطا ہونے والے اجر و ثواب کی خاطر پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بذل و عطا اور انفاق فی سبیل اللہ کا یہ سب سے عالی و بلند مرتبہ و مقام ہے۔

ان خصوصیات کی وجہ سے ایثار کا درجہ صدقہ کے درجہ سے بلند اور بڑا ہو جاتا ہے۔ ابن تیمیہ ایثار کے بارے رقم طراز ہیں کہ:

---

[1] تكملة المعاجم العربية، رینھارت بيتر آن دُوزِي ،(نقله إلى العربية وعلق عليه: محمد سليم نعيمی،جمال خياط)، وزارة الثقافة والإعلام، الجمهورية العراقية، طبع اول2000ء،1/ 82

"وَأَمَّا الْإِيثَارُ مَعَ الْخَصَاصَةِ فَهُوَ أَكْمَلُ مِنْ مُجَرَّدِ التَّصَدُّقِ مَعَ الْمَحَبَّةِ، فَإِنَّهُ لَيْسَ كُلُّ مُتَصَدِّقٍ مُحِبًّا مُؤْثِرًا، وَلَا كُلُّ مُتَصَدِّقٍ يَكُونُ بِهِ خَصَاصَةٌ، بَلْ قَدْ يَتَصَدَّقُ بِمَا يُحِبُّ، مَعَ اكْتِفَائِهِ بِبَعْضِهِ، مَعَ مَحَبَّةٍ لَا تَبْلُغُ بِهِ الْخَصَاصَةَ"[1]

ترجمہ: مفلسی (واحتیاج) کے ہوتے ہوئے ایثار کرنا فقط (پروردگار کی راہ میں انفاق کی) محبت کی وجہ سے کیے گئے صدقے سے زیادہ اکمل درجہ ہے۔ اس لیے کہ ہر صدقہ دینے والے محبت و ایثار (دونوں) کا حامل نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ خود مفلس ہوتا ہے، بلکہ بعض اوقات وہ اپنے اکتفا بھر مال ہونے کے بعد راہِ خدا میں عنایت کرنے کے فعل سے محبت کی وجہ سے ایسا کر رہا ہوتا ہے، اس میں خدا کے راستے میں انفاق کی محبت تو ہوتی ہے البتہ وہ محتاج نہیں ہوتا (جب کہ ایثار کا مطلب یہی ہے کہ خود کو اس چیز کی زبردوست ضرورت ہو مگر غیر کی ضرورت و احتیاج کو اپنی ضرورت پر مقدم جانا جائے اور وہ چیز اس کو دے دی جائے)۔

ایثار کے جذبات پاکیزہ اور صاف ستھرے دلوں کے مالک لوگوں میں انسانیت کے لیے شفقت اور نرمی کی خاطر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوتے ہیں۔ وہ خود اپنی زندگی سے زیادہ دوسروں کی زندگی اور اسے زندہ کرنے کے بارے میں سوچتے اور اسی کے لیے مصروفِ عمل رہتے ہیں۔ ایثار کے بارے میں انصارِ مدینہ کا کردار نہایت اہم ہے۔ اسی لیے قرآنِ حکیم نے بھی ان کے جذبے کو سراہا اور اسے قابلِ تقلید قرار دیا۔ جب بنو نضیر کی زمین مسلمانوں کے قبضے میں آئی اور اس کا بڑا حصّہ خدا کے رسول نے مہاجرین کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے انہیں عطا کر دیا تو انصار نے اس فیصلے کو نہایت خوش دلی سے قبول کیا۔ طبری مذکورہ آیت بارے کہتے ہیں کہ:

وقوله: (وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ) يقول تعالى ذكره: وهو يصفُ الأنصار: وَالَّذِينَ تَبَوَّؤُوا الدَّارَ وَالإِيمَانَ مِن قبل المهاجرين، وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ يقول: ويعطون المهاجرين أموالهم إيثارًا لهم بِها على أنفسهم وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ يقول: ولو كان بهم حاجة وفاقة إلى ما آثَرُوا به مِن أموالهم على أنفسهم[2]

---

[1] منہاج السنۃ النبویۃ في نقض کلام الشیعۃ القدریۃ، امام محمد ابن تیمیہ، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ، طبع اول 1986ء، 7/184

[2] جامع البیان في تأویل القرآن، محمد ابن جریر طبری، 23/284

قرآن حکیم کے ان الفاظ (وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنْفُسِهِمْ) میں انصار کی تعریف کی گئی ہے جو کہ مہاجرین کی آمد سے قبل ایمان لے آئے تھے اور دارِ ہجرت میں آباد تھے، وَيُؤْثِرُونَ عَلَى أَنفُسِهِمْ یعنی وہ اپنے اموال مہاجرین کو اپنے آپ پر ترجیح دے کر دے دیتے ہیں۔ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ یعنی جن چیزوں کا انہوں نے ایثار کیا ہے وہ خود ان چیزوں کے محتاج ہی کیوں نہ ہوں۔

مفسر قرآن ابن کثیر بھی ان آیات سے یہی مفہوم بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کی حاجات کو اپنی حاجات پر مقدم رکھتے ہیں اور خود سے پہلے لوگوں سے نیکی اور انفاق کا آغاز کرتے ہیں حالانکہ خود بھی ان چیزوں کی طرف محتاج ہوتے ہیں۔[1]

رسول اکرم کی خاص تربیت کا اعجاز تھا کہ اصحاب کے ہاں ایثار و قربانی کی لازوال اور بے مثال داستانیں دیکھنے کو ملتی تھیں۔ جنگ یرموک میں حضرات صحابہ کرام میں سے حارث بن ہشام، عکرمہ بن ابو جہل اور عیاش بن ربیعہ رضی اللہ عنہم شدید زخمی ہو کر موت وحیات کی کشمکش میں تھے۔ حضرت حارث نے پینے کے لیے پانی مانگا تو حضرت عکرمہ ان کی جانب دیکھنے لگے انہوں نے فرمایا کہ پانی عکرمہ کو دو۔ اتنے میں حضرت عیاش بن ربہ نے حضرت عکرمہ کی جانب دیکھا تو وہ فرمانے لگے کہ پانی عیاش کو دے دو لیکن پانی حضرت عیاش تک پہنچ نہ سکا اور نہ کسی اور کو ملا یہاں تک کہ سب نے جام شہادت نوش کر لیا اور پانی نہ چکھ سکے۔[2]

سید الرسل بذات خود ایثار کا کامل نمونہ تھے۔ حضرت خدیجہ انہی سے ان کے ایثار کے بارے ایک مرتبہ کہتی تھیں کہ :

"انک لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم و تقری والضیف و تعین علی نوائب الحق"[3]

ترجمہ: آپ تعلق کو جوڑتے اور ناتواں کا بوجھ اپنے اوپر لے لیتے اور جو چیز ان کے پاس نہ ہوتی وہ لا کر انہیں دیتے، مہمان نوازی کرتے اور مشکل میں حقدار سے تعاون فرماتے ہیں۔

ایثار کا ایک اہم پہلو دوسروں کے کام آنا ہے، انسان اپنے اعمال کے ذریعے یہ ثابت کرے کہ وہ قربانی دینا جانتا ہے، اپنے عمل سے یہ پیغام دے کہ وہ اس لذت سے آشنا ہے جو کسی کی کوئی ضرورت پوری کرکے اور ایسے انداز میں ضرورت پوری کر کے اسے لذت حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنی کسی ضرورت کی قربانی دیتا ہے یا کم سے کم اپنے آرام یا آسائش کو تج کر، مشقت اٹھا کر، اور

---

[1] تفسیر القرآن العظیم، ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر، دار الکتب العلمیۃ،، بیروت، طبع اول 1419ھ، 8/98

[2] الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر القرطبی، دار الجیل، بیروت، طبع اول 1992ء، 3/1084

[3] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب بدء الوحی، حدیث رقم 3، ص 1/7

اپنی آرام کی قربانی دے کر کسی کے کام آتا ہے اور اس کی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے۔ یوں تو اپنے کام خود اپنے ہاتھ سے انجام دینا بھی اچھی اور محمود صفت ہے، لیکن اصل بڑائی اور بڑی نیکی یہ کہ انسان دوسروں کے کام آئے اور حسبِ استطاعت اور حسبِ توفیق دوسروں کے کام کر کے خوشی محسوس کرے، جن کی ادائیگی سے بہ وجوہ وہ قاصر ہوں، یا وہ بہ سہولت وہ کام نہ کر سکتے ہوں اس میں ان کی ہمکاری کرے۔

نتیجہ کلام:

اسلام ایسے نظام کو متعارف کراتا ہے جس نظام میں معاشرے کا ہر فرد غربت وافلاس کی بیماری اور ناسور کو ختم کرنے میں اپنا حصہ ڈال سکے۔ اس کام کا آغاز شق تمر یعنی کھجور کے ایک ٹکڑے سے سے بھی ممکن ہے۔ اس کام کے لیے دنیا کا غریب ترین شخص بھی اپنے آپ کو دستیاب دیکھتا ہے اور اس مسئلے کے خاتمے کے لیے اپنا حصہ ڈال سکتا ہے۔ یقیناً جب صورت حال ایسی ہو جائے کہ کائنات کا ہر فرد کسی بھی مسئلے کے خلاف اس کے حل کی خاطر کمر بستہ ہو جائے تو وہ مسئلہ زیادہ دیر ٹک نہیں سکتا یوں پوری دنیا کو اس مسئلے سے آگاہی بھی رہتی ہے اور نفسیاتی طور وہ جنگ آسان بھی ہو جاتی ہے جس میں سبھی لوگ شامل ہو جاتے ہیں۔ شق تمر کے مرحلے کے بعد پھر دوسرا مرحلہ آتا ہے کہ اللہ نے جس کو بھی زیادہ عطا کیا ہو اور مال اس کی ضروریات وغیرہ کے لیے کافی ہو اور اس سے کچھ زائد مقدار بھی موجود ہو تو اس زیادہ مال سے بھی غریبوں اور محتاجوں کا حق مقرر فرما کر زکاۃ، خمس وغیرہ کے زریعے نصاب مقرر فرما کر اس کے مال و دولت کو مستحق افراد تک پہنچانے کے لیے ایک نظام ترتیب دے دیا ہے۔ یوں مال و دولت کی فراوانی رکھنے والوں کے لیے اس کام میں شرکت کو ان کی اپنی ذاتی مرضی پر نہیں چھوڑا بلکہ ان کو ایک خاص مقدار دینے کا معین اور واضح حکم ارشاد فرمایا ہے۔ پھر اس کے بعد بھی اگر کسی کے پاس مال کی فراوانی باقی رہے تو اضافی مال کے لیے اس کو "انفاق" و"ایثار" کی ترغیب دلائی ہے۔ اور اس کے بدلے میں ثواب عظیم اور اجر جذیل کا وعدہ فرمایا ہے۔

دراصل اسلام کے اس طریقے سے غربت کے خلاف لڑی جانے والی جنگ میں معاشرے کے تمام افراد بشمول ضرورت مند افراد کے شامل ہو جاتے ہیں اور پورا معاشرہ غربت کے خاتمے کے لیے یکسو ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اہداف کو حاصل کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔

فصل سوم

زکاۃ و خمس و عشر اور نظامِ صدقہ و خیرات

اسلامی نظامِ زکاۃ کا اجمالی جائزہ

زکاۃ ارکانِ اسلامی کا ایک رکن ہے۔ کلمہ اور نماز کے بعد زکاۃ کا درجہ ہے۔ اس کے لغوی معنی طہارت اور پاکیزگی کے ہیں [1] جب کہ اصطلاح میں مسلمان، عاقل، بالغ اور آزاد شخص کے پاس جب کچھ خاص اشیاء میں، جن کا ذکر بعد میں کیا جا رہا ہے، مال نصاب کی مقدار کے برابر یا زائد حد تک پورا سال باقی رہے، نیز وہ مال فرد کی زندگی کی بنیادی احتیاجات اور ضروریات سے زیادہ ہو، اور وہ کسی کا مقروض بھی نہ ہو تو اس پر سال میں ایک دفعہ زکاۃ ادا کرنا واجب ہو جاتی ہے۔

کتاب اللہ میں بیشتر مقامات پر پروردگار نے زکاۃ کا ذکر نماز کے ہمراہ کیا ہے، جو اس کی افضلیت و اہمیت کو بتاتا ہے۔ مسلمانوں کے تمام فرقوں کا اس کی فرضیت پر قطعی اجماع ہے، اور جو کوئی بھی زکاۃ کے وجوب کا منکر ہو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اور جو کوئی اس کی فرضیت کو جانتے ہوئے اس میں خیانت یا بخل و کنجوسی کرے اسے عذاب پروردگار کی وعید سنائی گئی ہے۔

قرآن مجید اور سنت نبویہ میں زکاۃ ادا نہ کرنے یا اس کی ادائیگی میں سستی کرنے پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ سے مروی ایک حدیث مبارک میں قیامت کے دن صاحبِ مال کے ساتھ پیش آنے والے حالات کی روداد بڑے سخت الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

((من آتاه الله مالا فلم يود زكاته مثل له ماله يوم القيامة شجاعا اقرع له زبيبتان يطوقه يوم القيامة، ثم ياخذ بلهزمتيه يعنى بشدقيه ثم يقول انا املك انا كنزك ثم تلا : ﴿ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾[2]

ترجمہ: جس کسی کو بھی اللہ نے مال عطا کیا مگر وہ زکاۃ ادا نہ کرے تو روزِ قیامت اسکے مال کو ایک ایسے سانپ کی شکل میں اس کے سامنے پیش کیا جائے گا جس کی دو زبانیں ہوں گی، وہ سانپ اس آدمی کے گلے میں ڈالا جائیگا اور وہ اسے اپنے جبڑوں میں جکڑ لے گا اور کہے گا کہ میں تمہارا مال ہوں، میں تمہارا خزانہ و کنز ہوں۔ پھر آپؐ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی: جو لوگ مال میں جو خدا نے اپنے فضل سے

---

[1] کتاب العین، خلیل ابن احمد الفراہیدی، 394/5

[2] سورۃ آل عمران: 180/3

ان کو عطا فرمایا ہے بخل کرتے ہیں وہ اس بخل کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں۔(وہ اچھا نہیں) بلکہ ان کے لئے برا ہے وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔ اور آسمانوں اور زمین کا وارث خدا ہی ہے۔ اور جو عمل تم کرتے ہو خدا کو معلوم ہے۔

ایک اور روایت میں زکاۃ ترک کر دینے کی وجہ سے صرف عذابِ آخرت ہی نہیں بلکہ دنیاوی نعمتوں کے چھن جانے کی وعید بھی سنائی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد رسول گرامیؐ ہے:

((وَلَمْ يَمْنَعُوا زَكَاةَ أَمْوَالِهِمْ إِلَّا مُنِعُوا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَاءِ، وَلَوْلَا الْبَهَائِمُ لَمْ يُمْطَرُوا))[1]

ترجمہ: اور اگر لوگ اپنے مال میں سے زکاۃ کو روک لیں تو ان پر آسمان سے نازل ہونے والی بارانِ رحمت سے روک دیا جائے گا۔ (یاد رکھو!) اگر مال مویشی ان کے پاس نہ ہوتے تو آسمان سے ایک قطرہ بارش بھی ان کے لیے نازل نہ ہوتی۔

امام طبری کے نزدیک تو زکاۃ کی ادائیگی کا معنی و مفہوم یہی کہ اللہ کے عائد کردہ اس حق کو برضاء و رغبت اور خوشی خوشی ان تمام شرائط کے مطابق ادا کیا جائے جو اس بابت وارد ہوئی ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"مَعْنَى(إِيتَاءِ الزَّكَاةِ) وَأَنَّهُ إِعْطَاؤُهَا بِطِيبِ نَفْسٍ عَلَى مَا فُرِضَتْ وَوَجَبَتْ"[2]

ترجمہ: زکاۃ کی ادائیگی اپنی خوشی کے ہمراہ ہونی چاہیے، ادائیگی کے وقت وہ تمام شرائط موجود ہوں جن شرائط کے ساتھ اس کو واجب اور فرض قرار دیا گیا ہے۔

زکاۃ کے وجوب کے لیے چار شرطوں کا پایا جانا لازمی ہے۔

1۔ مسلمان ہونا، لہذا غیر مسلم پر زکاۃ ساکت ہے۔

2۔ آزاد ہونا، پس غلام پر زکاۃ واجب نہیں ہوتی۔

3۔ مال کا نصاب تک پہنچ جانا اور نصاب سے متعلق دیگر تمام شرائط کا پایا جانا

4۔ حول یعنی سال کا گزر جانا اور سال گزرنے کے حوالے سے باقی تمام شرائط کا پایا جانا

زکاۃ چار اصناف یعنی چار قسم کے مال میں واجب ہوتی ہے۔

---

[1] المعجم الاوسط، سلیمان ابن احمد طبرانی، دار الحرمین، قاہرہ، سال طبع ندارد، حدیث رقم 4671، ص 5/62

[2] جامع البیان عن تاویل القرآن (تفسیر الطبري)، محمد بن جریر الطبری، 2/425

1 انعام ثلاثہ یعنی اونٹ، گائے اور بھیڑ بکری میں

2 جو چیزیں زمین سے اگتی ہیں اور زرعی پیداوار شمار ہوتی ہیں مثلاً پھل اور سبزیاں وغیرہ۔ان پر اگر آبپاشی کی گئی ہو تو پانچ فیصد وگرنہ دس فیصد زکاۃ عائد ہوگی۔

3 معدنیات اور زمینوں میں

4 تجارت کے منافع، جمع شدہ رقم اور زیورات میں ڈھائی فیصد زکاۃ واجب ہے۔

ان تمام اشیاء کا الگ الگ نصاب مقرر ہے، جب تک کوئی چیز اپنے مقرر کردہ نصاب تک نہ پہنچے، اور اس سے متعلقہ دیگر شرائط پوری نہ ہوں اس وقت تک اس میں زکاۃ واجب نہیں ہوتی۔

جب کسی بھی مال میں زکاۃ واجب ہونے کی تمام شرائط پوری ہوں تو ضروری ہے کہ اس مال کو اس کے مستحقین تک پہنچا دیا جائے۔زکاۃ کے مستحقین کے حوالے سے قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾[1]

ترجمہ: صدقات (یعنی زکوٰۃ وخیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور خدا کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیئے یہ حقوق) خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔

قرآن مجید کی روشنی میں زکاۃ کے مصارف یا اس کے مستحقین درج ذیل افراد ہیں۔

1: فقراء یعنی وہ لوگ جن کے پاس موجود مال ان کی ضروریات کے لیے ناکافی ہو۔

2: مساکین یعنی معاشرے میں موجود وہ افراد جن کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ موجود نہ ہو اور جس کی حالت فقیر سے بھی ابتر ہو۔[2]

---

[1] سورۃ التوبہ:9/60

[2] فقیر اور مسکین کے معنی ومفہوم کے حوالے سے فقہاء میں اختلاف موجود ہے، لیکن اکثر علماء اسی قول اور نظریے کے قائل ہیں جس کے مطابق یہاں تعریف کی گئی ہے۔تفصیل کے لیے کتب فقہ کی طرف مراجعہ کیا جاسکتا ہے۔

3:عاملینِ زکاۃ یعنی وہ لوگ جو حکومت اسلامی کی طرف سے زکاۃ جمع کرنے کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔

4:مؤلفۃ القلوب یعنی ایسے لوگ جن کو اگر زکاۃ کا مال دیا جائے تو وہ مسلمان ہو جائیں گے یا مسلمانوں کی مخالفت ترک کر دیں وغیرہ۔

5:غلاموں کو رہائی دلانے کے لیے

6:مقروض شخص پر قرض کی ادائیگی کے بعد حد نصاب تک اس کے پاس مال نہ بچتا ہو تو ایسے شخص کی زکاۃ کے مال سے امداد کی جاسکتی ہے تاکہ وہ اس مال سے اپنا قرض اتار لے۔

7:فی سبیل اللہ یعنی جو لوگ یا جو کام دین مبین کی سربلندی کے لیے مصروف ہوں۔

8:مسافر اگر سفر کے دوران محتاج ہو جائے تو مالِ زکاۃ سے اس کی امداد کی جاسکتی ہے۔

نظام عشر یا عشور کا جائزہ

عشر عربی زبان کا لفظ ہے جس کو اگر پیش کے ساتھ یعنی "عُشر" پڑھا جائے تو اس کا معنی ہوتا ہے دسواں حصہ [1]۔ فقہی اصلطلاح میں اس کا اطلاق دو مفاہیم پر ہوتا ہے۔

الف: یعنی اموال تجارت پر لیا جانے والا مخصوص محصول۔ اس کو عشر اس لیے کہتے ہیں چونکہ یہ ہمیشہ عشر کے الفاظ کی طرف ہی مضاف ہوتا ہے مثلاً عشر یا نصف العشر وغیرہ

ب: غلے میں لاگو ہونے والی وہ زکاۃ جو مخصوص شرائط کی موجودگی میں دسواں حصہ ہوتی ہے۔

ابن قدامہ عشر کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ:

> **"هو ما يفرض على اموال اهل الذمه المعدة للتجارة اذا انتقلوا بها من بلد الى بلد داخل بلاد الاسلام"[2]**

ترجمہ: وہ (محصول) جو اسلامی مملکت کے اندر اہل ذمہ پر انکے اموالِ تجارت ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کرنے کے سبب عائد ہوتا ہے۔

---

[1] تاج العروس، الزبیدی، 13/44

[2] المغني لابن قدامة، ابو محمد موفق الدین محمد بن قدامة، مکتبة القاهرة، طبع 1968ء، 8/518

عشر اور جزیہ دونوں ہی ذمی کافر سے لیے جاتے ہیں لیکن انکا باہمی فرق یہ ہے کہ جزیہ ذمی کافروں سے فی نفر کے حساب سے لیا جاتا ہے جس کی وجہ ان کا مملکت اسلامی میں امن و امان اور دیگر سہولیات کا برابری سے استعمال کرنا ہے۔[1] جب کہ عشر مالِ تجارت کی مسلم ریاست میں نقل و حمل پر لیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں کفار ذمی سے وصول کیے جاتے ہیں اور دونوں کا مصرف فئ والا مصرف ہے تبھی بعض فقہاء نے بعض اوقات دونوں کو ایک ساتھ ملا دیا ہے اور اس کے لیے "الجزیۃ العشریۃ" جیسے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔[2] جمہور فقہاء کے نزدیک عشر سال میں صرف ایک بار ہی واجب ہوتا ہے جب کہ مالکی مسلک کے مطابق ہر بار سامانِ تجارت منتقل کرنے پر عشر لیا جائے گا چاہے سال میں کئی بار ہی کیوں نہ ہو۔[3]

عشر جن لوگوں وصول کیا جاتا ہے انکی دو اقسام ہیں۔ایک تو وہ لوگ جو کافرِ ذمی ہوں، اور کافرِ ذمی سے مراد عیسائیوں، یہودیوں اور مجوسیوں وغیرہ کے ایسے افراد ہیں جو ریاستِ اسلامی میں ایک مخصوص معاہدے یعنی عقد ذمہ کے تحت رہتے ہیں۔ جب کہ دوسرے وہ افراد ہیں جو ذمی تو نہیں ہیں مگر اصطلاح میں جن کو "مستامنون" یعنی امن دیے گئے لوگ کہلاتے ہیں۔ مستامنون میں قاصد، تاجر، اسلام کے حوالے سے معلومات لینے کے لیے آنے والے اور کسی خاص حاجت مثلاً زیارت وغیرہ کے لیے آنے والے لوگ شامل ہیں۔[4]

عشر کے شریعت اسلامی کے احکامات میں سے ہونے پر تین دلیلیں ہیں۔ اہم ترین دلیل رسول پاک ﷺ سے منقول وہ روایت ہے جو احادیث کی متعدد کتب میں وارد ہوئی۔ آپؐ نے فرمایا:

((إِنَّمَا الْعُشُورُ عَلَى الْيَهُودِ، وَالنَّصَارَى وَلَيْسَ عَلَى أَهْلِ الْإِسْلَامِ عُشُورٌ))[5]

ترجمہ: عشر فقط یہود و نصاریٰ (یعنی کفار) پر نافذ ہے مسلمانوں پر عشر واجب نہیں۔

اس حدیث کے اطلاق سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں پر زکاۃ واجب ہے اور جب کہ غیر مسلموں پر زکاۃ نہیں بلکہ عشور واجب ہیں۔ حضرت عمر نے اپنے زمانہ خلافت میں اصحاب رضوان اللہ علیہم کی موجودگی میں عشار کو عشر حاصل کرنے کی غرض سے

---

[1] الاحکام السلطانیۃ، ابو الحسن علي بن محمد الماوردی، دار الحدیث، قاہرہ، ص146

[2] القوانین الفقہیہ، ابو القاسم، محمد بن احمد بن محمد بن عبد اللہ ابن جزی، طباعت و سن طبع ندارد، ص176

[3] الموسوعۃ الفقہیہ، وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیہ، کویت، طبع ثانیہ 1983ء، 7/134

[4] احکام اہل الذمۃ، محمد بن ابي بکر بن قیم الجوزي، رمادی للنشر، الدمام، طبع اول 1997ء، 2/476

[5] مسند امام احمد ابن حنبل، امام احمد ابن حنبل، حدیث رقم 15895، ص25/230

روانہ فرمایا تھااور کسی صحابی کی جانب سے بھی اس حکم کے مقابل کوئی رائے یا قول دیکھنے میں نہیں آیا[1]۔ یہ امر بذات خود اجماع سکوتی پر دال ہے کہ اس بات پر صحابہ کا اجماع ہے وگرنہ صحابہ میں کسی نہ کسی کا اس کے مقابلے میں کوئی قول ضرور سامنے آیا ہوتا۔

غیر مسلموں سے لیا گیا یہ محصول نہ تو غیر منصفانہ اور نہ ہی دنیا میں پائی جانے والی کوئی انہونی چیز۔ بلکہ آج کل کی دنیا میں اکثر ممالک کے ایئرپورٹس پر اسی طرح کی چیز وصول کی جاتی ہے۔ دراصل عشر کی صورت میں لیا جانے والا یہ محصول ان سہولیات کی وجہ سے جو ایک غیر مسلم کو مسلمانوں کی مملکت وریاست میں آنے کی وجہ سے میسر ہوتی ہیں۔ یہی چیز عشر کی مشروعیت پر عقلی دلیل بھی ہے۔

عشر یا عشور کے مصارف کے حوالے سے علماء قائل ہیں کہ کفار ذمی اور حربی کے مال تجارت سے حاصل کیے جانے والے عشر کو "فئ" کے مصارف میں استعمال کیا جائے گا۔[2]

اسلام کے نظامِ خمس کا اجمالی جائزہ

خمس عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے "پانچواں حصہ "۔[3] ویسے تو اس کا اطلاق کسی بھی چیز کے پانچویں حصے پر ہوتا ہے لیکن شریعت اسلامی کی روح سے خمس ایک خاص فقہی اصطلاح ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ﴾[4]

ترجمہ: اور جان رکھو کہ جو چیز تم (کفار سے) لوٹ کر لاؤ اس میں سے پانچواں حصہ خدا کا اور اس کے رسول کا اور اہل قرابت کا اور یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔

خمس کے وجوب کے سبھی اسلامی مسالک قائل ہیں، البتہ اس کی جزئیات میں تمام مذاہب اسلامی میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔ پس خمس کے مسئلے میں یہ اختلاف دو طرح کا ہے۔

---

[1] نیل الاوطار، محمد بن علي بن محمد بن عبد الله الشوکانی، دار الحدیث، مصر، طبع اول 1993ء، 8/71

[2] الاحکام السلطانیہ، ابو الحسن علي بن محمد الماوردی، ص:126

[3] تاج العروس، الزبیدی، 16/23

[4] سورۃ الانفال: 8/41

پہلا اختلاف اس حوالے سے ہے کہ خمس کن چیزوں پر واجب ہوتا ہے۔ مذاہب اربعہ یعنی امامیہ کے علاوہ باقی چاروں فقہی مذاہب میں بالاتفاق خمس فقط مال غنیمت اور رکاز میں واجب ہے۔ جب کہ مذہب امامیہ کے نزدیک خمس چھ چیزوں پر واجب ہوتا ہے۔ جن میں جنگ سے حاصل ہونے والا مالِ غنیمت، زمین کے اندر سے نکالی جانے والی معدنیات، رکاز، سمندر سے غوطہ خوری کے ذریعے نکالے جانے والے موتی وغیرہ، حرام میں مخلوط ہونے والے مالِ حلال اور کاروبار (یا روزگار) سے حاصل ہونے والا منافع شامل ہیں۔ ان چیزوں میں معین شرائط پورے ہونے کی صورت میں خمس واجب ہو جاتا ہے۔

خمس کے باب میں موجود دوسرا مسلکی اختلاف اس کے مصارف کے حوالے سے ہے۔ اگرچہ قرآن مجید میں مصارفِ خمس کے بارے صریحاً ارشاد موجود ہے لیکن اس میں بچند وجوہ رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد اختلافات نظر آتے ہیں۔

امام شافعی اور امام احمد ابن حنبل کے مطابق خمس کے مال کے پانچ حصے ہیں۔

ابن ابی العزاء لکھتے ہیں کہ

"سهم لرسول الله -صلى الله عليه وسلم- يصرف في الكراع والسلاح ومصالح المسلمين،وسهم لذوي القربى وهم بنو هاشم وبنو المطلب ابني عبد مناف، و سهم لليتامى، و سهم للمساكين ، سهم لابن السبيل "[1]

ترجمہ: رسول اللہؐ کا حصہ مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کرنا ہو گا، "ذوی القربی" کا حصہ بنو ہاشم، بنو عبد المطلب اور بنو عبد مناف میں تقسیم کیا جائے گا۔ جب کہ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ایک ایک حصہ ہو گا۔

وھبہ زحیلی کے مطابق خمس کی تقسیم کا اختیار امام یا حاکم کو ہے چنانچہ اس بابت وہ لکھتے ہیں کہ:

"إن أمرالقسمة موكول إلى نظر الإمام، ومصروف في مصالح المسلمين. وما ذكر في الآية تنبيه على أهم من يدفع إليهم الخمس"[2]

---

[1] التنبیہ علی مشکلات الھدایۃ، علی بن علی ابن ابی العز، مکتبۃ الرشد ناشرون، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، طبع اول 2003ء، 4/250

[2] الفقہ الاسلامی وادلتہ، وہبہ بن مصطفی زحیلی، دار الفکر، دمشق، طبع رابعہ، سال اشاعت ندارد، 8/5900

ترجمہ: خمس کا مال مصالحِ مسلمین میں استعمال ہو گا، البتہ اس کی تعیین کا اختیار امام کو حاصل ہے۔ خمس کی آیہ میں جن مصارف کا ذکر کیا گیا ہے وہ صرف خمس کی اہم ترین جگہوں کی تعیین کے لیے تنبیہ کے طور پر ہے۔

امامیہ کے نزدیک خمس کے چھ حصوں میں سے تین یعنی اللہ، رسول خداؐ اور ذوی القربیٰ کے حصوں کو امام یا نائب امام اپنی صوابدید کے مطابق مسلمانوں کے مصالح میں استعمال کریں گے۔ جب کہ باقی تین حصوں کو بنو ہاشم کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو دیا جائے گا اور بنو ہاشم کے علاوہ کسی اور کو خمس کا مال ہر گز ادا نہیں کیا جا سکتا اگرچہ وہ مسکین، یتیم اور مسافر ہی کیوں نہ ہوں۔[1]

امام ثوری کے مطابق خمس اور فئ ایک ہی چیز ہیں، پس ان کو بیت المال میں ڈالا جائے گا اور رسول اللہؐ کے اقرباء میں تقسیم کیا جائے گا۔[2]

علامہ شیبانی لکھتے ہیں کہ پہلے تینوں خلفاء راشدین کے دور میں خمس صرف تین ہی حصوں میں تقسیم ہوا کرتا تھا، چنانچہ وہ رقم طراز ہیں کہ:

"وقد بلغنا أن أبا بكر الصديق وعمر وعلياً – رضي الله عنهم – أنهم كانوا يقسمون الخمس على ثلاثة أسهم: لليتامى والمساكين وابن السبيل"[3]

ترجمہ: حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم خمس کو تین حصوں میں بانٹتے تھے یعنی یتیموں کا حصہ، اور مسکینوں اور مسافروں کا حصہ۔

خمس کے حوالے سے ایک اور قول بھی بعض محققین کی طرف سے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ خمس کے کل پانچ حصے کیے جائیں گے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبد العظیم بدوی لکھتے ہیں کہ مالِ غنیمت میں سے پانچویں حصے کی مزید پانچ تقسیمیں ہوتی ہیں۔ پہلا حصہ

---

[1] الفقہ علی المذاہب الخمسہ، محمد جواد مغنیہ، ص188

[2] التنبیہ علی مشکلات الھدایۃ، ابن ابی العز، 4/251

[3] الاصل، محمد بن حسن بن فرقد شیبانی، دار ابن حزم، بیروت، طبع اول 2012ء، 7/439

رسول اللہ ؐ کا ہے جو کہ ان کے بعد مصالح مسلمین میں استعمال ہو گا۔ایک حصہ ذوی القربی یعنی بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب کے لیے ہے۔ تیسرا حصہ یتیموں کے لیے، چوتھا مساکین اور پانچواں مسافروں کے لیے ہے۔ [1]

شاہ ولی اللہ دہلوی کے مطابق خمس کی پانچ ہی مدیں اور مصارف ہیں البتہ خمس کی کل مقدار امام یا حاکم کے سپرد کی جائے گی اور پھر وہ خمس کو انہی مصارف میں استعمال میں لائیں گے۔ چنانچہ وہ رقم طراز ہیں کہ:

"فَيُوضَع سهم رَسُول الله صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بعده فِي مصَالح الْمُسلمين الأهم فالأهم، وَسَهْم ذَوي الْقُرْبَى فِي بني هَاشم وَبني الْمطلب الْفَقِير مِنْهُم والغني وَالذكر وَالْأُنْثَى، وَعِنْدِي أَنه يُخَيّر الإِمَام فِي تعْيين الْمَقَادِير، ، وَسَهْم الْيَتَامَى لصغير فَقير لَا أَب لَهُ، وَسَهْم الْفُقَرَاء وَالْمَسَاكِين لَهُم يُفَوض كل ذَلِك إِلَى الإِمَام يجْتَهد فِي الْفَرْض وَتَقْدِيم الأهم فالأهم وَيفْعل مَا أدّى إِلَيْهِ اجْتِهَاده"[2]

ترجمہ: رسول اکرم ؐ کی رحلت کے بعد سے ان کا سہم مسلمانوں کے مصالح میں اہم فالاہم کے مطابق استعمال ہو گا۔جب کہ " ذوی القربی "کا حصہ بنو ہاشم اور بنو عبد المطلب میں سے امیر و غریب، مرد و عورت میں سے ہر ایک کو ملے گا۔اور امام کو ان کے حصے مقرر کرنے کا اختیار حاصل ہے۔اور یتیموں کا حصہ ان بچوں میں تقسیم ہو گا جو ابھی چھوٹے ہوں اور ان کو والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا ہو۔ فقراء اور مساکین کا حصہ بھی ان پر خرچ کیا جائے گا۔یہ سب کا سب مال (یعنی سارا خمس) امام یا حاکم کے کے سپرد ہو گا، ان کو اختیار ہے کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق اور اپنے اجتہاد کی رو سے اہم ترین مسائل میں خرچ کرے۔

علامہ ابن حزم بھی خمس کے پانچ حصے کرنے ہی کے قائل ہیں [3]، البتہ بنی ہاشم، بنی عبد مطلب اور بنی عبد مناف کے حصے کے بارے میں وہ قائل ہیں کہ اس کو اسی مد کے سب کے سب افراد میں تقسیم کیا جائے گا چاہے وہ غیر مستحق ہی کیوں نہ ہوں۔

---

[1] الوجيز في فقه السنة والكتاب العزيز، عبد العظيم بن بدوي بن محمد، دار ابن رجب، مصر، طبع ثالثة 2001، ص:490

[2] حجة الله البالغہ، احمد بن عبد الرحيم بن شهيد وجيه الدين (شاہ ولی اللہ)، دار الجيل، بيروت، طبع اول، 1426ھ، 2/272

[3] المحلی، ابن حزم، مسئلہ 949، ص5/379

مسئلہ فقر کو حل کرنے کے لیے نظامِ زکاۃ و خمس اور عشر کا کردار

مذہبِ اسلام میں فرد اور معاشرے کی تمام جائز اور مناسب ضروریات کے لیے قانون سازی اور احکامات وضع کیے گئے ہیں۔ سامانِ معیشت اور وسائل و ضروریات زندگی کے حوالے سے اسلام تم افراد کو اکتساب رزق، محنت و مزدوری اور کام کے ذریعے اپنی اور اپنے زیر کفالت افراد کی روزی مہیا کرنے کا پابند بنا دیتا ہے۔ جو افراد کسی بھی وجہ سے محنت مشقت کرنے یا اپنی روزی کمانے کے قابل نہ ہوں تو اسلام قرابت داروں سے صلہ رحمی اور اچھا معاملہ کرنے کا حکم دے کر ایسے افراد کے قریبی خوشحال رشتہ داروں پر ان لوگوں کی مدد اور تعاون کو ضروری قرار دیتا ہے۔ کتاب اللہ میں بارہا قرابت داروں سے اچھا برتاؤ کرنے اور مالی امور میں ان سے تعاون کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ممکن ہے کسی نادار، مفلس اور بے کس فرد کو ایسے رشتہ دار میسر نہ ہوں جو اس کی نگہداشت کر سکیں اور اس کے مالی امور میں اس کی معاونت کر سکیں تو ایسی صورت میں اسلام ان مفلسوں کو بے سہارا نہیں چھوڑتا بلکہ مال داروں کے مال میں غریبوں کے حق کو وضع کرتا ہے تاکہ یتیموں، غریبوں، بیواؤں اور سن رسیدہ عاجز و مجبور افراد نیز عاجز، بے روزگار اور مصیبت زدہ افراد بے سہارا اور بے آسرا نہ رہ جائیں اور زندگی ان کے لیے وبالِ جان نہ بن جائے۔ لہٰذا ان تمام افراد کو اسلام ان کے حال پر نہیں چھوڑتا کہ وہ بھوک و افلاس اور غربت و محرومی کی تصویر بن کر رہ جائیں بلکہ ان کی سرپرستی کے لیے ایک نظام وضع کرتا ہے جس کا نام نظامِ زکاۃ ہے۔ اس نظام کے ذریعے اسلام دولت مند اور ثروت مند لوگوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جو کچھ ان کی ضروریات زندگی میں سے ان کے پاس بچ جائے اور فاضل رہ جائے وہ سب کا سب نہ سہی لیکن اس کی مخصوص مقدار ان غریبوں، محتاجوں، فقیروں، مسکینوں، بیواؤں اور محتاج و بے کس لوگوں پر خرچ کریں اسی مطالبے اور شریعت کی نگاہ میں زکاۃ کہتے ہیں۔ اب اس فاضل دولت اور بچ جانے والی چیزوں کو جن جن مقامات پر خرچ کرنے کی اجازت دی اور جن کو مصارفِ زکاۃ، مصارف خمس اور عشر کہتے ہیں ان سب میں قدر مشترک اور مرکزی نکتہ فقر و افلاس اور غریبی و محتاجی ہے۔

رسول خدا ﷺ اپنے صحابی معاذ ابن جبل کو یمن روانہ فرما رہے تھے تو ان سے ارشاد فرمایا تھا:

((فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللَّهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ))[1]

---

[1] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب الزکاۃ، باب وجوب الزکاۃ، حدیث رقم 1395، ص 2/104

ترجمہ: جان رکھو کہ ذات حق سبحانہ و تعالی نے اُن کے مال میں صدقہ رکھا ہے، پس تم وہاں کے دولتمندوں سے اس کو وصول کرنا اور وہاں کے غریبوں اور فقرء میں اس کو تقسیم کر دینا۔

یوں آپؐ نے وہاں سے لیے جانے والے صدقے اور زکاۃ کے مال کے بارے حکم فرمایا کہ اس کو وہیں پر غربت و فقر کے خاتمے کے لیے مستحق لوگوں میں تقسیم کیا جائے۔ دراصل زکاۃ کی فرضیت کے پیچھے جو حکمت کار فرما ہے وہ یہی کہ اس کے ذریعے لوگوں کی محرومی و محتاجی کا خاتمہ کیا جاسکے، جیسا کہ تاریخ کے ایسے ادوار بھی ملتے ہیں کہ جب زکاۃ لینے والا مستحق کہیں نہیں ملتا تھا۔

نظامِ زکاۃ ہو یا اسلام کا خمس و عشر کا نظام یہ سبھی غربت و افلاس کے مسئلے کو ختم کرنے کے لیے مندرج ذیل طریقے پر اثر انداز اور مدد و معاون ہوتے ہیں۔

زکاۃ و خمس اور عشر کے اقتصادی فوائد و اثرات

زکاۃ، خمس اور عشر کے نظاموں کے انسانی معاشرے پر پڑنے والے اثرات میں سے سب سے زیادہ نمایاں اقتصادی میدان میں ہی ہوتے ہیں۔ دراصل اسلام کے مقرر کردہ نظام کا کرشمہ ہے جسکی بدولت سرمایہ دار کی دولت کی گردش عمل میں آتی ہے، تب غریب کے گھر کا چولہا جلتا ہے اور جس کی بدولت فقراء کی زندگی کی بنیادی اور اساسی ضروریات مہیا ہوتی ہیں۔ زکاۃ، خمس اور عشر کے معاشرے پر پڑنے والے اقتصادی اثرات حسبِ ذیل ہیں۔

(i) بیکار اور معطل انسانی صلاحیتوں کو متحرک کرنا

مسئلہ فقر و افلاس کو حل کرنے میں زکاۃ و خمس وغیرہ کا براہ راست اثر مسلم معاشرے میں معطل اور بے کار پڑی ہوئی انسانی و بشری طاقتوں کو سماج کے لیے پیداواری صلاحیتوں میں بدل دینے کی صورت میں پڑتا ہے۔

چونکہ ان کی حقیقت کا تعلق محروم اور غریب لوگوں کی انفرادی ضروریات کو پورا کرنا اور ان کو بے کار اور نکما بیٹھے رہنے کی دعوت دینا یا ان کے فارغ رہنے کی حوصلہ افزائی کرنا ہرگز نہیں ہے، بلکہ ان کی تشریع کا اصل مقصد افراد معاشرہ کے ساتھ مدد اور تعاون کرنے اور انکی مہارتوں اور صلاحیتوں کو ضائع ہونے سے بچانا اور ان کو مجتمع انسانی کے فائدے میں استعمال کرنا ہے۔ ان کے اوپر عائد ہونے والی معاشرتی و عائلی ذمہ داریوں کا احساس دلانا اور ان ذمہ داریوں سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے ان سے تعاون کرنا ہے۔ اور انہیں ایک مہذب ذریعہ معاش کو یقینی بنانے کے لیے ان کی صلاحیتوں اور توانائیوں کا بہترین استعمال کرنا ہے۔

اس صورت حال میں زکاۃ و خمس کا غربت کا سبب اور علت بننے والے اسباب کا قلع قمع کرنے میں کردار نہایت اہم ہے۔ دراصل یہی وہ اسباب ہیں جو افراد معاشرہ کی ذہنی و فنی صلاحیتوں کو معطل کر دیتے ہیں اور انہیں معاشرے کی بہتری و فائدے کے لیے اپنا حصہ ڈالنے اور کردار کرنے سے روک دیتے ہیں۔

اس بات کا ادراک کہ اسلام کا نظامِ زکاۃ و خمس و عشر، غربت کا سبب بننے والی چیزوں کا خاتمہ کیسے کرتا ہے، اسی صورت میں ہو گا جب غربت کے اسباب سے آشنائی ہو گی۔ غربت کے بنیادی طور پر دو قسم کے اسباب ہوتے ہیں:

(الف): غربت کے ذاتی اسباب:

یہ وہ اسباب ہیں کہ جو کسی بھی نامیاتی یا جسمانی و ذہنی معذوری یا کمزوری کی وجہ سے افراد میں پائے جاتے ہیں، مثلاً معاشرے کے تین طرح کے افراد یعنی بچے، سن رسیدہ یا معذور افراد عموماً غربت کے ذاتی اسباب کا نشانہ بنتے ہیں۔ یہ تینوں قسم کے افراد بنیادی طور پر معیاری اور معقول آمدنی کمانے سے سرے سے قاصر ہوتے ہیں چاہے معاشرے میں ملازمتوں کی بہتات ہی کیوں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔ البتہ ان تینوں قسم کے افراد کی ضروریات الگ الگ ہیں۔ سن رسیدہ افراد پر انفاق کا مطلب ان کو فقط کھانے، پینے، رہائش اور صحت و خدمت کے حوالے سے مناسب سہولیات کی فراہمی ہے۔ جب کہ بچوں پر انفاق کا معاملہ بوڑھوں کی نسبت بالکل الگ ہے اس لیے کہ ان ہر کیا جانے ولا انفاق صرف کھانے پینے اور رہنے کے حوالے سے بنیادی ضروریات زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ ان پر کیا جانے والا انفاق ان کی صحیح تربیت، تعلیم، صحت، فنی صلاحیتوں کو نکھارنے اور انہیں معاشرے کا مفید شہری بنانے کو بھی شامل ہے۔ پر بچوں پر کیا جانے والا انفاق ان کی مادی اور معنوی ہر دو طرح کی ضروریات کو پورا کرنے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ زکاۃ کا بالآخر مطمع نظر اور فائدہ ان کی صلاحیتوں کو نکھارنا اور انہیں ایک کامیاب مستقبل کے لیے آمادہ کرنا ہے جہاں ان کے راستے میں کہیں غربت وافلاس کا گزر نہ ہو سکے۔

معذور افراد کا مسئلہ ان دونوں گروہوں سے الگ ہے۔ معذور افراد اگر اپنی صحت اور تندرستی سے مایوس ہوں اور ان کی معذوری مستقل اور دائمی ہو اور ان کے لیے کام کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں ان پر ان کے کھانے پینے رہائش اور علاج کے اخراجات زکاۃ سے ادا کیے جاسکتے ہیں، لیکن بالفرض انکی معذوری عارضی ہو اور ان کے لیے دوبارہ سے کام کے قابل ہو جانا ممکن ہو تو اس صورت میں ان کی بنیادی ضروریات زندگی کی فراہمی بیت المال یا مال زکاۃ سے کی جائے گی البتہ اس کے ساتھ بیت المال سے ان کے لیے دوبارہ اپنی نارمل زندگی میں لوٹنے کے لیے علاج

معالجہ، تعلیم، اور دیگر تمام ضروری چیزوں کی فراہمی کی جائے گی تاکہ وہ دوبارہ سے معاشرے میں باعزت زندگی کو جاری رکھ سکیں۔[1]

ان تینوں مواقع پر، جو کہ فقر و افلاس کے ذاتی اسباب کے مواقع ہیں، بیت المال المسلمین اور مال زکاۃ و خمس ہی ہیں جو ان ذاتی اسباب کے طاری ہونے کے بعد معاشرے کے ان تین طبقوں کی زندگی کو بحال رکھتے ہیں اور ممکنہ حد تک ان اسباب کو ختم کرکے ان سے متاثرہ افراد کو معاشرے کے مفید اور صحت مند شہری بنانے میں مدومعاون ہوتے ہیں اور یوں غربت کے خلاف ایک بڑا وسیلہ وذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔

(ب) غربت کے خارجی اسباب

خارجی اسباب سے مراد ایسے اسباب ہیں جو کسی انسان کی جسمانی یا عضوی کمزوری و معذوری کی وجہ پیدا نہیں ہوتے بلکہ یہ ایسے حالات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں جو اس کے دائرہ اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ دراصل یہ اسباب اقتصادی حالات ومشکلات کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ مثلاً مہنگائی، بے روزگاری، آبادی میں اضافہ اور جہالت وغیرہ۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان اسباب کو روکنے اور حل کرنے میں زکاۃ اور خمس و عشر کا جو کردار ہے وہ اقتصادی کردار ہی ہوگا۔

جب ان اقتصادی حالات واسباب کے طاری ہو جانے کی وجہ سے متوسط درجے کی آمدن والے افراد اپنی ضروریات زندگی کو اپنی محدود آمدن کے ساتھ اپنی حیثیت ومقام کے مطابق پورا کرنے سے عاجز ہو جاتے ہیں یا پھر مثلاً ان اقتصادی مشکلات کے پیشِ نظر جو کچھ سرمایہ یا کاروبار یا بچت تھی وہ ضائع یا ختم ہو جائے تو اس طرح کے حالات میں زکاۃ سے ایسے افراد کی آمدن کی کمی پوری ہو سکتی ہے۔

زکاۃ ہر طرح کے اقتصادی مشکلات کی صورت میں نہیں دی جاسکتی بلکہ ضروری ہے کہ وہ مشکلات ایسی ہوں جن کو رفع کرنا انسان کی تمام تر کوشش وکاوش اور محنت ومشقت کے باوجود ممکن نہ ہو سکا۔ وگرنہ ایسی بے روزگاری کہ جس کہ وجہ آدمی خود ہو، اور کام کے مواقع اور صلاحیت ہونے کے باوجود کام نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہونے والی بے روزگاری زکاۃ لینے کی وجہ نہیں بن سکتی۔ اس ضمن میں رسالتمآبؐ کا ارشاد ہے، جب آپؐ سے دو لوگوں نے صدقہ کا مطالبہ کیا تو آپؐ نے فرمایا:

((إِنْ شِئْتُمَا أَعْطَيْتُكُمَا مِنْهَا، وَلَا حَظَّ لِغَنِيٍّ وَلَا لِقَوِيٍّ مُكْتَسِبٍ))[2]

---

[1] الدور الاقتصادي التنوي للزكاة من خلال معالجتها لقضية الفقر، احمد عوران، مجلة دراسات، الجامعة الأردنية، المجلد 26، العدد 1، 1999، ص 9

[2] مسند احمد بن حنبل، امام احمد ابن حنبل، حدیث رقم 23063، ص 38/ 162

ترجمہ: اگر تم دونوں چاہو تو میں تمہیں اس میں سے دے دیتا ہوں لیکن اس میں دولت مند اور کمانے کی اہلیت و قابلیت رکھنے والوں کا حصہ نہیں ہے۔

بظاہر یہ دونوں احادیث زکاۃ کے مستحقین کے بارے میں ہیں اور اس کے مصارف کو بتلا رہی ہیں، مگر ان میں دوسرا اہم ترین نکتہ بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ کام کرنے کی صلاحیت و قابلیت رکھنے والے افراد کو محنت اور کام کی طرف ابھارا گیا ہے اور سستی و کاہلی اور بے عملی کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے کہ اگر کسی کے گھر میں اس کی اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے فقر و افلاس آ گیا ہے تو وہ اس رحم کے قابل نہیں کہ مالِ زکاۃ اس کو ادا کیا جائے۔ اور کام، مشقت اور محنت کرنے والوں کی گویا کہ حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

زکاۃ کا یہی پہلو فقر و غربت کے خاتمے کے لیے معاون اور مددگار ہے کہ اس میں کام کرنے اور محنت و مشقت کرنے کی حوصلہ افزائی جب کہ ایسا نہ کرنے والے کو مال زکاۃ سے دور رکھ کر اس کی حوصلہ شکنی کی گئی اور اسے محنت اور مشقت کا راستہ دکھایا گیا ہے۔ یوں معاشرے میں معطل شدہ اور ضائع شدہ انسانی توانائیاں اور طاقتیں ایک بار پھر میدانِ عمل میں آئیں گی اور یوں معاشرہ مالی خوش حالی کے رستے پر گامزن ہو گا۔[1]

یہ ایک مسلمہ اور معلوم حقیقت ہے کہ غربت و افلاس کے اسباب میں سے ایک اہم وجہ ارتکاز دولت یا دولت کی گردش کے عمل کا رک جانا ہے۔ جب کہ دوسری طرف اسلامی اموالِ واجبہ یعنی زکاۃ، عشر اور خمس وغیرہ دولت کی تقسیم و گردش کا مؤثر ترین وسیلہ اور سبب ہیں، جس کے ضمن میں ہر سال صاحبانِ ثروت و مال اپنے مال کا خود احتساب کرتے ہیں اور ضروریات زندگی سے بچ جانے والی دولت میں سے ایک خاص حصہ ہر سال غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرتے ہیں جس سے دولت ان کے ہاتھ سے نکل کر محروم طبقات کا رخ کرتی ہے جس کے سبب غریب کے حالات اور ملک کی معیشت دونوں میں بہتری و ترقی ہوتی ہے۔ گویا زکاۃ ایک ایسا اسلامی ٹول (Tool) ہے جو سالانہ دولت کی بہت بڑی مقدار (Amount) کو امیروں سے غریبوں میں منتقل کرتا ہے۔

(ii) سرمایہ کاری کے حجم میں اضافہ

جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا کہ زکاۃ و خمس وغیرہ کے فوائد و ثمرات میں سے ایک افرادِ معاشرہ کی معطل صلاحیتوں کو دوبارہ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اب یہاں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ جس معاشرے میں زکاۃ، خمس اور عشر کے مال کو سرمایہ کاری کے طور

---

[1] الزكاة والتنمية في البيئة الإسلامية، المرسي السيد حجازي، مجلة جامعة الملك عبد العزيز، الاقتصاد الاسلامي، المجلد 17، عدد 2، 1425ھ، ص 14-15

پر پیش کیا جا رہا ہو پھر انہی کے ذریعے سے افراد معاشرہ کو معاشی حوالے سے مزید سرگرم بھی کیا جائے اور ان کی تمام طاقتوں اور توانائیوں کو معاشی شعبے میں لگا دیا گیا ہو ایسے معاشرے میں سرمایہ کاری کا کیا سماں اور ماحول موجود ہو گا۔

اقتصادیاتِ اسلام کے ماہرین کا قائل ہیں کہ اموالِ زکاۃ و صدقات، فقراء پر سرمایہ کاری کی مختلف شکلوں کی صورت آزمائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً زکاۃ کے مال سے انہیں ایسی چیزیں خرید کر مہیا کرنا ممکن ہے جن کی بنیاد پر وہ کسی پیشے کو اپنا کر اپنے معاشیات کا بندوبست کر سکیں جیسا کہ سلائی مشین وغیرہ یا پھر زکاۃ کے پیسے کو خرچ کر کے فقراء کو فنی مہارت کے مختلف میدانوں میں تربیت دینا، یا زکاۃ کے مال کو کسی منافع بخش میدان میں انویسٹ کر کے پھر غرباء میں تقسیم کر دینا یا ان کے فائدے کے کسی بھی شعبے میں اس کو استعمال کرنا یا پھر مختلف اثاثوں یا شئیرز کو خرید کر غرباء میں تقسیم کرنا وغیرہ ایسے اقدامات ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف فقراء کو مالِ زکاۃ کے فوائد ملیں گے بلکہ اس سے ملک میں سرمایہ کاری بھی بڑھے گی جس کے ملکی معیشت پر دوررس اور مفید و موزوں اثرات پڑیں گے۔[1]

معاشرے میں نظامِ خمس و عشر اور زکاۃ کی مندرجہ بالا معاشی سرگرمیوں کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ ایسا معاشرہ جس میں ان مالی مدوں کی صورت میں ایک خاص مقدار فقراء و مستحقین کو دی جاتی ہو، اس میں سرمایہ کاری کا حجم ان معاشروں سے کہیں زیادہ اور مختلف ہو گا جن میں اس طرز کی معاشی سرگرمیاں نہیں ہوتیں۔

(iii) معاشی انصاف کا حصول

انسانی سماج میں ایک طرف دولت کی ریل پیل اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف شدید غربت و افلاس ایک نہایت سنگین اور بہت بڑی معاشرتی آفت ہے۔ اسلام دولت کے حصول میں توازن کے لیے انتہائی حساس واقع ہوا ہے۔ لہذا جمعِ دولت کے رجحان کے خاتمے اور تقسیم دولت کے تحقق پذیری کے لیے اس میں باقاعدہ قانون سازی کی گئی ہے جس کو شریعت کی زبان میں زکاۃ و صدقات کا نظام کہا جاتا ہے۔[2]

ان مالی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے پیشِ نظر ایک ہدف یہی ہے کہ اشیاء کی ملکیت کو مزید پھیلا دیا جائے، اور مالکوں کی تعداد میں مزید اضافہ عمل میں لایا جائے تاکہ جو لوگ فقر و حاجت سے نکل رہے ہیں وہ اپنی آنے والی زندگی میں اپنے وسائل کے خود

---

[1] اثر الزکاۃ علی تشغیل الموارد الاقتصادیۃ، محمد ابراہیم السحیباني، طبع اول، 1990ھ، ص175

[2] دور الزکاۃ في الاقتصاد الاسلامي والسیاسۃ المالیۃ، محمد انس الزرقا، ندوۃ اقتصادیات الزکاۃ، المعھد الاسلامي لبحوث والتدریب، البنک الاسلامي للتنمیۃ، جدۃ، طبع ثانیہ 2002، ص459.

مالک رہیں اور ان وسائل سے اپنی خوشحال زندگی کے لیے منصوبہ سازی کر سکیں۔زکاۃ کے معاشرے میں پائے جانے والے اس کردار کے بارے میں علامہ یوسف قرضاوی لکھتے ہیں کہ:

”ان من اهداف الاسلام الكبيرة فى ميدان الاقتصاد و الاجتماع، اقامة توازن الاقتصادى و اجتماعى عادل،و مقتضى هذا ان يشترک الناس فى الخيرات والمنافع التى اودعها الخالق فى هذا الارض ، و لا يقتصر تداولها على فئة الاغنياء وحدهم و يحرم الآخرون، و من هنا يعمل الاسلام على عدالة التوزيع ، و تقارب الملكيات فى المجتمع، و هو بنظام الزكاة والفىء و غيرهما يعمل على اعادة التوازن ، و تضييق الفوارق، و تقريب المستويات بعضها من بعض“[1]

ترجمہ:بے شک معاشرتی و معاشی میدان میں اسلام کے بڑے اور اہم اہداف میں سے ایک یہ ہے کہ اقتصادی توازن اور اجتماعی عدل کا نفاذ کیا جاسکے۔اور پروردگار عالم نے زمین و آسمان میں جو کچھ بھی منافع بخش، ثمر آور اور خیرات والی چیزیں رکھی ہیں اس میں تمام لوگوں کا اجتماعی حق ہو۔اور ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ صرف امیر طبقے کی دسترس میں ہوں اور غریب اس سے محروم ہی رہیں۔یہیں سے اسلام تقسیمِ دولت میں توازن و عدالت کو عمل میں لاتا ہے اور اس مقصد کے لیے جو نظام متعارف کراتا ہے وہ زکاۃ وفئ وغیرہ کا نظام ہے۔یوں اسلام معاشرے میں توازن قائم کرنے،معاشی تفاوت کو کم کرنے اور معاشی درجات ایک دوسرے کے قریب تر رکھنے کے لیے قانون سازی کرتا ہے۔

نظامِ زکاۃ وخمس وعشر کے معاشرتی فوائد واثرات

قرآن مجید میں بیان ہونے والے مصارف زکاۃ اور سنت نبوی میں وارد ہونے والی اس کی تفاصیل ، پھر خمس و عشر اور ان کے مصارف کی تفصیلات سے اس حقیقت کا پتا چلتا ہے کہ ان نظاموں کا انسانی معاشرے کی تعمیر و ترقی ، فلاح و بہبود اور سماجی تحفظ و یکجہتی میں اہم اور مرکزی کردار ہے۔فقہاء اسلام اور اقتصادِ اسلامی کے ماہرین زکاۃ کو اجتماعی تکافل اور سماجی تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ اور ضامن قرار دیتے ہیں۔

---

[1] دور الزکاۃ فی علاج المشکلات الاقتصادیۃ وطرق نجاحھا، یوسف قرضاوی، دارالشروق، قاہرہ، طبع اول 2001، ص50،49

سماجی تعلقات کے مطالعہ کو روسے کسی بھی معاشرے میں پائی جانے والی برائیاں پورے معاشرے کو متاثر کرتی ہیں، اور جب تک ان کے سامنے بند نہ باندھا جائے اور ان کو حل نہ کیا جائے پورا معاشرہ بے چینی اور بد امنی کی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسلام کی طرف سے عائد کردہ مالی حقوق کے یہ نظام، انسانی سماجی تعلقات کی بحالی اور ان میں مضبوطی پیدا کرنے کا سبب ہیں۔ جس معاشرے میں امراء کا طبقہ اس معاشرے کے غرباء کو زکاۃ (خمس اور عشر کی صورتوں) میں اپنا مال ادا کرتا ہے وہاں دونوں طبقوں میں معاشی حوالے سے تفاوت و فرق کے باوجود اخوت، محبت، احساس اور رواداری کا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہتا ہے۔[1]

انسانی نفسیات کے مطابق امیر طبقہ جب اپنا مال فقرء کو ان مذکورہ عنوانات کے تحت ادا کرتا ہے تو ان کے حال سے باخبر رہنا اور ان کی احوال پرسی کرتے رہنا ایک فطرتی امر بن جاتا ہے۔ مال دار

طبقے کی اس بارے دلچسپی برقرار رہتی کہ مثلاً زکاۃ کا مال پہنچنے کے بعد اب فقرء کے حالات کیسے ہیں۔ جب کہ دوسری طرف جب امراء اپنی مالی حقوق کی ادائیگی کرتے ہیں تو محروم طبقے میں ان کے خلاف حسد اور بغض کے میلانات کی بجائے ان کے دل میں امراء سے محبت و اخوت اور ان کے لیے طلب خیر جیسے احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر زکاۃ جیسے مالی فرائض کی ادائیگی نہ کی جائے تو وہ معاشرہ امیر و غریب میں تقسیم ہو جاتا ہے، حسد و بغض کی آگ سینوں میں جل اٹھتی ہے اور معاشرہ عدم توازن کا نمونہ نظر آتا ہے۔

انسانی سماجی تعلقات میں مختلف وجوہات سے تفاوت آتا رہتا ہے۔ اس تناظر میں ضروری ہے کہ معاشرے میں ایسے عناصر موجود ہوں جو ان تعلقات میں پیدا ہونے والی خلیج اور رکاوٹوں کو دور کر سکیں اور معاشرے کو ہمیشہ اخوت و برادری کی کڑی میں پروئے رکھیں۔ اسلامی معاشرے میں یہ کام کرنے کے لیے زکاۃ و صدقات کا نظام کلیدی اور مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ زکاۃ کے مصارف میں سے "غارمین" کا مصرف اس مقصد کی تکمیل کرتا ہے اور معاشرے میں معاشی مشکلات حل کرنے میں مد و معاون ہے۔ اسلام قرض دار کو زکاۃ کے مال سے مدد فراہم کر کے پیدا ہونے والے فاصلوں اور مسائل کو ختم کرتا ہے۔

اسلامی اقتصاد کے بعض ماہرین کے مطابق "غارمین" کا مصرف صرف قرض کے مسائل میں منحصر نہیں، بلکہ یہ عنوان لوگوں کے ایک دوسرے پر عائد ایسے تمام مالی حقوق کو شامل ہے جنکی ادائیگی مالی طور پر ممکن نہ رہی ہو مثلاً دیت اور دیگر تمام مالی معاوضے وغیرہ۔ اس مصرف کے بارے میں امین مصری لکھتے ہیں کہ:

---

[1] دور الزکاۃ فی علاج المشکلات الاقتصادیۃ وطرق نجاحہا، یوسف قرضاوی، ص38

"والذي من مقتضياته دفع ما يقتضيه الصلح بين قبيلتين أو أسرتين من تعويضات وديات حتى تخمد الفتنة وتنتشر السكينة ويعم الأمن والاستقرار، وهو ما استخلصه الفقهاء من حديث قبيصة بن المخارق الهلالي الذي تحمل حمالة إصلاح ثم اتى النبي صلى الله عليه وسلم يسأله المعونة فيها – ولم يكن في ذلك حرج[1]– فقال له النبي صلى الله عليه وسلم: (أقم حتى تأتينا الصدقة فنأمر لك بها)"[2]

ترجمہ:(غارمین کے مصرف)کا تقاضی یہ ہے کہ زکاۃ کو دو قبیلوں یا دو خاندانوں کے درمیان صلح کروانے کے لیے بھی ادا کیا جاسکتا ہے تاکہ فتنہ ختم ہو جائے اور معاشرے میں امن و استقرار قائم ہو۔اسی معنی کو فقہاء نے قبیصہ بن خارق ہلالی کی حدیث سے اخذ کیا ہے جنہوں نے اصلاح کا علم اٹھایا اور رسول خداؐ کے حضور میں آکر مدد کا طالب ہوا[3](جس میں کوئی حرج بھی نہیں تھی)۔خاتم الرسل اس سے یوں مخاطب ہوئے:"ہمارے پاس ہی رکو یہاں تک کہ صدقہ (یعنی زکاۃ)کا مال آجائے اور اس میں سے ہم تمہیں دے دیں۔"

صرف یہی نہیں بلکہ معاشرے کی بھلائی اور فلاح کے دیگر کاموں میں زکاۃ اور صدقات کو استعمال کرکے معاشی و سماجی تعلقات میں بہتری لائی جاسکتی ہے۔طبقاتی تفاوت ختم کیا جاسکتا ہے اور معاشرے میں امن و امان اور اخوت و ہمدردی کا بول بولا ہو سکتا ہے۔

نظامِ زکاۃ و خمس اور عشر کے معنوی فوائد و اثرات

اقتصادی و سماجی اثرات کے علاوہ زکاۃ و خمس وغیرہ متعدد روحانی و معنوی اثرات اور فوائد کے حامل ہیں۔مال سے محبت اور لگاؤ کا فطری غریضہ زکاۃ اور اس جیسی دیگر مالی عبادات کو انجام دینے کی بدولت جوں جوں کمزور ہوتا ہے ویسے ہی انسان روحانی طور پر مضبوط ہوتا ہے اور معنوی تکامل کے مدارج کو طے کرتا ہے۔

---

[1] مصرف الغارمين وآثره في التكافل الاجتماعي، رفيق المصري، مجلة جامعة الملك عبد العزيز، الاقتصاد الاسلامي، جلد18،عدد1، 1426ھ-2005، ص2

[2] صحیح مسلم،امام مسلم،کتاب الزکاۃ،باب من تحل لہ المسئلۃ،حدیث رقم 2،1044/ 722

[3] حضرت قبیصہ بن خارق نے دو قبیلوں کے درمیان ہونے والی لڑائی میں صلح کرانے کے لیے جب دیت کو اپنے ذمہ لیا تو آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر تعاون کی اپیل کی تاکہ دیت کی رقم ادا کی جاسکے۔

زکاۃ وخمس وغیرہ ادا کرنے کے نمایاں ترین اور اہم ترین آثار جو ان کے ادا کرنے والے پر ظاہر ہوتے ہیں وہ تطہیر و تزکیہء نفس ہیں۔ تطہیر سے مراد ہر طرح کی پاکیزگی ہے جس میں مال کی محبت سے پاکیزگی، خرچ کرنے کا اصول اپنانے کی وجہ سے بخل جیسی عادت رذیلہ سے پاکیزگی، اس کے علاوہ حسد، بغض اور انا وغیرہ سے پاکیزگی سب شامل ہیں۔ اور تزکیہ سے مراد حکم پروردگار کو اپنی ذاتی پسند اور رجحانات پر غالب کر دینا اور اپنے نفس کو اس کے حکم کے تابع کر دینا ہے۔[1]

علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ یہاں طہارت سے مراد:

"والطهارة لأنها تطهر النفس من رذيلة البخل والذنوب"[2]

ترجمہ: زکاۃ طہارت کا سبب ہے یعنی یہ نفس انسانی کو بخل اور گناہوں جیسے رذائل سے پاک کرتی ہے۔

زکاۃ وخمس و عشر اور دیگر مالی حقوق کو ادا کرنے والا معنوی آثار کو یوں بھی اخذ کرتا ہے کہ وہ اس بات کے شعور کو پالیتا ہے کہ وہ معاشرے کا ایک ممبر اور اکائی ہے اور معاشرے کی تعمیر میں اس کو اپنا کردار ادا کرنا ہے۔ نیز وہ اس ذریعے سے عوامی مصالح اور شخصی مصلحتوں کے درمیان توازن قائم کرنے کا عمل سیکھتا ہے۔ مزید یہ کہ اطمینان و سکون نفس بھی حاصل ہوتا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ زکاۃ کی ادائیگی گناہوں کا کفارہ، آفتوں اور مشکلات سے ڈھال اور اللہ کی رحمت کو جلب کرنے والی ہے۔ اور یہ اللہ کی رحمت ہی ہے جو دنیا و آخرت کی سعادت، اطمینان نفس اور ہر اچھائی کی بنیاد ہے۔

زکاۃ وخمس اور دیگر مالی واجبات ادا کرنے کے آثار و فوائد فقط ان کی ادائیگی کرنے والے فرد کی ذات تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ ان مالی حقوق کو حاصل کرنے والا بھی ان کے اثراتِ مفیدہ سے مستفید ہوتا ہے۔ اپنے مسلمان بھائی کی طرف سے عطا کیے گئے زکاۃ وخمس کے پیسے سے جب افراد کی حاجتیں اور ضروریات پوری ہوتی ہیں تو غریب افراد ایسی صورتحال میں سکون، سلامتی اور اطمینان کی کیفیت کو محسوس کرتے ہیں۔ ان کو خوشی ہوتی ہے کہ وہ بھی اسی سماج کا حصہ ہیں اور وہ اس معاشرے کا معطل حصہ اور ضائع شدہ یا گم شدہ چیز نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ایسے انسانی سماج میں موجود ہیں کہ جو محتاجوں کے حوالے سے انتہائی شفیق اور زندہ احساسات رکھنے والا ہے جہاں ان سے متعلقہ حقوق کا خیال اور لحاظ ہو اور آگے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھاما جاتا ہے۔

یہ احساسات در حقیقت اس کی شخصیت کی جیت اور اسکی نفسیات کی تطہیر کی وجہ ہیں۔ انہی کی بدولت وہ خود کو اس امت کا ایک فرد تصور کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس سبب وہ اپنے اندر غربت جیسے سخت حالات سے لڑنے کی ہمت اور عزت کو محسوس

---

[1] فقہ الزکاۃ، یوسف قرضاوی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، طبع سابعہ 2002، ص24

[2] فتح الباری شرح صحیح البخاری، احمد بن علی بن حجر العسقلانی، دار المعرفۃ، بیروت، 1379ھ، 1/319

کرتے ہیں۔ فقراء پر پڑنے والے ان اثرات کے سبب وہ مستقبل کے حوالے سے پریشانی سے نجات پا کر اپنے مستقبل کا اطمیان و سکون سے سامنا کرتے ہیں۔[1]

نظام صدقہ وخیرات اور فقر وافلاس کا خاتمہ

لفظ "صدقات" صدقہ کی جمع ہے، یہ لفظ "صدق" سے نکلا ہے، صدق کا مطلب ہوتا ہے سچائی۔ چونکہ یہ کسی بھی شخص کی سچائی، ایمان داری، باطن کی تطہیر اور پاکیزگی سے حکایت کرتا ہے لہذا اس کو صدقہ یعنی سچائی کا نام دیا گیا ہے[2]۔

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ صدقہ سے مراد ہر وہ مال ہے جس کو انسان اپنے مال میں سے (پروردگار کی) قربت کی نیت سے نکالتا ہے، جیسا کہ زکاۃ وغیرہ۔ لیکن اصل میں صدقہ اس مال کی ادائیگی کو کہا جاتا ہے جس کو ادا کرنا مستحب ہو۔ جب کہ واجب صدقہ کے لیے زکاۃ کا لفظ ہے[3]۔ یعنی ہر وہ مالی ادائیگی جس کا مقصد اللہ کی ذات کا قرب حاصل کرنا ہو صدقہ کہلائے گی۔ جیسا کہ محمد حطاب ہبہ کے باب میں بھی لکھتے ہیں کہ اگر ہبہ کا مقصد اللہ کی خوشنودی اور اس کا قرب حاصل کرنا ہو تو یہ ہبہ بھی صدقہ کہلائے گا اور اسی کے باب میں داخل ہوگا[4]۔ دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ فقہاء کی اکثریت نے لفظِ صدقہ کو مستحب صدقہ یا صدقہ تطوع کے لیے استعمال کیا ہے۔ علامہ شربینی کے مطابق:

"صدقة التطوع هي المرادة عند الإطلاق غالبا"[5]

ترجمہ: جب صدقہ کا لفظ مطلق استعمال ہو (اور اس میں کوئی ایسا قرینہ نہ ہو جس سے پتا چل سکے کہ یہ واجب صدقہ کے لیے ہے یا مستحب صدقہ کے لیے) تو اس سے مراد مستحب صدقہ ہی لیا جاتا ہے۔

صدقہ کا اطلاق ہر نیک کام پر بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث نبوی میں بھی آیا ہے کہ:

((كل معروف صدقة))[6]

---

[1] الزکاۃ فقهها وأسرارها وعلاج مشكلة الفقر في الإسلام، محيي الدين مستور، ص51

[2] الجامع لاحکام القرآن (تفسير القرطبي)، محمد بن ابی بکر القرطبی، 8/249

[3] المفردات لغریب القرآن، امام راغب اصفہانی، ص:278

[4] مواہب الجلیل فی شرح مختصر خلیل، ابو عبداللہ محمد بن محمد الحطاب، دار الفکر، طبعہ ثالثہ 1992ء، 6/49

[5] مغنی المحتاج الی معرفۃ معانی الفاظ المنہاج، محمد بن احمد الشربینی، دار الکتب العلمیہ، طبع اول 1994ء، 3/120

[6] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقۃ، حدیث رقم 6021، ص 8/11

ترجمہ: ہر نیکی صدقہ ہے۔

گویا زکاۃ کی ادائیگی کے بعد جو مال و دولت ضروریات سے بچ رہے اسے محتاجوں، بے کسوں اور مساکین کے معاشی تعطل کو ختم کرنے اور ان کی تخلیقی کوشش و جدوجہد کو بحال کرنے کی خاطر خرچ کیا جائے وہ صدقہ ہو گا تاکہ وہ افراد بھی معاشرے کی ترقی میں مطلوبہ کردار بحسن وخوبی انجام دے سکیں۔ دراصل یہ کسی ضعیف کی مدد، محتاج کی حاجت روائی، کسی عاجز کی دادرسی کے علاوہ اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کا حقیقی شکریہ بھی ہے۔ تبھی صدقہ کو اس کے ادا کرنے والے کے ایمان کی سچائی اور تصدیق کہا گیا ہے۔

صدقہ کی اقسام

شریعت مقدسہ اسلامیہ میں صدقہ کی کئی اقسام بیان کی گئی ہیں۔ صدقہ کی بنیادی پانچ قسمیں ہیں۔

1: شریعتِ مقدسہ کی جانب سے لوگوں کے اموال میں واجب قرار دیے گئے مالی حقوق۔ صدقہ کی اس قسم میں زکاۃ شامل ہے۔

2: صدقہ کی دوسری قسم اجسام و ابدان کا صدقہ ہے۔ اس قسم میں زکاۃ فطرہ شامل ہے۔

3: وہ صدقہ جس کو کوئی شخص خود ہی اپنے اوپر واجب قرار دیتا ہے، مثلاً نذر یا منت مان کے اپنے اوپر فرض کیا جانے والا صدقہ اس قسم میں شامل ہو گا۔

4: وہ صدقات جو ابتدائی طور پر مسلمانوں کے مال میں واجب نہیں ہوتے لیکن اللہ کے حق کے عنوان سے کبھی کبھی لوگوں کے اعمال کی وجہ سے ان پر فرض ہو جایا کرتے ہیں، جیسا کہ فدیہ اور
کفارہ وغیرہ اسی قسم میں شامل ہیں۔

5: صدقہ تطوع یا مستحب صدقات۔ جب صدقہ کا لفظ اطلاق کے ساتھ استعمال ہو تو اس سے مراد یہی صدقہ ہوتا ہے۔ باقی چار اقسام جب مراد ہوں تو صدقہ کے لفظ کے ساتھ ان کے اپنے مخصوص نام استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس فصل کے اندر لفظ صدقات سے مراد یہی معنی ہے۔ یہ صدقہ درحقیقت مستحب ہوتا ہے اور اس کے استحباب پر قرآن وسنت سے بہت ساری ادلہ موجود ہیں۔ قرآن مجید میں پروردگار کا ارشاد ہے کہ:

﴿مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾[1]

---

[1] سورۃ البقرۃ:2/245

ترجمہ: کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا۔ اور خدا ہی روزی کو تنگ کرتا اور (وہی اسے) کشادہ کرتا ہے۔ اور تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

ابن عربی مذکورہ آیت کی بابت رقم طراز ہیں کہ یہ کلام ندب و استحباب کے مورد میں نازل ہوا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو اللہ کی راہ میں، فقراء و محتاج لوگوں کی مدد کی خاطر اور دین مبین کی نصرت میں انفاقِ مال کے لیے ابھارنا اور انہیں اس کی تلقین کرنا ہے۔[1]

اسلامی تعلیمات کے مطابق وہ شخص کہ جس کا مال اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد بچ جائے اس کے لیے صدقہ کرنا اور اور اپنے پاس بچی ہوئی چیزوں کو فی سبیل اللہ دے دینا مستحسن اور مستحب عمل ہے۔ صدقہ ویسے تو سال کی کسی بھی مہینے اور دن بلکہ کسی بھی وقت نکالنا مستحب ہے، البتہ بعض موارد میں اس کے نکالنے کی تاکید اور زیادہ اہمیت وارد ہوئی ہے۔ امام نووی اوقاتِ صدقہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

”وفي شهر رمضان آكد , وكذا عند الأمور المهمة , وعند الكسوف , وعند المرض , والسفر , وبمكة , والمدينة , وفي الغزو والحج , والأوقات الفاضلة , كعشر ذي الحجة , وأيام العيد“[2]

ترجمہ: جیسا کہ ماہِ رمضان المبارک، مشکل اور اہم مہمات، چاند گرہن یا سورج گرہن کے مواقع، بیماری کی صورت میں، سفر کرتے وقت، مکہ و مدینہ میں، جنگ میں، حج کے موقع پر اور اہم مواقع پر جیسا کہ عید کے دنوں میں اس کے ادا کرنے کی بہت تاکید وارد ہوئی ہے۔

صدقہ وخیرات کی فضیلت اسلام کی نگاہ میں

اسلام نے اپنے ماننے والوں کے تہذیب نفس اور اور بخل و کنجوسی جیسے رذائل سے تزکیہ و تطہیر کے لیے واضح طریقے معین کیے ہیں۔ شریعت اسلامی کی تعلیمات میں مومنین کو دوسروں سے بغض و عناکا رویہ رکھنے کی بجائے پروردگار کی خوشنودی اور قرب کی خاطر مخلوقات خدا سے پیار، انس و محبت، رواداری اور ایثار و قربانی کے جذبات کی آبیاری کی گئی ہے۔ اسلام دوسروں سے مال و دولت ہتھیا لینے اور اپنے ہاں اس کے انبار لگا دینے کی سوچ کو ختم کر کے اس کی جگہ انفاق وعطا اور بذل و سخی کی سوچ کو معاشرے میں

---

[1] احکام القرآن، محمد بن عبد اللہ ابو بکر بن العربی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، طبع ثالثۃ 2003ء، 230/1

[2] روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین، محی الدین یحی ابن شرف النووی، المکتب الاسلامی، بیروت، طبع ثالث، 1991ء، 341/2

پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ تعلیمات ہیں جن کی بجا آوری کرتے ہوئے مومنین میں سے ایسے بھی ہیں جو جتنا ان سے طلب کیا جائے اس سے زائد اللہ کی راہ میں دیتے ہیں اور واجب حد سے بھی زیادہ انفاق اور ایثار کو انجام دیتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسی جذبے کی وجہ سے ہی معاشرے میں ایسے افراد بھی موجود رہتے ہیں جو بنامانگے بھی محتاجوں کی ضروریات کو پورا کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اور علناً بھی اور چھپا کر بھی بھی انفاق کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ دراصل یہی وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے لیے وہی پسند کرتے ہیں جو اپنے نفس کے لیے پسند ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات تو ان کو اپنے نفس پر فوقیت دے کر ایثار کے جذبے کا عملی مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ اس سب کچھ کے بدلے میں جو ان کو ملتا ہے وہ مسرتِ قلب اور دل کی شادمانی سے عبارت ہے جس کے ساتھ رضائے پروردار بھی ملی ہوئی ہوتی ہے۔

اسلام نے خود ان جذبات کی معاشرے میں آبیاری کی ہے اور یہ اس کی تعلیمات کا اثر ہی ہوتا ہے کہ کوئی اپنی ضرورت کو پس پشت ڈال کر دوسروں کو اپنی ذات پر فوقیت دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ قرآن و سنت میں بخل و کنجوسی سے اجتناب کرنے اور انفاق وبذل اور ایثار کی ترغیب دلانے کے لیے بہت سی نصوص وارد ہوئی ہیں۔ ارشاد پروردگار ہے:

﴿وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا وَابِلٌ فَآتَتْ أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾[1]

ترجمہ: اور جو لوگ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے خلوص نیت سے اپنامال خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایک باغ کی سی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو (جب) اس پر مینہ پڑے تو دگنا پھل لائے۔ اور اگر مینہ نہ بھی پڑے تو خیر پھوار ہی سہی اور خدا تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے۔

قرآن کریم میں اسی تصور کو ایک اور مقام پر یوں ارشاد فرمایا:

﴿وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنفِقُ قُرُبَاتٍ عِندَ اللَّهِ وَصَلَوَاتِ الرَّسُولِ أَلَا إِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ سَيُدْخِلُهُمُ اللَّهُ فِي رَحْمَتِهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾[2]

[1] سورة البقرة:2/265

[2] سورة التوبہ:9/99

ترجمہ: اور بعض دیہاتی ایسے ہیں کہ خدا پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کو خدا کی قُربت اور پیغمبر کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ دیکھو وہ بے شبہ ان کے لیے (موجب) قربت ہے خدا ان کو عنقریب اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

دنیا میں کیے گئے صدقہ کے بدلے قیامت کے روز اللہ اپنے بندے پر مہربان ہو گا اور اس کو دنیاوی نعمتوں کے بدلے میں اخروی اور ابدی نعمتوں سے نوازے گا۔

حدیث میں منقول ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

((أَيُّمَا مُؤْمِنٍ أَطْعَمَ مُؤْمِنًا عَلَى جُوعٍ أَطْعَمَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ ثِمَارِ الْجَنَّةِ، وَأَيُّمَا مُؤْمِنٍ سَقَى مُؤْمِنًا عَلَى ظَمَأٍ سَقَاهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنَ الرَّحِيقِ الْمَخْتُومِ، وَأَيُّمَا مُؤْمِنٍ كَسَا مُؤْمِنًا عَلَى عُرْيٍ، كَسَاهُ اللَّهُ مِنْ خُضْرِ الْجَنَّةِ))[1]

ترجمہ: جس کسی نے بھی کسی مومن کو بھوک میں کھانا کھلایا اللہ قیامت کے روز اس کو جنت کے پھل کھلائے گا، جس کسی مومن نے کسی دوسرے مومن کو پیاس میں سیراب کیا قیامت کے روز اللہ اس کو رحیق المختوم سے سیراب کرے گا، جس کسی مومن نے کسی ضرورت مند کو لباس دیا اللہ قیامت کے دن اس کو خُضر کے لباس عطا کرے گا۔

صدقہ و خیرات کے پیش نظر ایک مشکل سامنے آسکتی تھی کہ لوگ اس خدشے کے پیش نظر کہ صدقہ کے سبب ان کے مال میں کمی واقع ہوتی ہے پس و پیش کا رویہ اپنا لیں، اسلامی تعلیمات نے اس تصور کو باطل اور یکسر مسترد کر دیا کہ اس عمل کے ذریعے تمہارے مال و دولت میں برکت اور اضافہ تو ہو گا ہی ساتھ میں تم اجر و ثواب کے مستحق بھی قرار پاؤ گے۔

انفاق و ایثار پر ابھارتے ہوئے اس ابہام کو رد کر دیا کہ مال و دولت میں انفاق کی وجہ سے کمی آجائے گی بلکہ اس کام کی وجہ سے مال کے کئی گنا بڑھ جانے کی خبر دیتے ہوئے فرمایا:

﴿مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾[2]

---

[1] سنن الترمذی، محمد بن عیسی الترمذی، ابواب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع، حدیث رقم 2449، ص 4/633

[2] سورۃ البقرۃ:2/245

ترجمہ: کوئی ہے کہ خدا کو قرض حسنہ دے کہ وہ اس کے بدلے اس کو کئی حصے زیادہ دے گا۔ اور خدا ہی روزی کو تنگ کرتا اور (وہی اسے) کشادہ کرتا ہے۔ اور تم اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے۔

صرف تعلیماتِ قرآنی ہی میں نہیں بلکہ سیرت بنوی اور سرکار دوعالمؐ کے ارشادات میں بھی اس مطلب کو خاصی اہمیت کے ساتھ موضوع گفتگو ٹھہرایا گیا ہے، حدیث نبوی میں آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے مروی ہے کہ صدقہ مال میں سے کچھ بھی کمی نہیں کرتا ،بندے کے معاف کر دینے سے اللہ تعالی اسکی عزت بڑھا دیتا ہے اور جو بھی اللہ کی رضا کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے، تو اللہ اس کا درجہ ہی بلند فرماتا ہے۔[1]

درج بالا حدیث کی تشریح میں امام نووی راقم ہیں کہ صدقہ سے مال میں کمی نہیں آتی سے دو معانی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ پہلا معنی یہ کہ اسکے اموال میں من جانب اللہ برکت نازل ہو گی اور اس سے ہر طرح کے شر کو دور رکھے گا، پس اس کی مقدار میں آنے والی کمی کو اس میں پیدا ہونے والی برکت کے ذریعہ جبران کرے گا۔ اس کے علاوہ اللہ تعالی اس کا رتبہ اور منزلت دنیا میں ہی بلند کر دیتا ہے، اور معاشرے میں اس کی منزلت بنا دیتا ہے، اور لوگوں کے ہاں اس کے مقام و مرتبہ کو بلند ٹھہراتا ہے۔ جب کہ دوسرا معنی یوں بھی مراد مال کے انفاق کی وجہ سے بظاہر وہ کم ہو گیا ہے لیکن ثوابِ عظیم اس ثواب پر مترتب ہو رہا ہے وہ گویا کہ اس کمی کا جبران کر رہا ہے، نہ صرف جبران کر رہا ہے بلکہ اس میں کئی گنا اضافے کے برابر ہے۔[2]

صدقہ کے جو فوائد روایات میں ذکر ہوئے ہیں وہ فقط مال و دولت میں برکت آجانے اور اس میں اضافے پر منحصر نہیں بلکہ روایات میں اس کے فوائدِ کثیر گنوائے گئے ہیں۔ جیسا کہ رزق میں اضافہ، دعاؤں کی قبولیت، موت میں آسانی وغیرہ شامل ہیں۔

اسی موضوع سے متعلق امام طبرانی کی بیان کردہ روایت کے الفاظ کچھ یوں ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

((إِنَّ صَدَقَةَ الْمُسْلِمِ تَزِيدُ فِي الْعُمُرِ، وتَمْنَعُ مِيتَةَ السَّوْءِ وَيُذْهِبُ اللهُ بِهَا الْكِبْرَ وَالْفَخْرَ))[3]

ترجمہ: مسلمان کا صدقہ عمر میں اضافہ کرتا ہے، بری موت کو روکتا ہے اور اللہ تعالی اس کے ذریعے تکبر و فخر کو ختم کر دیتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، امام مسلم بن حجاج، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب استحباب العفو والتواضع، حدیث رقم 2588، ص 4/2001

[2] المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج، محي الدين يحيى بن شرف النووی، 16/142

[3] المعجم الکبیر، طبرانی، 17/22

بیان کردہ آیات و روایات سے معلوم ہوا کہ اسلامی تعلیمات میں محروم اور مجبور افراد کو صدقہ دے کر اپنی دولت میں شریک کرنے اور ان سے معاونت کرنے کو اسلام نے بہت کلیدی اہمیت کا مسئلہ قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والوں کی بھرپور حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔اور صدقہ و خیرات کو بہت زیادہ اہمیت و فضیلت دی گئی ہے۔اس کارِ خیر کے ذریعے پروردگار کا قرب حاصل ہونے اور رزق میں اضافہ ہونے کا وعدہ بھی کیا گیا ہے، مزید براں اس عمل سے نہ صرف مصائب و آلام اور بلائیں دور ہوتی ہیں بلکہ اہل قبور بھی صدقے کی برکات سے مستفید ہوتے ہیں۔

صدقہ کی مختلف صورتیں اور مسئلہ فقر سے ان کا ربط

قبلاً بیان ہو چکا ہے کہ صدقہ کا لفظ جب بھی اطلاق کے ساتھ استعمال ہو تو اس سے مراد صدقہ تطوع یا مستحب اور نافلہ صدقے ہوتے ہیں۔جب بھی صدقہ سے مراد صدقہ غیر واجب یا صدقہ نافلہ لیا جائے تو ایسا صدقہ ہر ایک مسلمان کے لیے استحباب کا درجہ رکھتا ہے اور اس کا کوئی نصاب ہے نہ ہی شرائط۔لہذا صدقہ نکالنے والا اس کو اپنی مرضی سے فقراء اور محتاجوں میں تقسیم کر سکتا ہے، البتہ اقرباء اور رشتہ داروں کو دیگر افراد پر مقدم کرنے میں افضلیت ہے۔یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا کرتے وقت کسی کی حاجت مندی کی نوعیت کی مکمل رعائت کی جائے اور جو کوئی بھی زیادہ حاجت مند ہو اس کو دوسرے تمام افراد پر مقدم کیا جائے۔رشتہ دار حاجتمندوں اور ضرورتمندوں کو دیگر افراد پر مقدم کرنے کی وجہ کے بارے سلیمان بن عامر سے منقول حدیث میں آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ:

((الصَّدَقَةُ عَلَى المِسْكِينِ صَدَقَةٌ، وَهِيَ عَلَى ذِي الرَّحِمِ ثِنْتَانِ: صَدَقَةٌ وَصِلَةٌ))[1]

ترجمہ: مسکین کو صدقہ دینا (فقط) صدقہ ہے، جب کہ اپنے رشتہ داروں کو صدقہ دینے کے دو درجے ہیں، یہ صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی۔

صدقہ تطوع کے مصارف کے بارے میں حکم الہی یوں ہے:

﴿يسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾[2]

---

[1] سنن ترمذی، امام محمد بن عیسی ترمذی، ابواب الزکاۃ، باب ماجاء فی الصدقۃ علی ذی القرابۃ، 3/38

[2] سورۃ البقرۃ:2/215

ترجمہ: (اے محمد ﷺ) لوگ تم سے پوچھتے ہیں کہ (خدا کی راہ میں) کس طرح کا مال خرچ کریں۔ کہہ دو کہ (جو چاہو خرچ کرو لیکن) جو مال خرچ کرنا چاہو وہ (درجہ بدرجہ اہل استحقاق یعنی) ماں باپ اور قریب کے رشتے داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو (سب کو دو) اور جو بھلائی تم کرو گے خدا اس کو جانتا ہے۔

ابن عربی کے مطابق اس آیت میں پائے جانے والے مصارف کے بارے دو عدد قول ہیں۔ پہلے قول کے مطابق یہ زکاۃ کے مصارف تھے لیکن بعد میں یہ آیت نسخ ہو گئی اور دوسرے مصارف کا حکم آگیا جو کہ اب مصارف زکاۃ ہیں، اس قول کا قائل کوئی نہیں ہے، چونکہ اس آیت کے نسخ کے بارے میں کوئی بھی دلیل نہیں ہے۔ اس کے مقابل یہ قول ہے کہ مذکورہ آیت میں صدقہ تطوع کے مصارف کا تذکرہ ہے۔ مؤخر الذکر قول بہتر اور اولی ہے۔ اور اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ تطوع رشتہ داروں کو دینا، دیگر افراد کو دینے کی نسبت زیادہ افضل ہے۔[1]

اس بابت آپؐ سے نقل کی گئی ایک روایت ہے کہ آپؐ کی صحابیہ زیبب نے جب آپ دریافت کیا کہ میرا شوہر غریب ہے تو کیا میں اپنے شوہر اور بچوں کو صدقہ دے سکتی ہوں، تو آپؐ نے فرمایا:

((زَوْجُكِ وَوَلَدُكِ أَحَقُّ مَنْ تَصَدَّقْتِ بِهِ عَلَيْهِمْ))[2]

ترجمہ: تمہارا شوہر اور بچے صدقہ لینے والے دیگر افراد کی نسبت تم پر اولویت رکھتے ہیں۔

صدقات و خیرات در حقیقت راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ قرآن مجید میں راہِ خدا میں خرچ کرنے کے لیے کبھی انفاق، کبھی انفاق فی سبیل اللہ، کبھی صدقہ اور کبھی زکاۃ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ پس قرآن مجید میں جہاں پر اور جن عنوانات کے لیے ان الفاظ کا استعمال ہوا ہے وہ سب صدقات و خیرات میں شامل ہیں۔ در حقیقت افراد معاشرہ کے وہ تمام طریقے کہ جن سے ایک دوسرے کو کسی نہ کسی طرح مالی مدد مل سکتی ہے "انفاق" کی حدود میں شامل ہیں۔ چنانچہ یہ انفاق واجب بھی ہوتا ہے جیسا کہ زکاۃ وغیرہ، جبکہ انفاق کی دوسری قسم نفلی، مستحب یا متطوع ہے جو کہ یہاں موردِ بحث ہے۔ نفلی یا مستحب انفاق کی مزید دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔

---

[1] احکام القرآن، ابن العربی، 1/204

[2] صحیح بخاری، محمد ابن اسماعیل بخاری، باب الزکاۃ علی الاقارب، 2/120

پہلی قسم:

ایک حاجتمند کو ایسا مالی انفاق کہ جس میں اس کو کسی مال کا مالک بنا دیا جائے انفاق کی پہلی قسم میں شمار کیا جائے گا مثلاً صدقاتِ نافلہ، وقف، وصیت اور ہبہ وغیرہ۔ ان میں سے جہاں تک صدقاتِ نافلہ کا تعلق ہے تو اسلام نے حاجتمندوں کی وقتی حاجت کے لیے انفرادی صدقات کو عمل خیر کہہ کر ان کی بہت ترغیب دلائی ہے۔ اور دنیا و آخرت کے اجر کو نعم البدل بتا کر قرآن مجید اور احادیث نے اس کے حوالے سے لوگوں کو بار بار آمادہ کیا ہے۔ صدقات نافلہ کا تعلق چونکہ انفرادی عطا سے ہے اور یہ اخلاقِ حسنہ اور اعمال فاضلہ کی ایک کڑی ہے اس لیے اس میں کچھ اخلاقی خطرات کے پیش آجانے کا خطرہ تھا۔ پہلا تو یہ کہ اس طرح کا انفاق کرنے والا اپنی عطا کا احسان جتلائے اور حاجتمند کو نادم و شرمسار کر کے اس کو اذیت پہنچائے۔ دوسرا اندیشہ یہ تھا کہ وہ یہ انفاق اللہ کے تقرب اور خوشنودی کی بجائے محض دکھلاوے اور نمائش کے طور پر نہ کر رہا ہو چنانچہ ان دونوں کے انسداد کے لیے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: مومنو! اپنے صدقات (وخیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا۔ جو لوگوں کو دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہے اور خدا اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔[1]

صدقات نافلہ کے موارد ان گنت اور بہت زیادہ ہیں لیکن اسلام نے کچھ موارد پر خاص کر لوگوں کو متوجہ کیا ہے۔ ان موارد میں سے ایک مورد پانی سے سیراب کرنے والے کام انجام دینا جیسا کہ کنواں کھدوانا، نہریں جاری کرنا یا آج کل کے زمانے کے مطابق پانی کا نلکا یا موٹر لگانا اور فلٹریشن پوائنٹس وغیرہ قائم کرنا شامل ہیں۔ ایک حدیث کے مطابق سب سے افضل صدقہ پانی کا پلانا ہے۔[2]

اسی طریقے سے نادار اور غریب افراد کو بھی کھانا کھلانے اور دیگر ذرائع امداد سے تعاون کرنے کی فضیلت احادیث میں وارد ہوئی ہے۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ کون سا اسلام (یعنی) عمل سب سے افضل ہے تو آپؐ نے فرمایا "(ناداروں اور بھوکوں کو) کھانا کھلانا اور جس کو تم جانتے ہو اس کو بھی اور جس کو نہیں جانتے اس کو بھی سلام کرنا سب سے افضل عمل ہے"[3]

اسی طرح مساجد کا بنوانا، تعلیم و تعلم کے اوپر خرچ کرنا، مصاحف قرآنی کا تقسیم کرنا، مسافر خوانے بنانا اور یتیم، مسکین اور بے کس افراد کی جملہ ضروریات کو پورا کرنا بھی اسی عنوان یعنی صدقاتِ نافلہ میں ہی شمار ہوتا ہے۔ در حقیقت صدقات نافلہ کا ذریعہ

---

[1] سورۃ البقرۃ:264/2

[2] مسند احمد، امام احمد ابن حنبل، حدیث رقم 22459، ص37/124

[3] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب الایمان، باب افشاء السلام من الاسلام، حدیث رقم 28، ص1/15

غریب ، بے کس ، بے سہارا، محتاج، یتیم اور فقیر افراد کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے اور انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے۔

وقف: انفاق فی سبیل اللہ کے وسائل میں سے ایک بہترین وسیلہ وقف ہے۔ شریعت کی رو سے کسی بھی چیز کو اپنی ملکیت سے خارج کر کے اللہ کی ملکیت میں قرار دینا اور اس چیز کی منفعت کو اللہ کے پسندیدہ تمام اُمور یا بعض کے لیے مخصوص کرنا وقف ہے [1]۔ اسلام نے اس کے اجراء اور توسیع کے لیے بہت زیادہ ترغیب دی ہے۔

وقف کا فائدہ بالخصوص ان حالات میں بزرگ تر ہوتا ہے جب کسی شخص نے اپنی پوری زندگی اپنے فالتو مال و دولت سے حاجتمندوں کی اعانت اور معاشرے کے غریب، لاچار اور بے کس افراد سے تعاون و امداد نہ کی اور نہ ہی اس جانب متوجہ ہوا۔ قبل اس کے کہ وہ موت کی آغوش میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اتر جاتا اور سوائے حسرت و یاس کے کچھ نہ باقی رہتا اسلام نے وقف کے عنوان کے تحت اس کو ایک موقع دیا کہ وہ اپنی زندگی میں ہی اپنی اگلی زندگی کے لیے وقف کی صسورت میں صدقہ جاری کو چھوڑ جائے۔

اس عنوان سے اپنی موت کے بعد چھوڑی جانے والی اشیاء کے بارے میں حضرت اَبو ہریرہ سے منقول روایت کے مطابق:

> ((اذا مات الانسان انقطع عنه عمله الا من ثلاثة: الا من صدقة جارية ، او علم ينتفع به ، او ولد صالح يدعو له))[2]
>
> ترجمہ: انسان کی موت واقع ہو جانے کے بعد اس کا نامہ اعمال بند ہو جاتا ہے، مگر تین استثنائات ہیں: ایک "صدقہ جو مرنے کے بعد بھی بعنوان فائدہ جاری رہے" دوسرا "علم جس سے لوگ استفادہ کرتے رہیں" اور نیک اولاد جو مرحوم کے لیے دعا گو رہے۔

وقف کی صحیح تعریف اور مصارف کے حوالے سے وہ مثال جس میں حضرت عمر نے خیبر کی زمین کو جو ان کے حصہ میں آئی تھی جب وقف کیا تھا تو آپ نے جو شرائط و شروط مقرر فرمائے تھے یقیناوہ وقف کی تعریف اور اس کے مصارف دونوں کی مدلل تشریح اور وضاحت ہیں۔ آپ نے اپنی اس تحریر میں لکھا تھا کہ "عمر نے اس کو وقف کر دیا ہے، اس کی خرید و فروخت ممنوع قرار دی ہے اور یہ بھی کہ اس میں میراث کے احکام جاری کیے جائیں۔ اور عمر نے اس کو فقراء، اَقرباء، محروموں، مسافروں، محتاجوں

---

[1] الہدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی، علی بن ابی بکر الفرغانی، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، 3/13

[2] صحیح مسلم، مسلم بن حجاج، کتاب الوصیۃ، باب مایلحق الانسان من الثواب بعد وفاتہ، حدیث 1631، ص 3/1255

،مہمانوں اور غلاموں کی آزادی کے لیے وقف کر دیا ہے۔ یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس کا متولی اس میں سے مناسب طور پر اپنا روزینہ لے سکتا ہے اور اپنے اعزاء کو مناسب طرز پر کھلایا جا سکتا ہے"[1]۔

گویا کہ اس تحریر سے آپ نے وقف کے احکام کا خلاصہ کر دیا ہو کہ جو کچھ بھی اللہ کے راہ میں وقف کیا جائے گا اس وقف کی آمدنی فقراء، مساکین، مسافر، قرض خواہ، ذوی القربی اور یتیموں وغیرہ پر خرچ کی جائے گی اور اس کو نہ کوئی جروخت کر سکتا ہے نہ ہبہ کر سکتا ہے اور نہ ہی وہ چیز واقف کے ورثاء میں تقسیم ہو سکتی ہے۔

ہبہ: اسلامی معاشی قوانین واجب مالی حقوق کی ادائیگی کے بعد کسی شخص کے لیے اس بات میں رکاوٹ نہیں بنتے کہ وہ اپنے ذاتی و اجتماعی مالی حقوق کی ادائیگی کے بعد اپنی بچ جانے والی باقی ماندہ مال و دولت کو حاجتمندوں کی حاجت روائی کے لیے استعمال کرے۔ مقصد ھذا کی خاطر جو امور انجام دیے جا سکتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ثروت مند افراد نقدی یا مال ضرورت مند اور حاجتمند افراد کو ہبہ کر دیں۔ ہبہ ہو یا ہدیہ دونوں کا مقصد اللہ کے قرب اور خوشنودی کے لیے کسی اور کو اپنے مال کا مالک بنانا ہے۔ البتہ ہبہ کو صورت میں وجہ صلہ رحمی ولوگوں سے حسن سلوک کے جذبات ہوتے ہیں جب کہ ہدیہ کا مقصد اکرام و احترام ہوتا ہے[2]

شریعت اسلامی کی روسے ہبہ کے لیے کسی کا فقیر و نادار ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ امیر اور مالدار افراد کے نام بھی ہبہ کیا جا سکتا ہے، البتہ اکثر و بیشتر عملی مقامات میں اس کا تعلق غرباء اور اہل حاجت کی غربت و حاجت کے انسداد سے ملتا ہے۔ احادیث نبویہ میں اس کی ترغیب دلاتے ہوئے اس کی حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ ہدیہ اور ہبہ سے لوگوں میں باہمی مودت و محبت مستحکم ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد رسول گرامی قدر ہے کہ:

تَهادَوْا تحابُّوا[3]

ترجمہ: آپس میں ہدیہ باہم لیا دیا کرو اس طرح باہمی اخوت و محبت پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] سنن ابی داود، امام ابو داود، کتاب الوصایا، باب ماجاء فی الرجل یوقف الوقف، حدیث رقم 2879، ص 3/117

[2] المطلع علی الفاظ المقنع، محمد بن ابی الفتح بن ابی الفضل البعلی، مکتبۃ السوادی للتوزیع، طبع اول 2003، ص:291

[3] السنن الکبری، ابو بکر البیہقی، کتاب الھبات، حدیث رقم 11946، ص 6/280

دوسری قسم

مالک بنائے بغیر حاجت مند افراد کی مالی مدد انفاق کی دوسری قسم ہے جیسا کہ قرضِ حسنہ، عاریت اور امانت کی صورت میں کیا جانے والا مالی انفاق اسی قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے وسائل میں سے ایک وسیلہ قرض حسنہ ہے۔ قرضِ حسنہ حاجتمند کی عارضی اور وقتی حاجت روائی کا بھی ذریعہ ہے اور غریب، جفاکش اور محنتی انسان کو مختلف قسم کے

کاروبار شروع کرنے کے لیے ایک موثر وسیلہ بھی ہے۔ فقہ کی کتابوں میں قرض کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

"دَفْعُ مَالٍ إِرْفَاقًا لِمَنْ يَنْتَفِعُ بِهِ وَيَرُدُّ بَدَلَهُ"[1]

ترجمہ: ایک دولت مند کا کسی ضرورت مند کو اس کی حاجت روائی کے لیے اس طرح اپنی رقم باہم پہنچانا کہ اس رقم کا کوئی بدل (سود وغیرہ) اس سے حاصل نہ کیا جائے قرض کہلاتا ہے۔

اسلام کا قرضِ حسنہ غریبوں اور بے کسوں کے لیے لطفِ الٰہی کا ایک خاص باب ہے۔ اس لیے کہ جب معاشرے میں نفسا نفسی کا عالم ہو اور ہر کسی کو اپنی ہی پڑی ہو قرض دینے والے بھی اپنی انسانیت کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی مجبوریوں کا فائدہ اٹھائیں اور منہ مانگا سود حاصل کریں ایسے میں ایک ایسا مکتبہ فکر جو مدد و تعاون کے لیے سود سے پاک وپاکیزہ اور آسان ترین نظامِ قرضِ حسنہ دے رہا ہو نعمت خداوندی اور لطفِ پروردگار کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

اگرچہ شریعت اسلامی اپنے رشتہ داروں، پھر پڑوسیوں اور پھر تمام ایمانی بھائیوں کے ساتھ اخوت، ہمدردی، رواداری اور امداد باہمی کی مکمل ترغیب و تبلیغ کرتی آئی ہے لیکن پھر بھی عین ممکن ہے کہ کوئی حاجتمند شخص اس معاشرے میں ایسا بھی ہو جو اپنی ضروریات کو کسی بھی وجہ سے پورا کرنے سے قاصر ہو۔ ایسے افراد کے لیے اسلامی احکام قرضِ حسنہ کی تلقین کرتے ہیں۔

قرض کے باب میں، جو کہ غریبوں کی آخری امید اور ان کے حصے کی آخری کوشش ہوتی ہے، اسلام قرض خواہ اور قرض دار ہر دو کو مخصوص کام کی تلقین کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قرض خواہ کو قرض دار کی دعوت قبول کرنے سے احتیاط کا حکم دیا گیا ہے، کیا پتا قرض دار اس لیے قرض خواہ کی دعوت کر رہا ہو تاکہ قرض خواہ اس سے جلد قرض کا مطالبہ نہ کرے۔

[1] کشاف القناع عن متن الاقناع، منصور بن یونس البہوتی، دار الکتب العلمیہ، سن ندارد، 3/298

ساتھ ہی ساتھ قرض دار کو بھی سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ قرضِ حسنہ کے یہ معنی نہیں ہیں کہ قرض ادا کرنے کی قدرت اور طاقت ہونے کے باوجود بھی دوسرے کی رقم کو بروقت واپس نہ پلٹایا جائے اور قرض خواہ کے اعتماد کو زِک پہنچائی جائے۔ چنانچہ حدیث رسول کریمؐ ہے کہ:

((مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ))[1]

ترجمہ: دینے کی قدرت کے باوجود دوسروں کے حق مطالبہ کی ادامیں تاخیر بہت بڑا ظلم ہے۔

ایک اور جگہ قرض کی بروقت واپسی کی تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((الدَّيْنُ مَقْضِيٌّ وَالْعَارِيَّةُ مُؤَدَّاةٌ))[2]

ترجمہ: قرض کی بروقت واپسی واجب ہے، عاریۃً لی گئی چیزوں کو واپس پلٹانا فرض ہے۔

اس قسم کے معاملے میں قرض دار کی طرف سے پیش آنے والی ممکنہ عہد شکنی اور بد دیانتی سے بچنے کے لیے، شریعتِ مقدسہ کی جانب سے انعام واکرام کے وعدوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی ترغیب و تبلیغ بھی کی گئی ہے تا کہ وہ قرض خواہ کے اس احسان کو یاد رکھے اور اس کے بدلے میں اپنے عہد پر باقی رہے۔

عاریت: دنیاوی زندگی میں ضرورت کی سب اشیاء تمام کے تمام افراد کے پاس میسر نہیں ہوتیں، اور نہ ہی شائد کسی کے لیے اپنی زندگی میں کام آنے والی تمام کی تمام اشیاء کو خود سے اپنے لیے مہیا کرنا ممکن ہے۔ ایسے میں اسلام عام استعمال کی چیزوں کے لیے عاریہ کا اصول متعارف کراتا ہے۔ اسلامی فقہی اصطلاح کے مطابق:

"الْعَارِيَّةُ: إِبَاحَةٌ أَوْ تَمْلِيكُ مَنْفَعَةِ عَيْنٍ مَعَ بَقَاءِ الْعَيْنِ لِصَاحِبِهَا بِشُرُوطٍ مَخْصُوصَةٍ"[3]

ترجمہ: کسی شخص کا مخصوص شرائط کے ساتھ اپنی ملکیت کے منافع کو بغیر کسی عوض کے وصول کیے ، دوسرے کی ملک بنا دینا عاریت کہلاتا ہے۔

عاریت اسلامی احکام کے نقطہ نظر سے نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن اور مستحب ہے اس لیے کہ اس سبب سے پریشان حال افراد کی حاجت روائی اور اور نادار افراد کی اعانت و امداد کی جاتی ہے۔ اسلام ایسا کرنے کو نہ صرف مستحسن کہتا ہے اور اس کی

---

[1] مسند احمد بن حنبل، امام احمد ابن حنبل، حدیث رقم 7541، ص 12/505

[2] مسند ابی داود، ابو داود الطیالسی، حدیث رقم 1224، ص 2/451

[3] المغني لابن قدامة ابو محمد ابن قدامہ،، مکتبۃ القاہرۃ، طبع 1968ء، 5/220

حوصلہ افزائی کرتا ہے بلکہ جو لوگ مضطر و نادار افراد کی امداد و اعانت سے باز رہتے ہیں اور اپنی چیزوں کو عاریت کے طور پر دینے سے گریز کرتے ہیں ان کی زبردست سرزنش اور مذمت کرتا ہے۔ کلام الٰہی میں حکم ہوتا ہے:

﴿وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ﴾[1]

ترجمہ: (اور ان کے لیے بھی ہلاکت و بربادی ہے جو) عام استعمال کی اشیاء عاریۃً نہیں دیتے۔

سوچنے کی بات ہے کہ انسانی معاشرے میں اگر عاریت کے طور پر پیش آنے والے طریقہ کار کو نکال دیا جائے تو اور امداد و اعانت باہمی کی اس شکل کو معاشرے سے معدوم کر دیا جائے تو ایسا معاشرہ باہمی معاشی تعاون کے پورے شعبے سے محروم ہو جائے گا۔

عاریت کا نظام ایثار و اخلاقی بلندی کا پیش خیمہ ہے لیکن اس نظام کے لیے ایک چیز خطرہ بن سکتی ہے اور وہ ہے اشیاء کے ضائع ہونے کا خطرہ۔ شریعت اسلامیہ نے اس خطرے کے پیشِ نظر عاریت پر چیزیں لینے والے کو سخت تنبیہ کی ہے کہ وہ عارت پر لی گئی چیزوں کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھے اور ضرورت پورا ہو جانے کے بعد فوراً مالک کو واپس کر دے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((وَالْعَارِيَّةُ مُؤَدَّاةٌ))[2]

ترجمہ: عاریہ کی واپسی عاریت لینے والے کے ذمہ ہے۔

عاریہ اور صدقہ دونوں ہی صدقہ تطوع میں شمار کیے جاتے ہیں اور دونوں کا مقصد بھی قربِ الٰہی ہے، البتہ صدقہ میں کسی بھی چیز کو نادار افراد کی ملکیت میں دے دیا جاتا ہے یوں وہ چیز اور اس سے جڑے ہوئے تمام منافع ان افراد کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں لیکن عاریہ میں اصلِ شئ منتقل نہیں کی جاتی بلکہ صرف اس کے منافع کسی بھی شخص کے حوالے کیے جاتے ہیں۔ اس طرح صدقہ کی ہوئی چیز کی طرف رجوع کرنا اور اس کو دوبار اپنی ملکیت میں لانا ممنوع ہوتا ہے جب کہ عاریہ میں ضروری ہوتا ہے کہ عاریہ لی گئی چیز سے کام لینے کے بعد اس کو اصلی مالک کی طرف پلٹایا جائے۔

---

[1] سورۃ الماعون:107/ 7

[2] مسند ابی داود، ابو داود الطیالسی، حدیث رقم 1224،2/ 451

فصل چہارم

ذاتی ملکیت کی فراہمی اور اقتصادی حدود و قیود

فقر و افلاس اور اس کے اسباب کی بیخ کنی کے لیے ضروری ہے کہ کچھ اوزار اس مرض میں مبتلا افراد کے ہاتھوں میں تھما دیے جائیں جس کے ذریعے اس مرض کی مستقل بنیادوں پر روک تھام کی جا سکے۔ ان ہتھیاروں اور اوزاروں میں سے ایک نجی یا ذاتی ملکیت کی فراہمی ہے۔ انفرادی ملکیت کی آزادی فراہم کر کے صارف کو اس میں تصرف کرنے اور اس تصرف کے ذریعے اپنی روزی کمانے اور غربت و افلاس کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ نجی ملکیت کا ہونا افراد کو اس میں محنت کرنے اور اس کو مزید بڑھانے جیسے اقدامات کی طرف ابھارتا ہے جس کی وجہ سے تنگدستی و بدحالی کا راستہ روکا جاتا ہے۔

نجی ملکیت کی حقیقت اور خصوصیات جان لینے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ملکیت سے مراد کیا ہے اور ملکیت کسے کہتے ہیں۔ ملکیت کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ:

"هُوَ احْتِوَاءُ الشَّيْءِ وَالْقُدْرَةُ عَلَى الِاسْتِبْدَادِ بِهِ وَالتَّصَرُّفُ بِانْفِرَادٍ"[1]

ترجمہ: ملکیت سے مراد کسی مال یا شے پر کسی فرد کو قبضہ اور قدرت کا اس طرح سے حاصل ہونا ہے کہ وہ اس شے یا مال کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ اور استعمال کر سکے۔

گویا کہ ملکیت کسی شے اور اس کے مالک کے درمیان موجود ایسا حق ہے جو دیگر افراد کے لیے اس چیز پر تصرف اور استفادے سے روک دیتا ہے۔ علامہ قرافی ملکیت کی تعریف میں رقم طراز ہیں کہ:

"الْمِلْكُ حُكْمٌ شَرْعِيٌّ مُقَدَّرٌ فِي الْعَيْنِ أَوِ الْمَنْفَعَةِ، يَقْتَضِي تَمَكُّنَ مَنْ يُضَافُ إِلَيْهِ مِنَ انْتِفَاعِهِ بِالْمَمْلُوكِ وَالْعِوَضِ عَنْهُ مِنْ حَيْثُ هُوَ كَذَلِكَ"[2]

ترجمہ: ملکیت کسی بھی چیز میں تصرف اور قدرت کا وہ حق ہے جو شریعت مقدسہ کی طرف سے ثابت ہو اور جس کے سبب مالک کو اس چیز سے استفادہ کرنے اور اس کو عوض کے بدلے بیچنے وغیرہ کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

ملکیت کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد یہ جان لینا ضروری ہے کہ اسلامی اقتصادی اصول لوگوں کو انفرادی، ذاتی یا نجی ملکیت سے نہیں روکتے۔ البتہ یہ سوال اپنی جگہ کہ نجی، انفرادی یا ذاتی ملکیت سے مراد کیا لیا جاتا ہے۔ باقر الصدر شخصی یا انفرادی و نجی ملکیت کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ:

---

[1] المصباح المنير في غريب الشرح الكبير، احمد بن محمد بن علي الفيومی، المكتبة العلمية، بیروت، سن ندارد، 2/597

[2] انوار البروق فی انواء الفروق (الفروق)، احمد بن ادریس بن عبد الرحمن القرافی، عالم الکتب، بدون سن، 3/209

"وہ ملکیت جس کا تعلق فرد یا جہت سے ہو اور وہ فرد یا جہت اس سے استفادہ کے عوض امت یا حکومت کو معاوضہ دینے کی ذمہ دار نہ ہو۔"[1]

یہ ایک فطری امر ہے کہ انسان بلکہ حیوانات بھی اپنی ذات کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور اپنے لیے چیزیں حاصل کرتی ہیں۔ سب سے زیادہ اولیت وہ اپنے نفع اور ضرر کو دیتے ہیں، ملکیت دراصل اس فطری حب ذات کا ایک لازمی نتیجہ ہے جو انسان میں بالطبع موجود ہے اور ملکیت کا حق سلب کرنا فطرت کے ساتھ متصادم ہونے کے مترادف ہے۔ یہ تصادم جہاں بھی وقوع پذیر ہوا جلد یا بدیر نابود ہو گا کیونکہ فطرت کے مقابلے میں آنے والی ہر طاقت کا انجام زوال اور نابودی ہے۔ ان فطری تقاضوں سے چشم پوشی کر بھی لیں تو بھی انسانی حقوق واقدار ملکیت کے خاتمے کی اجازت نہیں دے سکتے۔[2] ملکیت کے بغیر انسان اپنی حیثیت بھی حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ ملکیت کی عدم موجودگی کی صورت میں انسان اجتماعی زندگی کی فضا میں تنکے کی مانند بے وزن ہو کر سر گردان رہتا ہے یا پھر مشینری کے پرزوں کی طرح بے قیمت ہو جاتا ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ حقِ ملکیت کو ختم کرنا انسانی فعالیت اور قوتِ ایجاد واختراع کو ختم کرنے کے برابر ہے، کیونکہ انسان اندرونی احساسات کے تحت بغیر ذاتی مفاد کے زحمت و مشقت نہیں برداشت کر سکتا اور اس کی جسمانی ساخت اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں پر قربان کرے، یہی عین انسانی فطرت ہے۔

انفرادی ملکیت کی فراہمی اور اس کا مسئلہ فقر سے ربط

اسلامی معاشی قوانین پر ایک سرسری نگاہ بھی ڈالی جائے تو اس کا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ اسلامی معاشیات کا پورا ڈھانچہ "انفرادی ملکیت" پر قائم ہے۔ اگر نجی ملکیت کے مذکورہ اصول کو تسلیم نہ کیا جائے تو نہ صرف اسلام کے معاشی قوانین معطل ہو کر رہ جائیں گے بلکہ اسلام کے بہت سارے ارکان اور فرائض عملاً معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ اسلام کی ایک رکن زکاۃ عملاً غیر ضروری قرار پائے گا، اس کا ایک اور رکن حج بھی ختم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ معاشی قوانین کا عظیم الشان مسئلہ میراث بھی باقی نہیں رہے گا، کیونکہ یہ سب اور ان جیسے کئی دیگر اسلامی معاشی قوانین انفرادی ملکیت کی اساس اور بنیاد پر قائم ہیں۔[3]

---

[1] اسلامی اقتصادیات کا جائزہ، محمد باقر الصدر (مترجم: ذیشان حیدر جوادی)، محمد علی بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، سن ندارد، ص:87

[2] اسلامی اقتصاد، محمد آصف محسنی، ص:31

[3] معیشت واقتصاد کا اسلامی تصور، محمود احمد ظفر، ص133

اسلام میں موجود زکاۃ اور میراث کے بارے میں آیات قرآنی، انفاق فی سبیل اللہ کے بارے میں ارشادات ربانی، قرض اور خرید و فروخت سے متعلق آیات، خلع اور مسئلہ رضاعت کے احکام پر مشتمل آیات، نیز ان مسائل اور دیگر مسائل سے متعلق کثیر التعداد احادیث سب کی سب انفرادی و نجی ملکیت کے دلائل و براہین ہیں۔

دراصل اسلام ایسے اقتصادی نظام کو تسلیم ہی نہیں کرتا جس میں اشخاص و افراد کو اشیاءِ منقولہ کے علاوہ زمین اور ذرائع پیداوار پر کسی حیثیت اور کسی حالت میں بھی حق ملکیت حاصل نہ ہو اور وہ اس طریقِ کار کو غیر فطری اور ایسے نظام کو ناقص اور غیر مطمئن نظام سمجھتا ہے[1]۔ کیونکہ یہ فطری امر ہے کہ انسان کسب مال اور دیگر اشیاء کے حصول کی کوشش اور جدوجہد تبھی کرے گا جب اس کو اس بات کا یقین ہو کہ وہ جو کچھ اپنی محنت سے کمائے گا وہ اسی کا ہے۔ اگر اس کی جدوجہد کا نتیجہ اور ثمر کوئی دوسرا لے جائے تو کبھی بھی وہ محنت و کاوش میں دلچسپی نہیں لے گا۔ لہذا مذہبی تعلیمات نے فرد کو ملکیت کا حق فراہم کیا ہے، لیکن وہ ایسا حق ملکیت نہیں ہے جیسا سرمایہ داری نظام میں ہے۔

اسلام کے تصورِ ملکیت کا دیگر اقتصادی نظاموں سے موازنہ

اسلام اپنے نظریۂ ملکیت میں سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے جداگانہ موقف کا حامل ہے۔ سرمایہ داری نظام کا خیال ہے کہ معاشرہ میں انفرادی ملکیت کو مرکزی نقطہ قرار دینا چاہئے اور کسی شے کی اجتماعی ملکیت کا اس وقت تک اعتراف نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ حکومتی ضرورت اس امر پر مجبور نہ کر دے۔ گویا کہ نظامِ سرمایہ داری کی نظر میں بنیادی نکتہ انفرادی ملکیت ہے اور استثنائی صورت میں اجتماعی ملکیت کو قبول کیا جاتا ہے۔

سرمایہ داری میں افراد اپنی ملکیت میں مطلق العنان ہیں، ان پر کسی قسم کی پابندی نہ ہونی چاہئے۔ حکومت کا فریضہ صرف اتنا ہے کہ اس آزادی کی حمایت کرے۔ ہاں اگر کسی وقت اجتماعی مصالح کی بنا پر کسی ملکیت کو عام کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو اسے مملکت پر صرف کیا جا سکتا ہے۔

اشتراکیت نے اس سے بالکل متضاد موقف اختیار کیا ہے۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اجتماعی ملکیت کو مرکزی حیثیت دی جائے اور انفرادی ملکیت کو صرف ان مواقع پر جائز قرار دیا جائے جب حکومتی حالات اس بات پر مجبور کر دیں۔ یعنی اجتماعی ملکیت اصل ہے اور انفرادی ملکیت استثنائی صورت میں ہی اپنائی جا سکتی ہے۔

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، ص282

دین اسلام نے اپنے لئے ان دونوں سے الگ ایک راستہ نکالا ہے۔اس کی نظر میں نہ تو انفرادی ملکیت کے اصول کو مرکزیت حاصل ہونی چاہیے اور نہ ہی اجتماعی ملکیت کو مرکز تصور کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ ملکیت کی ایک ایسی شکل قرار دینی چاہئے جس میں تنوع اور ہمہ گیری ہو تاکہ جملہ قواعد اپنے اپنے حالات سے مخصوص رہیں۔ اور کسی قسم کے استثنائی صورت کی نوبت نہ آئے۔وہ انفرادی ملکیت کا بھی قائل ہے اور اجتماعی و حکومتی ملکیت کا بھی لیکن ان سب کے میدان اس طرح الگ الگ کر دیئے ہیں کہ ایک دوسرے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا[1]۔

اسلام کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام ہر شخص کو دولت کمانے اور خرچ کرنے کی کھلی چھٹی دیتا ہے جس سے ارتکازِ زر پیدا ہوتا ہے، جبکہ سوشلزم شخصی ملکیت کا بالکل ہی انکار کر دیتا ہے۔ اسلام کا نظام معیشت ان دونوں کے درمیان اعتدال کے ساتھ چلتا ہے۔ اسلام کسی شخص کی ذاتی ملکیت کا اسی طرح احترام کرتا ہے جس طرح کسی کی جان کا احترام کرتا ہے۔مال کی شخصی ملکیت بھی انسانی جان کی طرح محترم ہے اور اس کا دفاع بھی مقدس اور محترم شمار ہوتا ہے۔ البتہ اسلام نے اکتسابِ زر کے ضرر رساں طرق پر ضرور پابندی عائد کی ہے تاکہ نہ کوئی مضر پیشہ اختیار کیا جائے اور نہ چوری، ڈکیتی، رشوت، قمار بازی، ذخیرہ اندوزی اور اسمگلنگ کے ذریعے مال حاصل کیا جائے۔ مخرب اخلاق کاروبار جیسے فلم سازی، موسیقی، سٹہ بازی کو بھی اجازت نہیں دی گئی۔ مطلب یہ کہ صرف حلال ذرائع سے ہی دولت کمانے کی اجازت ہے۔

اسلامی نظام کو سرمایہ دارانہ نظام قرار دینا اسی طرح غلط ہے جس طرح اسے اشتراکی نظام سے تعبیر کرنا ہے۔ سرمایہ داری فقط انفرادی ملکیت پر مشتمل نہیں جیسا کہ اشتراکیت صرف اجتماعی ملکیت کی قائل نہیں بلکہ ان دونوں میں ایک قید یہ بھی ہے کہ اسی ملکیت کو اصل اور بنیاد قرار دیا جائے اور دوسری قسم کو استثناء اور یہی وہ بات ہے جسے اسلامی اقتصاد کا مزاج برداشت نہیں کر سکتا۔ پس اسلامی نظام کو دونوں کا مجموعہ قرار دینا بھی ایک فاش غلطی ہے جیسا کہ بعض تجدید پسند مفکرین کا خیال ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام نے اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے ایک ایک جزء کو لے لیا ہے اور اس طرح دونوں کی خوبیوں کا مجموعہ بن گیا ہے۔[2]

---

[1] مناہج الباحثین فی الاقتصاد الاسلامی، حمد بن عبد الرحمان الجنیدل، شرکۃ العبیکان للطباعۃ والنشر، ریاض، السعودیہ، طبع 1406ھ، ص63

[2] اسلامی اقتصادیات اور جدید اقتصادی مکاتب، محمد باقر الصدر (ترجمہ:، ذیشان حیدر جوادی)، سازمان تبلیغات اسلامی روابط بین الملل، تہران، طبع ثانیہ 1406ھ، ص73

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بات اسلامی نظام کے تجزیہ کے وقت انتہائی مہمل معلوم ہو گی اس لئے کہ وہ نہ سرمایہ داری کی انفرادیت کا قائل ہے اور نہ اشتراکیت کی اجتماعیت کا۔ اس کا اپنا ایک انداز نظر ہے جس پر اس کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ دیگر دو نظاموں نے ایک ایک قسم کو اپنا کر اپنے کو ایسی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے جس کے بعد انہیں استثنائی حالات کا اعتراف کرنا پڑ رہا ہے۔

ملکیت کے سلسلہ میں اسلام کا موقف اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں سے الگ ہے۔ اشتراکیت نے ملکیت کا قانون مارکس کے مخصوص اقتصادی نظریات کی روشنی میں مرتب کیا ہے۔ سرمایہ داری نے ملکیت کو فطری آزادی کا نتیجہ قرار دیا ہے اور اسلام نے ملکیت کا قانون بناتے وقت دو اہم بنیادی نکات کو مرکز نظر بنایا ہے۔[1]

(1) عقیدۂ توحید

(2) اقسامِ اراضیات

(1) عقیدۂ توحید

عقیدۂ توحید کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ زمین اور اس کی تمام نعمتیں آسمان اور اس کی تمام برکتیں ایک ذات واجب کی نظر عنایت کا صدقہ ہیں۔ اس نے اس کائنات کو پیدا کر کے ایک اشرف المخلوقات نوع کی ترقی کا وسیلہ بنا دیا ہے اور اسے کائنات سے استفادہ کرنے کی پوری پوری اجازت دے دی ہے، البتہ یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ زندگی کے کسی لمحہ میں اور معیشت کے کسی میدان میں اس ذات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جس نے ان تمام نعمتوں کی بارش کی ہے اور جس کی نگاہِ لطف کے اشارے سے یہ پوری کائنات قائم و دائم ہے۔

(2) اقسامِ اراضیات

اقسامِ اراضیات کے سلسلہ میں "اسلامی قانون" "ملکیت کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس زمین کا جائزہ لیتا ہے جس کی ملکیت کا قانون وضع کیا جا رہا ہے اس کے یہاں انفرادی ملکیت کے ساتھ عمومی ملکیت اور حکومتی ملکیت جیسے مختلف تصورات بھی موجود ہیں اور ہر ایک کے لئے الگ الگ مورد تلاش کیا گیا ہے۔ اس نے مطلق طور پر ہر چیز کو نہ اجتماعی ملکیت قرار دیا ہے نہ انفرادی۔ زمینوں کی اس تقسیم کا فلسفہ یہ ہے کہ بعض زمینیں عام انسانی دسترس سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں جیسے کانیں، معدنیات، دریا وغیرہ۔ ایسی زمینوں کو خالص اسٹیٹ قرار دیا گیا ہے۔

---

[1] ایضاً

بعض زمینیں کسی جہاد کے نتیجہ میں فوج مخالف کے قبضہ سے نکالی جاتی ہیں۔ان میں سے بھی بعض آباد ہوتی ہیں اور بعض بنجر۔آباد زمینوں کی ملکیت کا قانون الگ ہے۔اور بنجر زمینوں کی ملکیت کا قانون الگ۔بنجر زمینیں مکمل طور پر محنت کی محتاج ہوتی ہیں اس لئے انہیں ان زمینوں کا ہمسر نہیں قرار دیا جاسکتا جن پر انسانی محنت صرف ہو چکی ہے اور جنہیں دشمن فوج کی آبادی نے کسی حد تک معمور بنالیا ہے۔

انفرادی ملکیت کے لئے صرف ان زمینوں کو مخصوص کیا گیا ہے۔جو دوست ودشمن اور جنگ وجہاد کے تصورات سے الگ ہو کر انسان کے قبضہ میں آتی ہیں۔باقی زمینوں کے لئے حالات اور مواقع دیکھ کر قوانین وضع کئے گئے ہیں۔[1]

مارکسیت اور سرمایہ داری نے زمینوں کی اس تقسیم کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔حالانکہ کم از کم مارکس کو اس تقسیم کو پیش نظر رکھنا چاہئے تھا اور ملکیت کا فیصلہ کرتے وقت یہ نکتہ نظر انداز نہیں کرنا چاہئے تھا کہ انفرادی زحمت سے انفرادی ملکیت پیدا ہوتی ہے اور اجتماعی محنت سے اجتماعی ملکیت۔محنت کی اہمیت کے اعتبار سے اسلام اور اشتراکیت دونوں متحد تھے لیکن آگے چل کر دونوں کا راستہ الگ ہو گیا۔اشتراکیت نے زمینوں کی آبادکاری کے سلسلہ میں اجتماعی اور انفرادی محنت کو یکساں کر دیا۔اور اسلام نے دونوں کے تفاوت کو باقاعدہ پیش نظر رکھا[2]۔اور اسی لئے اس نے کھلے لفظوں میں اعلان کر دیا:

((اَلنَّاسُ مُسَلِّطُوْنَ عَلیٰ اَمْوَاهِمْ))[3]

ترجمہ:لوگ اپنے اپنے مال پر پورا پورا اختیار رکھتے ہیں۔

قرآن مجید کی متعدد آیتوں نے بھی نتیجۂ عمل کو افراد کی طرف منسوب کرکے یہ واضح کر دیا ہے کہ ہر شخص انفرادی طور پر اپنے نتیجۂ عمل کا مالک ہوتا ہے۔کسی دوسرے شخص کو اس کے عمل اور اس کی محنت میں حصہ دار بننے کا حق نہیں ہے۔[4]

اسلام میں شخصی ملکیت قرآن مجید کی روشنی میں

مقدس اسلام نے انسانی عظمت واہلیت کے ماتحت شخصی ملکیت کو برقرار رکھا کیونکہ اس کے بغیر کوئی شخص حصول دولت کے لئے اپنے قوائے فکریہ اور عملیہ سے آزادی کے ساتھ پوری طرح کام نہیں لے سکتا۔

---

[1] آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات، محمد باقر الصدر (مترجم: ذیشان حیدر جوادی)، معراج کمپنی لاہور، سن طبع ندارد، ص106

[2] ایضاً

[3] بحار الأنوار، علامہ مجلسی،2/272

[4] ان آیات کا ذکر آنے والی بحث میں کیا جائے گا

ایسی صورت میں انسان کی علمی اور عملی قوتیں ضائع ہو جاتی ہیں اور اشرف المخلوقات کا علم و عمل کی قوتوں سے بالکل خالی ہو جانا حکمت تخلیق کے قطعاً منافی تھا۔ اس لئے اسلام نے شخصی ملکیت کے قوانین مقرر فرما دیئے اور صنعت و حرفت، تجارت و زراعت وغیرہ کے لئے ایسے مکمل قوانین تعلیم فرمائے جس طرح حصول دولت کے لئے تعلیم فرمائے تھے۔ اہل دولت کو مال خرچ کرنے میں ان قوانین کا پوری طرح پابند کر دیا کیونکہ مالداروں کی مطلق العنانی اقتصادی اور معاشرتی نظام کی تباہی کا موجب ہوتی ہے۔

رزق کی کمی بیشی کی بناپر طبقاتی امتیاز اور ذاتی ملکیت جن آیات سے ثابت ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

(۱)﴿وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ﴾[1] ترجمہ: اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق کے معاملہ میں فضیلت (برتری) دی ہے۔

(۲)﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللَّهُ بِهِ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾[2] ترجمہ: اور اللہ نے تم سے بعض کو دوسرے بعض پر جو زیادتی (بڑائی) عطا کی ہے، تم اس کی تمنا نہ کرو۔

(۳)﴿يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ﴾[3] ترجمہ: (اللہ تعالیٰ) جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کی چاہتا ہے نپی تلی کر دیتا ہے۔

اب وہ آیات ملاحظہ فرمایئے جن سے انفرادی ملکیت ثابت ہونے کے علاوہ ان اصول و قوانین پر بھی پوری روشنی پڑتی ہے جن کی پابندی سے وہ تمام خرابیاں کلیۃً دور ہو سکتی ہیں جن کا شخصی ملکیت اور طبقاتی امتیاز کی وجہ سے پیدا ہونا ممکن ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

(4) ﴿وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنِ﴾[4] ترجمہ: اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے رہنا اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کیساتھ۔

---

[1] سورۃ النحل:16/ ۷۱

[2] سورۃ النساء:4/ ۳۲

[3] سورۃ الشوریٰ:42/12

[4] سورۃ البقرۃ:2/83

اگر ہر صاحب دولت اپنے والدین، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں کے حق میں اس قانونِ الٰہی پر عمل کرے اور ان کے ساتھ احسان وصلہ رحمی کرتا رہے تو طبقاتی کشمکش اور معاشی نظام میں کسی قسم کی خرابی پیدا نہ ہونے پائے۔

(5)﴿وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ [1] ترجمہ: اور وہ لوگ جو جمع کرتے ہیں سونا چاندی اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے انہیں سخت عذاب کی خوشخبری سنادو۔

دولت سے بے شمار قسم کی برائیاں اور مصیبتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دولت کو صرف کرنے کے لئے پاکیزہ اصول تعلیم فرمائے۔ بھلائی اور نیکی کے کاموں میں صرف دولت کو منحصر فرما کر فضول خرچی اور بے راہروی سے روکا۔ ارشاد فرمایا:

(6)﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ﴾ [2]

ترجمہ: اور رشتہ دار، غریب اور مسافر (ہر ایک) کو اس کا حق پہنچاتے رہو فضول خرچی نہ کرو اور فضول خرچی کرنے والے شیاطین کے بھائی ہیں۔

دوسری جگہ وضاحت سے فرمایا:

اسلام نے دولت مندوں کے لئے زکوٰۃ کا قانون اسی حکمت کے لئے مقرر فرمایا ہے کہ غرباء و مساکین جو اپنی ضروریات کو پورا کرکے ذرائع و وسائل سے محروم ہیں مبتلائے تکلیف نہ رہیں۔

مالِ خیرات کے مستحق فقراء، محتاج و بے کس افراد، خیرات کا مال اکٹھا کرنے پر متعین لوگ اور وہ لوگ ہیں جن کو مذہب اسلام کی طرف متوجہ کرنا مقصد ہو درحالانکہ انکے دل پہلے سے ہی اسلام کی طرف جھکے ہوں، ان موارد کے علاوہ یہ مال غلاموں کی رہائی میں، مقروض افراد کے قرض کی ادائیگی میں، مجاہدین کے ساز و سامان میں اور مسافروں کے زادِ راہ میں خرچ ہوتا ہے۔ یہ حقوق اللہ کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور اللہ بہت علم و حکمت والا ہے۔

قرآن کریم کی ان تصریحات سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ اسلام ایسی سرمایہ پرستی سے بھی دور ہے جس میں دولت ایک جگہ محدود ہو کر رہ جائے اور دولت مندوں کے سوا کوئی اس سے مستفید نہ ہو سکے اور اشتراکیت سے بھی اسلام کا کوئی تعلق نہیں جو انسان کی کمائی ہوئی دولت سے اس کا جائز حق بھی سلب کرتی ہے بلکہ اسلام اس اعتدال کا حامی ہے جو سرمایہ پرستی اور اشتراکیت کے

---

[1] سورۃ سورۃ التوبہ:9/34

[2] سورۃ الاسراء:17/27،26

بین بین ہے۔ مقدس اسلام ہر معاملہ میں افراط و تفریط سے بچا کر میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے موجودہ دور میں سرمایہ پرستی اور اشتراکیت کا تصادم دنیا کو ہلاکت کی طرف تیزی سے لئے جارہا ہے۔ ہلاکت سے بچنے اور نجات و فلاح دارین حاصل کرنے کا واحد ذریعہ مقدس اسلام اور اس کا معاشی نظام ہے۔

اسلام میں انفرادی ملکیت کے ضمن میں غربت کے خاتمے کے اقدامات

1۔ انفرادی وذاتی ملکیت کے حدود و قیود کا نفاذ

اسلام ذاتی ملکیّت کی نفی نہیں کرتا اور نہ ہی اسے ناجائز ٹھہراتا ہے، البتہ دولت کے حصول اور خرچ کرنے کی راہیں ضرور متعین کرتا ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام دولت کے حصول کے لیے ہر طریقے اور ہر راستے کو جائز قرار دیتا ہے۔ جوا، شراب، جنس فروشی، ذخیرہ اندوزی، مصنوعی مہنگائی، سرمایہ دارانہ نظام میں جائز ٹھہرتی ہے، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ ریاست کو اس کا ٹیکس ادا کر دیا جائے، اس ظالمانہ نظام معیشت کے مقابلے میں میں سوشلزم (اشتراکی نظام) وجود میں آیا، جس میں تمام ملکی پیداوار کی مالک حکومت ہوتی ہے اور عوام الناس کو ضروریات زندگی حکومت مہیا کرتی ہے، ان کی ذاتی ملکیت میں کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اسلام سود کو حرام قرار دیتا ہے تاکہ سرمایہ داری کو تقویت حاصل نہ ہو۔ اسی طرح جواءلاٹری اور سٹہ بھی حرام ہے، ان چیزوں میں دوسرے کا مال بغیر معاوضے کے ہتھیا لیا جاتا ہے، جس سے ہارنے والے کا دل مال جیتنے والے کی طرف سے خراب ہو جاتا ہے اور فتنہ وفساد برپا ہوتا ہے، جو امن عامہ کو خراب کرتا ہے۔

اسلام میں نجی مالکیت کا احترام کیا جاتا ہے لیکن اس کی حد بھی معین کر دی گئی ہے۔ حد کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام نے مادی حوالے سے تخمینہ لگا کر ایک حد کو مقرر کر دیا ہو کہ اگر کسی کا مال مثلاً اتنے روپے، ریال، دینار یا ڈالر سے تجاوز کر جائے تو پھر اس کی نجی ملکیت کی حدود ختم ہو جائیں گی۔ اسلام نے اس طرح کی کسی کمیت کی کوئی نشاندہی نہیں کی ہے کیونکہ کمیت اور مقدار کی ویلیو (Value) ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔ لہذا کمیت کی بجائے کیفیت کی تمام حدیں مقرر و معین کر دی گئی ہیں۔ اور کیفیت کے لئے "ضرر وضرار" کی حد رکھی گئی ہے۔ حدیث نبوی میں آیا ہے کہ:

((مَلْعُونٌ مَنْ ضَارَّ مُؤْمِنًا أَوْ مَكَرَ بِهِ))[1]

ترجمہ: ملعون ہے وہ شخص جو کسی مومن کو دھوکہ دے یا اسے کوئی نقصان پہنچائے۔

---

[1] سنن الترمذی، محمد بن عیسی ترمذی، أبواب البر والصلة، حدیث رقم 1947، ص 4/332

یعنی اگر کسی کی ذاتی دولت اور سرمائے سے امت مسلمہ یا مسلمانوں کی ایک تعداد کو نقصان پہنچنے لگے تو اس ملکیت کو ضرر رساں بننے سے قبل کی حد پر روک دیا جائے گا۔ اسلام میں ذاتی اور نجی ملکیت کا احترام ہے مگر اس وقت تک کہ جب تک وہ ذخیرہ اندوزی، استحصال، تفریق، انسانوں کی بے حرمتی اور سرکشی پر منتج نہ ہو جائے۔ اسلام کی نظر میں دولت بذات خود بری چیز نہیں ہے لیکن جب یہی دولت سرکشی، اسراف، ذخیرہ اندوزی اور دوسروں کے استحصال جیسے عوامل میں استعمال ہونے لگے تو اس وقت ان چیزوں کے باعث ذاتی ملکیت میں موجود دولت بھی بری ہو جاتی ہے۔ تو انفرادی یا نجی ملکیت کی یہی حدیں ہیں۔ اسلام نے ان برائیوں کی روک تھام پر توجہ دی ہے، اسراف کو مسترد اور اسراف کرنے والے کو قابل مذمت قرار دیا ہے اور اسلامی حاکم اور حاکم شرع کو اسراف، استحصال، تفریق، سرکشی اور ذخیرہ اندوزی کو روکنے کی اجازت دی ہے۔ بنابریں اسلامی حاکم اور اسلامی حکومت کے سربراہ کو یہ اختیار ہے کہ اپنے حکم سے اس زیادہ روی کو روکے[1]۔

اسلامی نظام نجی ملکیت کو قبول کرتا ہے، لوگوں کی اقتصادی کوششوں اور سرگرمیوں کو بھی مانتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ضرورتمندوں اور محتاج لوگوں کے رفاہ و آسائش کے لئے بھی معاشرے کو ایک اک قدم آگے لے جاتا ہے۔ آزاد اسلامی معیشت میں اقتصادی آزادی کے تقاضے کے مطابق معاشرے کے اقتصادی امور کی ذمہ داری اور اقتصادی امور کا سنگین بار عوام کے دوش پر ہوتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں یہ حق ملکیت حقیقی ہوتا ہے لیکن اسلام میں یہ حق ملکیت عارضی ہے، کیونکہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر چیز کا مالک حقیقی صرف اللہ ہے اور زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے وہ اولاً و بالذات اسی کا ہے۔ انسان کو اس نے ان اشیاء کے صرف حقوق ملکیت عطا کیے ہیں اور ان حقوق کو استعمال کرنے میں وہ ایک نائب سے زیادہ کچھ نہیں وہ ان اشیاء میں تصرف کا حق رکھتا ہے لیکن اس سلسلہ میں اسے مالک حقیقی یعنی اللہ تعالی کی رضا اور اس کا منشاء ضرور پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

یوں نائب خدا ہونے کی حیثیت سے انسان کے ذمہ دنیا و آخرت دونوں کی فلاح کا حصول ہے۔ کائنات کی ہر شے کا مقصد انسان کو اپنے مقصد اور ہدف کے حصول میں تعاون فراہم کرنا اور معاونت کرنا ہے۔ اسی طرح انفرادی و نجی حقِ ملکیت کا حصول بھی انسان کا مقصد زندگی نہیں بلکہ مقصد کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ انسان کو انفرادی و نجی ملکیت کے ضمن میں دیے گئے اختیارات، بطور آزمائش و امتحان دیے گئے ہیں اور ظاہر سی بات ہے کہ آزمائش اسی صورت میں ہوتی ہے کہ جب انسان کو اپنی مرضی اور اپنی پسند و ناپسند کے مطابق عمل کی آزادی حاصل ہو۔ البتہ اس طرح سے بطور آزمائش حاصل ہونے والی آزادی بھی بلا

---

[1] الانسان والمال في الاسلام، عبد النعيم حسنين، ص186

قید و شرط اور بلا حدود و قیود نہیں ہے بلکہ اس اختیار کو یوں محدود رکھا گیا ہے کہ اس کی آزادی ملکیت سے دوسرے افراد کی آزادی مجروح نہ ہو اور اس آزادی سے معاشرہ میں فساد اور فتنہ برپا نہ ہو۔ دوسروں کے حقوق پامال نہ ہوں اور انہیں اس آزادی سے کوئی آزار نہ پہنچے بلکہ مال و ملکیت کی یہ آزادی ان کے بوجھ کو سہارنے اور ان کی محتاجی و ضرورتمندی کے احساس کو ختم کرنے کی وجہ اور علت بنے۔

اسلام کی نظر میں صحیح طریقہ کار یہ ہے کہ ذات تبارک و تعالیٰ کے ودیعت کردہ قوانینِ فطرت کے عین مطابق ایک طرف تو زمین اور وسائلِ پیداوار میں انفرادی ملکیت کو ایک حد تک جائز قرار دیا جائے اور دوسری جانب اجتماعی مفادات کے پیش نظر اس پر ایسے قیود و شرائط عائد کیے جائیں کہ جو انفرادی ملکیت میں اعتدال و توازنِ حقیقی برقرار رکھیں[1]۔ علم الاجتماع ہو یا علم الاخلاق دونوں کا ہی یہ نظریہ ہے کہ انفرادی حقوق و فرائض میں اعتدال ہی اجتماعی حقوق و فرائض کے لیے بہترین کفیل ہے۔ بایں سبب اسلام ذاتی ملکیت تسلیم کر کے اس کی تحدید کرنا چاہتا ہے اور انفرادی ملکیت کی آڑ میں ہرگز مالی وسعت کی ایسی کسی صورت کو پسند نہیں کرتا جس کی بدولت اس کے اقتصادی نظام کی بیان کردہ اساس و بنیاد پر زد پڑے۔

اسلامی اقتصادی نظام کو دقت کے ساتھ دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ جب اسلام انسان کے طبیعی رجحان کا لحاظ کرتے ہوئے انسان کو اسکی محنت کے نتیجے کا حقدار قرار دیتا ہے تو اس سے دو اہم نکات واضح ہو جاتے ہیں:

(1) اقتصادیات میں انفرادی ملکیت کا تصور صرف اس بنا پر ہے کہ انسانی عمل ملکیت کا باعث ہوتا ہے اور یہ ہر شخص کا ایک فطری رجحان ہے کہ جس طرح عمل کو اپنی ذاتی محنت و مشقت سے انجام دیتا ہے اسی طرح اس کے ثمرات و نتائج سے بھی خود ہی استفادہ کرے۔ اسی انفرادیت کی خواہش کو علم الاجتماع کی اصطلاح میں ملکیت کہتے ہیں[2]۔ اسلام دین فطرت ہونے کے اعتبار سے انسان کے اس جذبہ کا احترام کرتے ہوئے اس کی انفرادی ملکیت کا اعتراف کرتا ہے لیکن اس ملکیت میں مختلف تصرفات کو علم الاجتماع کے حوالے کر دیتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اس کی انفرادی ملکیت کے حدود و قیود اجتماعی نظام کی طرف سے مقرر ہوں گے۔ چونکہ انفرادی ملکیت کی مطلق آزادی معاشرہ کے حق میں انتہائی مضر ہے اس لئے یہ مسئلہ اجتماعیات ہی سے حل ہو گا۔

---

[1] فقہ الاقتصاد الاسلامی، یوسف محمد، دار القلم للنشر والتوزیع، الکویت، طبع اول 1988ء، ص218

[2] آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات، محمد باقر الصدر، ص52

اسلام نے خود بھی ان حدود و قیود کا اہتمام کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے جملہ حدود، ان مفاہیم واقدار کی بنا پر ہیں جن پر اس کے سارے نظام کی بنیاد ہے اور اسی لئے اس نے اسراف کو حرام کیا ہے اور باقی مصارف کو جائز رکھا ہے، سودی تجارت کو ممنوع قرار دیا ہے اور باقی طریقوں کو جائز رکھا ہے۔ اور اسی طرح دیگر قوانین بھی وضع کیے ہیں۔

(2) اسلام کی نظر میں انسان کی انفرادی ملکیت عمل سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا اسے عمل ہی کے دائرہ تک محدود رہنا چاہئے جہاں انسانی محنت کی دسترس نہ ہو وہاں اس ملکیت کا سوال بھی نہیں اٹھنا چاہیے۔[1]

اسلام بنیادی طور پر تمام چیزوں کے بارے میں یہ حکم لگاتا ہے کہ وہ مباح الاصل ہیں، یعنی وہ کسی کی بھی ذاتی و شخصی ملکیت نہیں ہیں بلکہ خالقِ کائنات نے ان کو تمام افرادِ انسانی کے لیے یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کے لیے پیدا کیا ہے۔

لیکن بعد میں دیگر آیاتِ قرآنی، احادیث نبوی اور روایاتِ فقہی گزشتہ آیت میں موجود عموم کی تخصیص کرتی ہیں، اور اس بات کو واضح کرتی ہیں کہ کون کون سی چیزیں انفرای ملک نہیں بن سکتیں اور کون سی چیزیں ہیں جن کو نجی یا ذاتی ملکیت میں لیا جا سکتا ہے۔ لہذا جب مذہب نے کچھ اشیاء کو عام فائدہ کی خاطر سب کے لیے یکساں طور پر مباح قرار دیا ہے اور اس لیے ان اشیاء کے متعلق کسی فردِ واحد یا کسی مخصوص گروہ کو کھلی چھٹی نہیں دی کہ وہ مفادِ عامہ کے بر خلاف ان اشیاء کو اس طرح اپنے قبضے اور تصرف میں لے لیں۔ لہذا کائنات کی تمام اشیاء فی نفسہ کسی کی بھی ذاتی ملکیت نہیں ہیں اور بنی نوع آدم کے تمام افراد کو اس سے یکساں طور پر فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔ البتہ بعض اشیاء کی نسبت حکومت کو اجازت ہے کہ وہ مفاد عامہ کے استفادہ کو یقینی بنانے کے لیے ان اشیاء میں سے بعض کو اپنے ہاتھوں میں لے لے، ان میں عوام الناس کی بھلائی کے لیے مناسب تصرف کرے یا ان کی درآمد و برآمد کا انتظام کرے۔ عوام الناس اس چیز کو یوں تصرف میں نہیں لا سکتے کہ حکومت کے مقررہ منافع ادا کرنے کے بعد باقی بچ جانے والی سب چیز ان کی ملکیت قرار پائے اور اس طرح وہ اس کے اجارہ دار اور مالک بن بیٹھیں۔[2]

گویا اموالِ عالم کی دو قسمیں ہوئیں۔

(i) ان میں سے اموال کی ایک قسم وہ کہ جس میں مال انسانی محنت سے تخلیقی یا صناعتی منزلیں طے کرتا ہے جیسے کپڑا، اینٹیں، دوایاں اور ہاتھ کی صنعتوں سے بنی ہوئی اشیاء وغیرہ۔

---

[1] آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات، محمد باقر الصدر، ص52

[2] اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، ص284

(ii) جب کہ دوسر قسم میں وہ مال شامل ہے جس کی تخلیق و صنعت گزاری میں انسان کو کوئی عمل دخل نہیں ہوتا البتہ ان چیزوں کے استخراج یا انہیں قابلِ عمل بنانے کے لیے انسانی عمل کارفرما ہوتا ہے جیسے معنیات، پٹرول، تیل، سیمنٹ وغیرہ۔ ان اشیاء کا وجود انسانی محنت کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ انسانی صنعت نے انہیں کوئی خاص شکل دی ہے۔ بلکہ اس پر صرف ہونے والی محنت کا کام صرف یہ ہے کہ انہیں استفادہ کے قابل بنادے۔ اسی قسم کی دولت میں انفرادی ملکیت کی بحث اٹھتی ہے اور یہیں اسلام نے ملکیت اور حقوق کے احکام وضع کئے ہیں۔[1]

چونکہ ان اشیاء کی تخلیق خالق طبیعت کے ہاتھ سے ہوتی ہے اور انسانی عمل کا اس میں کوئی حصہ نہیں لہذا ابتدائی طور پر اس ثروت کو کسی کی ملکیت نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اس کی تخلیق میں انسانی عمل کو دخل نہیں ہے بلکہ تمام امت کے لئے مباح اور حلال ہونا چاہئے جس طرح کہ زمین کا حال ہے کہ وہ کسی کی ملکیت نہیں ہے۔ عمل اس کی اصلاح میں حصہ لیتا ہے اور وہ بھی محدود اوقات میں، لہذا اس عمل کو موجبِ ملکیت نہیں قرار دیا جاسکتا بلکہ اس سے صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے عمل کرنے والا اس سے استفادہ کرسکے اور دوسروں کو اس سے روکنے کے لیے حق بجانب نہ ہو، کیونکہ زحمت اسی نے کی ہے، حق بھی اسی کا مقدم ہونا چاہئے۔ یہ صریحی ظلم ہے کہ محنت کرنے والے کو بیکار لوگوں کے برابر بنادیا جائے۔ لیکن اس خصوصیت کا تعلق صرف ان اوقات سے ہے جن میں محنت کرنے والا زمین سے استفادہ کرتا رہے۔ اب اگر اس نے ہاتھ کھینچ لیا تو اس کا حق ختم ہوجائے گا اور زمین اپنی اصلی حالت کی طرف پلٹ جائے گی۔[2]

ان اشیاء کی نسبت حکومت مفاد عامہ کے استفادہ کو یقینی بنانے کے لیے ان اشیاء میں سے بعض کو یا سب کو اپنے ہاتھوں میں لے سکتی ہے، ان میں عوام الناس کی بھلائی کے لیے مناسب تصرف یا ان کی درآمد و برآمد کا انتظام بھی ریاست کے ذمہ ہے۔ کسی کو یہ اجازت نہیں کہ وہ اکیلا یا چند اشخاص مل کر اس چیز کو اس طرح تصرف میں لائیں کہ حکومت کے مقررہ منافع ادا کرنے کے بعد باقی بچ جانے والی سب چیز ان کی ملکیت قرار پائے اور اس طرح وہ اس کے اجارہ دار اور مالک بن بیٹھیں۔

انفرادی و نجی ملکیت کے ضمن میں اسلام کا موقف یہ ہوا کہ انسان کو جو ملکیت ملی ہے وہ مطلق نہیں بلکہ محدود ہے۔ مالک حقیقی تو اللہ کی ذات ہے اور پھر اس نے انسان کو جو اختیار دیا ہے وہ چند حدود و قیود کا پابند ہے۔ ان حدود و قیود کا تعلق مال کے استعمال اور اس میں کیے جانے والے تصرف سے ہے۔ اسلام واضح ہدایات دیتا ہے کہ کسی کی اپنی ذاتی محنت اور حلال سے کمائے ہوئے مال کو

---

[1] آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات، باقر الصدر، ص51

[2] اسلامی اقتصاد اور جدید اقتصادی مکاتب، باقر الصدر، ص:79

بھی ضائع مت کیا جائے اور نہ غیر شرعی مصارف میں لگایا جائے ،اس میں اسراف یا تبذیر وتقتیر نہ کی جائے،اپنے مال کو عیش و عشرت کے لیے استعمال کیا جائے نہ ہی کسی قسم کے ضرر رسان اور نقصان دہ امور میں اس کو اڑایا جائے،بلکہ مال کو محترم جانتے ہوئے اس کو مکمل احتیاط کے ساتھ اور اللہ کا بتائی گئی حدود کے اندر ہی استعمال ہونا چاہیے۔امام زیلعی مال کے تصرف کی حدود کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

”ہر آدمی کو حق رکھتا ہے کہ اپنی ملکیت میں اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق ہر قسم کا تصرف کر سکے جب تک کہ اس سے دوسروں یعنی پڑوسیوں وغیرہ کو کھلا ہوا نقصان نہ پہنچ رہا ہو۔“[1]

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام نے ایک طرف نجی و ذاتی ملکیت کو قبول کر کے افرادِ عالم کو محنت و مشقت اور کمائی کے تمام راستوں کی طرف راغب کیا ہے تاکہ وہ اپنی نجی ملکیت کی آزادی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ محنت و لگن سے کام کریں اور اس کا استفادہ بھی حاصل کریں۔لیکن دوسری طرف کچھ حدود و قیود کو معین کر کے تمام دولت کو معاشرے کے چند ہاتھوں میں روکنے کا سدِ باب کر دیا ہے تاکہ دولت چند افراد تک محدود نہ رہے اور باقی لوگ اس سے محرومی کی وجہ سے ان کے محتاج بن کر نہ رہ جائیں۔اس طرح سے نہ صرف ملکیت کی حدود کا اجراء کیا ہے بلکہ معاشرے میں ممکنہ طور پر آنے والے غربت کے اسباب وعوامل کا بھی تدارک کیا ہے۔

2۔ حقِ معیشت میں مساوات

یعنی تمام انسان اپنے بنیادی حقوق اور شناخت کی بنیاد پر باہم برابر ہیں۔مذہبی،لسانی،صنفی،معاشی یا کسی بھی قسم کا فرق ان کو ان کے بنیادی انسانی حقوق اور شناخت سے محروم نہیں کر سکتا۔سیاست میں شہریت کی مساوات،معیشت میں مواقع کی مساوات، سماج میں مذہبی آزادی،اظہار رائے کی آزادی اور حقِ اجتماع یہ سب آزادی اور مساوات کے زمرے میں آتے ہیں۔

مساوات دراصل برابری کو کہتے ہیں،یعنی فرزند آدم ہونے کے ناطے سب انسان برابر ہیں،وہ سب ایک باپ کی اولاد اور برابر کے انسان ہیں۔مساوات کا جو درس اسلام نے عالم انسانیت کو دیا ہے وہ کسی اور نظریہ حیات میں نہیں ملتا۔

مساوات کو تمام اجتماعی انسانی حقوق کی اساس قرار دیا گیا ہے۔کہا جاتا ہے کہ اسی تصور سے تمام حقوق نکلتے ہیں جن کی بنیاد پر سارے انسان مساوی حیثیت کے مالک ہیں۔ان میں عورت، مرد، بڑے، چھوٹے، امیر، غریب، مالک اور مزدور سب کا درجہ ایک ہے۔ان میں رنگ و نسل، وطن، علاقے، جنس اور صنف کی بنا پر کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے۔اسلام نے مساوات کی یہ آواز جتنے

---

[1] تبیین الحقائق شرح کنزالد قائق، عثمان بن علي فخر الدين الزيلعي، المطبعۃ الكبرى الأميرية، بولاق، قاہرہ، طبع اول 1313ھ، 4/196

زوردار طریقے سے اٹھائی، اس سے زور دار آواز اٹھائی نہیں جاسکتی۔ قرآن کی آیات اس سلسلے میں معروف ہیں۔ حجۃ الوداع کے موقعے پر رسول اللہ نے جو بے نظیر خطبہ دیا، جسے انسانی حقوق کا اولین منشور کہیں تو بے جا نہ ہوگا، اس میں آپ نے فرمایا:

((لا فضل لعربی علٰی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا لاسود علی احمر الا بالتقوٰی))[1]

ترجمہ: نہ تو عربی کو عجمی پر اور نہ عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر کوئی فضیلت ہے، مگر یہ کہ (کسی میں) تقویٰ ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد میں سب سے پہلے عرب کا ذکر فرمایا۔ اس لیے کہ عربوں کے ذریعے اسلامی انقلاب آیا تھا۔ عرب اس وقت تختِ حکومت پر فائز اور فرماں روا تھے۔ ان سے کہا گیا کہ یاد رکھو کسی عربی کو کسی عجمی پر فوقیت نہیں ہے اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ 'الا بالتقویٰ' کا مطلب یہ ہے کہ برتری تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر کسی کے اندر تقویٰ ہے تو وہ افضل ہے، اس کا احترام ضرور ہونا چاہیے اور سوسائٹی میں اس کی عزت و توقیر ہونی چاہیے۔ اس کی جگہ یہ دیکھنا کہ کون گورا ہے، کون کالا، کون عربی ہے اور کون عجمی، کون امیر ہے اور کون غریب، کون مرد ہے اور کون عورت ہے یہ سب ناجائز اور غیر اسلامی رویے ہیں۔ یہ اعلان اس وقت ہوا جب دنیا میں مساوات کا واضح تصور تک نہیں پایا جاتا تھا۔

اسلامی نقطہ نظر سے زمین اور اس کی سب چیزیں اللہ نے بنی نوع انسان کے استفادہ کے لئے بنائی ہیں۔ اس لئے ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس حق میں تمام انسان برابر شریک ہیں، کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ نہ کسی کو اس معاملے میں دوسروں پر ترجیح حاصل ہوسکتی ہے۔ کسی شخص نسل یا طبقے پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہوسکتی کہ وہ رزق کے وسائل میں سے بعض کو استعمال کرنے کا حقدار ہی نہ رہے، یا بعض پیشوں کا دروازہ اس کے لیے بند کر دیا جائے۔ اسی طرح ایسے امتیازات بھی شرعاً قائم نہیں ہوسکتے جن کی بنا پر کوئی ذریعہِ مُعاش یا وسیلۂ رزق کسی مخصوص طبقے یا خاندان کا اجارہ بن کر رہ جائے۔ اللہ کی بنائی ہوئی زمین پر اس کے پیدا کیے ہوئے وسائلِ رزق میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا سب انسانوں کا یکساں حق ہے اور اس کوشش کے مواقع سب کے لیے یکساں کھلے ہونے چاہیے۔

یوں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ معاشی عدل وانصاف سے مراد یہ ہے کہ وسائل رزق اور معیشت پر چند افراد کی اجارہ داری نہ ہو بلکہ معاش کی راہیں سب کے لیے یکساں طور پر کھلی ہوں۔

---

[1] مسند احمد، امام احمد بن حنبل، 5/114

﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ﴾[1]

ترجمہ: "تا کہ دولت تمہارے امیروں کے درمیان ہی نہ رہے۔"

اسلام کے حقِ معیشت میں مساوات کے نظریے سے مراد یہ ہے کہ وسائلِ معاشرہ تک بلاامتیازِ مذہب و زبان و رنگ و نسل و جنس افرادِ معاشرہ کی بنا کسی قدغن اور روک ٹوک کے رسائی کا حاصل ہونا کہ جس سے ایک طرف تو افرادِ معاشرہ اپنی بنیادی ضروریات جیسا کہ روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم، صحت، نکاح، روزگار وغیرہ کو پورا کر سکیں اور دوسری طرف اپنی لامحدود باطنی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخش سکیں۔

3۔معاشی جدوجہد کا آزادانہ حق

کائنات کی تمام مخلوقات اللہ کی پیدا کردہ ہیں اور وہی ان کی تمام ضروریات کا کفیل اور ذمہ دار ہے۔چنانچہ معاشی ضروریات کی تکمیل کا بوجھ بھی اسی کے سر ہے۔وہ فرماتا ہے کہ:

﴿ وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا ﴾[2]

ترجمہ: اور زمین میں کوئی چلنے پھرنے والا جانور نہیں ہے مگر یہ کہ اس کا رزق خدا کے ذمے ہے۔

اسلامی معاشرے میں اقتصادی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت ایسی پالیسی اختیار کرے اور ایسے قانون وضع کرے جس کی بنا پر معاشرے کے تمام افراد آزادانہ اقتصادی سرگرمیاں انجام دینے پر قادر ہوں اور معاشرے کے تمام طبقات کو اقتصادی سرگرمیاں کرنے کا موقع حاصل ہو۔معاشرے میں حقیقی معنی میں آزاد معیشت وجود میں لانے کا طریقہ یہ ہے کہ سرمایہ داری کے انحصار اور اجارہ داری کو توڑا جائے۔ایسی سہولتیں فراہم کی جائیں کہ معاشرے کے اکثر و بیشتر افراد، معاشرے کے بیشتر طبقات یا سارے کے سارے لوگ جو کام کرنے کی طاقت رکھتے ہیں، زمین، سمندر، میدانوں اور چراگاہوں کے وسائل و امکانات سے استفادہ کر سکیں۔[3]

حضرت علی کا قول ہے کہ:

---

[1] سورۃ الحشر:59/7

[2] سورۃ ہود:11/6

[3] اصول الاقتصاد السیاسی، عادل حشیش، دار الجامعۃ الجدیدۃ للنشر الاسکندریہ، مصر، طبع 2003ء، ص194

"ما رئيت نعمة موفورة الا و فی جانبها حق مضيع"[1]

ترجمہ: یعنی میں نے کہیں بھی نعمتوں کی کوئی ایسی ذخیرہ اندوزی نہیں دیکھی جس میں کسی کی حق تلفی نہ کی گئی ہو۔

اس جملے کا ایک بڑا لطیف مفہوم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں بھی نعمتوں کی فراوانی ہے، دولت زیادہ ہے، وسائل کی بہتات ہے، وہاں در حقیقت یہ دولت اور ثروت اپنے مالک کو زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کے بہت زیادہ وسائل فراہم کر دیتی ہے اور ان وسائل کو دوسروں کی دسترسی سے نکال دیتی ہے۔ معاشرے میں جس کے پاس دولت زیادہ ہے وہ زیادہ دولت کما سکتا ہے اور ان چیزوں سے زیادہ بہتر استفادہ کر سکتا ہے جن کا تعلق عام لوگوں سے ہے، جبکہ یہ غریب کے بس کی بات نہیں ہے[2]۔ لہذا جس کے پاس زیادہ دولت ہے اس کے پاس زیادہ مواقع ہیں، زیادہ وسائل ہیں۔ اقتصادی سرگرمیوں کا میدان اس کے پاس ہے۔ اس طرح عوام کی اکثریت جس کے پاس اتنی دولت نہیں ہے، مواقع سے محروم رہتی ہے۔

معلوم ہوا کہ اسلامی معاشرے میں آزاد معیشت کا راستہ یہ نہیں ہے کہ یہ آزادی صرف ان لوگوں کے قبضے میں رہے جو اقتصادی و مالی توانائی رکھتے ہیں، بلکہ ہونا یہ چاہئے کہ جن افراد کے پاس مالی و اقتصادی طاقت ہے وہ اس انداز سے کام کریں کہ معاشرے اور نظام کی حالت اور معاشرے کے اندر پائے جانے والے تعلقات و روابط ایسی شکل اختیار کریں کہ جن کے پاس بھی کام کرنے کی طاقت ہے وہ آزادانہ اقتصادی سرگرمیاں کریں اور اپنے کام سے مستفید ہوں۔

انسان کو اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کا حق ملنے کے حوالے سے اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں بالکل واضح ہی نہیں بہت وسیع بھی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پوری زمین میں انسانوں کی معیشت کا سازو سامان پھیلا ہوا ہے۔ اس سے سب ہی استفادہ کر سکتے ہیں۔ اللہ ہی ہے جو حسبِ مشیت سب کو روزی بہم پہنچاتا ہے اور چاہتا ہے کہ بغیر کسی فرق و امتیاز کے کائنات کے ہر فرد کو وسائلِ زندگی کے حصول کا اختیار ہو اسی مقصد سے اس نے زمین س آسمان کی تمام چیزوں کو وجود بخشا۔ انہیں انسانوں کے لیے مسخر کیا اور ان سے انتفاع و استفادہ کے مناسب مواقع اور ضروری صلاحیتیں ان مخلوقاتِ ارضی کو عطا کیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی اس زمین میں جو اسبابِ معاش ہیں ان سے فائدہ حاصل کرنے کا ہر ایک کو حق ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

---

[1] دراسات فی نہج البلاغہ، شمس الدین محمد مہدی، دار الزہراء، بیروت، طبع ثانیہ 1392ھ، ص40

[2] علم الاجتماع الاقتصادی، عبد اللہ عبد الرحمن، ص235

﴿فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ﴾[1]

ترجمہ: اس (زمین) کی راہوں میں چلو پھرو اور خدا کا (دیا ہو) رزق کھاؤ۔

فرقانِ حمید کی مذکورہ آیت اور ایسی دیگر آیات سے واضح ہے کہ زمین و آسمان میں رکھے ہوئے وسائلِ معیشت سے استفادہ و انتفاع کا تمام انسان مساوی اور برابر حق رکھتے ہیں۔ رب کائنات نے، کائنات کے اندر اپنی مخلوقات کے لیے جو ذرائعِ معاش رکھے ہیں وہ بلا تفریق سب کے لیے یکساں اور مساوی ہیں۔ کسی کو بھی کسی دوسرے کے حق میں مداخلت کا اختیار نہیں ہے۔ تمام افراد بشر کو برابری کے ساتھ یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو کام میں لا کر باعزت اور حلال طریقے سے اپنی روزی کمائے اور کائنات کا ایک فرد بھی محرومِ معیشت نہ رہے۔

اسلام افراد معاشرہ کے درمیان معاشی مساوات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ معاشی مساوات کا مفہوم یوں نہیں ہے کہ ایک شخص کے ہاں جتنی دولت ہو اتنی ہی دولت دوسرے کے پاس بھی ہو۔ یا سب وسائل رزق یا دولت کو تمام لوگوں سے چھین کر پھر انہی میں دوبارہ برابر برابر تقسیم کر دیا جائے، کیوں کہ ایسی مساوات غیر فطری بھی ہے اور نا قابلِ عمل بھی۔ چونکہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کے پاس یکساں مال و دولت ہو۔ ذہنی صلاحیت میں کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف افراد کے درمیان فرق ضروری ہوتا ہے، کیوں کہ اس کے بغیر حقیقی معنوں میں کوئی موئثر تمدنی نظام قائم نہیں ہو سکتا ہے، اس فرق کی وجہ سے مختلف لوگوں کے معاش میں بھی فرق ضرور آتا ہے مگر دو انسانوں کے درمیان موجود اس فرق کا تناسب لا محدود نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام جس مساوات کو چاہتا ہے وہ یہ ہے معاشرہ کے تمام افراد کو یکساں مواقع حاصل ہوں اور مال و دولت کی کمی بیشی کے ساتھ ساتھ افراد معاشرہ کے معیارِ زندگی اور مظاہرِ معیشت میں زیادہ فرق نہ ہو۔ اسلام نے وہ تمام فرق جو محض عہدہ اور حیثیت کی بنا پر قائم کیے جاتے ہیں، ان کو مٹا دیا اور صرف نام نہاد مساوات کی جگہ حقیقی تمدنی مساوات اور معاشی انصاف قائم کیا ہے۔

اسلام مساوی معاشی حقوق کی بات کرتا ہے۔ اسلامی فقہ میں معاشی جدوجہد کو فرض عین اور پیداوار کو فروغ دینے کی کوشش کو فرض کفایہ قرار دیا ہے، اس لئے کہ معاش کی تکمیل ان کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسلام نے مثبت طور پر رزق کی جدوجہد کی ترغیب دی ہے اور اسے ہر مسلمان پر فرض کیا۔ اس جدوجہد کی خاطر اپنا قدم اپنے گھر سے باہر نکالنے والوں کو اس اصول سے متعارف کروایا گیا ہے کہ قدرت کی جن نعمتوں کو تیار کرنے یا کارآمد بنانے میں کسی کی محنت و قابلیت کا کوئی دخل نہ ہو وہ سب انسانوں کے لیے مباحِ عام ہیں۔ ہر شخص کو حق ہے کہ اپنی ضرورت بھر ان سے فائدہ لے۔

---

[1] سورۃ الملک: 15/67

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی فکر وفلسفہ ونظام عمل نے معاشرتی مساوات کے ذریعے سے معاشی عدم مساوات کے خاتمے کی کوشش کی ہے، جیسے نماز، روزہ، حج۔ زکاۃ اور جہاد کے اجور وثواب میں امیر اور غریب کو اکٹھا کر دیا تقوی، ذکر، فکر، عبادت وریاضت اور حصول علم کے درجات میں امیر وغریب کو اکٹھا کر دیا، فکر آخرت اوراتباع نبوی ﷺ میں امیر وغریب کو جمع کر دیا۔ اسی طرح سے وسائل پیداوار، اللہ کی نعمتوں اور اس کی عطا کردہ چیزوں سے مقامِ استفادہ پر بھی وہ سبھی کو کھڑا ہونے کا اور ان سے فائدہ اٹھانے کا برابر حق عطا کرتا ہے۔

4۔ حقِ معیشت میں مساوات کے قانون کی تنفیذ

تاریخ انسانی کے کسی بھی دور میں اگر کوئی آدمی رزق اور بنیادی ضروریات سے محروم ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وافر مقدار میں پائے جانے والے خدادادوسائلِ معیشت ورزق کی تقسیم کے نظام میں انصاف نہیں ہورہا۔ عام غربت افلاس کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں مگر ان میں سب سے بڑا سبب وسائلِ دولت اور اسبابِ معیشت کے تقسیم کنندگان کا ظالم، قارون صفت، حریص اور غاصب ہونا ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو محروم المعیشت اور کمزور لوگوں کا حق مارے بیٹھے ہیں۔ یہ چیز حرص ولالچ، ناانصافی اور استحصال معیشت کے میدان میں ''ام الخبائث'' یا ''ام الامراض'' ہے جو بیشمار خرابیوں کی بنیاد اور جڑ ہے۔

اعداد و شمار یہ بات ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ آج دنیا میں جتنی انسانی آبادی موجود ہے ان تمام کے لیے اس کرہ ارضی میں موجود وسائل ناکافی ہیں۔ بلکہ اللہ کریم نے جس انسان کو خلق کیا، اس کے رزق کا بھی وافر مقدار میں سامان کیا ہے۔ مگر آج انسان کی خواہشات اور ہوس اتنی بڑھ چکی ہے کہ وہ چاہے ایک سیر بھی نہ کھاسکے مگر اپنے پاس ایک من دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ آنکھوں کی ہوس کبھی پوری نہیں ہوسکتی۔ انسان کی خاطر اس دنیا میں رب العالمین نے تمام نعمتوں کو جاگزیں کیا اور پھر تمام انسانوں کو زمین کے ہر گوشے پر پہنچنے اور اللہ نے جو رزق رکھا ہے اس سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا ہے۔

اسلام کے نزدیک حصولِ معاش میں کوئی ناجائز رکاوٹ قانوناً جرم ہے۔ اسلام انسان کو معاشی جدوجہد کی آزادی فراہم کرنے کے ساتھ اس بات کو بھی یقینی بناتا ہے کہ انسان کو اچھی غذا ملے۔ وہ گندی غذا استعمال کرنے اور گلی سڑی چیزیں کھانے پر مجبور نہ ہوجائے، اسے طیب اور پاک صاف غذا ملنی چاہیے، یہ اس کا ایک بنیادی حق ہے۔ اس کے نزدیک لباس بھی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے اوراسلام کی رو سے انسان کی یہ فطری ضرورت لازماً پوری ہونی چاہیے۔ اسی طرح اسے مکان ملنا چاہیے اور حسب سہولت اس کے پاس خادم بھی ہونا چاہیے۔

لیکن اب سوال یہ کہ منشاء پروردگار کے مذکورہ عظیم مقصد کو کون پورا کرے اور اس کام کی تنفیذ وتکمیل اسلام میں کس کے ذمے لگائی گئی ہے؟ اسلام نے اس کام کی تکمیل کے لیے دو مرحلوں میں کام کیا ہے، پہلا مرحلہ یہ ہے کہ صاحبان ثروت ودولت

کو آمادہ و تیار کیا کہ وہ رضاکارانہ طور پر وسائلِ معیشت اور سہولیاتِ زندگی میں اپنے غریب اور لاچار بھائیوں کا خیال رکھیں اور اپنی ضرورت سے بچ جانے والے وسائل زندگی سے ان کو استفادہ کا موقع دیں، البتہ ایسا کرنا ان کے لیے اختیاری نہیں بلکہ واجب اور ضروری ہے۔ حضرت علی رضوان اللہ علیہ نے معاشرے میں پائے جانے والی غربت و افلاس اور محرومی کو اسی طبقے کی اپنی ذمہ داری سے غفلت سے تعبیر کیا ہے۔

آپ کا قول ہے کہ:

" ان الله تعالى فرض على الاغنياء فى اموالهم بقدر ما يكفى فقراءهم ، فان جاعوا او عروا و جهدوا فمنع الاغنياء ، و حق على الله تعالى ان يحاسبهم يوم القيامة و يعذبهم عليه "[1]

ترجمہ: بلاشبہ پروردگارِ عالم نے اہل ثروت پر ان کے مالوں میں اپنے معاشرے کے فقراء و مساکین کی معاشی حاجات کو بدرجہ کفایت پورا کرنا فرض قرار دیا ہے۔ چنانچہ یہ فقیر لوگ اگر بھوکے ننگے یا معاشی تنگی میں مبتلا ہوتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل ثروت نے ان کے حق یا ان کے حصے کے وسائل رزق کو روک لیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ یہ امر لازم ٹھہرا رکھا ہے کہ بروز قیامت وہ ان اہل ثروت کا محاسبہ فرمائے گا اور فقراء کی اس حق تلفی پر انہیں عذاب دے گا۔

اب جب پہلے مرحلے کی ذمہ داری والے افراد یعنی صاحبانِ ثروت و دولت اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے میں کوتاہی کا مظاہرہ کریں اور محتاجوں کے حق کو روک دیں تو پھر دوسرے مرحلے میں اس کارِ عظیم کی ذمہ داری نائب الہی، خلیفہ، حاکم یا امام پر عائد ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں اب یہ کام ان عہدوں پر فائض فرد یا افراد کا ہے کہ وہ ذمہ داری اٹھائیں کہ اسلامی ریاست میں ایک فرد بھی ایسا نہ ہو جو حقِ معیشت سے محروم رہے اور نہ ہی کسی کو یہ حق دیا جائے کہ وہ دوسروں کے معاشی حقوق میں رکاوٹ بن سکیں ۔ اور اگر کوئی بھی حکومت اس سلسلے میں اقدامات نہیں کرتی تو وہ فاسد نظام کی حامل اور نظامِ عدل سے منحرف حکومت ہے۔ جب کہ اس کے برعکس اسلامی ریاست یہ ذمے داری لیتی ہے کہ کوئی شخص بھوکا پیاسا نہ رہے اور یہ سوچنے پر مجبور نہ ہو جائے کہ اب اس کا کوئی پوچھنے والا نہیں رہا۔ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

"من ترك مالاً فلورثته و من ترك عيالا فإليَّ انا ولى من لا ولى له"[1]

---

[1] المحلی، ابن حزم، 4/283

ترجمہ: یعنی کوئی شخص اس حال میں دنیا سے جارہا ہے کہ اس نے مال چھوڑا ہے تو یہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔ لیکن اگر کوئی بال بچے چھوڑ کر جاتا ہے اور مال چھوڑ کر نہیں جاتا ہے تو اس کا ولی میں ہوں گا اور اس کی نگہ داشت میرے ذمے ہے۔

حضرت عمر ابن خطاب خلیفۃ الرسول ہونے کے حوالے سے خود پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ:

"لَوْ اسْتَقْبَلْتُ مِنْ أَمْرِي مَا اسْتَدْبَرْت لَأَخَذْت فُضُولَ أَمْوَالِ الْأَغْنِيَاءِ فَقَسَّمْتُهَا عَلَى فُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ"[2]

ترجمہ: جس بات کا اندازہ اب مجھے ہوا ہے اگر اس کا پہلے سے اندازہ ہو جاتا تو میں اس کام میں کبھی تاخیر نہ کرتا کہ ارباب دولت وثروت کی فاضل مال ودولت لے کر فقراء اور مہاجرین میں بانٹ دوں۔

انکے اس اس اقدام کی تائید حضرت اَبو سعید خدری سے نقل شدہ قول سے ہوتی ہے کہ نبی کریم اپنی سیرت طیبہ میں مختلف اَنواعِ مال اور ان پر عائد ہونے والے مالی حقوق کا ذکر فرماتے رہے یہاں تک کہ لوگوں نے یہ گمان کر لیا تھا کہ ہم میں سے کسی کو اپنے بچ جانے والے اور فالتو مال میں تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں۔[3] اس روایت کے حوالے سے صحابہ کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص بھوکا، ننگا یا ضروریات زندگی سے محروم ہے تو مالدار کے فاضل مال سے اس کی کفالت کرنا فرض ہے۔

اگر اس سلسلے میں نازل ہونے والی آیات قرآنی، وارد ہونے والی روایات اور فقہی مؤیدات کو سامنے رکھا جائے تو اسلامی معاشی نظام میں حقِ معیشت میں مساوات کے حوالے سے کی گئی قانونی و فقہی کاوشیں اور کوششیں بالکل عیاں اور روزِ روشن کی طرح واضح ہیں۔ اسلام نے حقِ معیشتپر ابتداءً آزادانہ قانون سازی کی ہے اور جن پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے، ان کو آگاہ کیا ہے۔ لیکن عمل درآمد نہ ہونے کی صورت میں خلیفہ، امام یا حاکم کے اختیارات میں وسعت دے کر اس اصول کی حفاظت کا کاملاً اہتمام فرمایا ہے جو خود اس مساوات کی اہمیت پر روشنی ڈالتا ہے۔

---

[1] مسند احمد، امام احمد ابن حنبل، 4/133

[2] المحلی، ابن حزم، 4/283

[3] المحلی، ابن حزم، 4/282

5۔درجات معیشت میں تفاوت

معاشیات میں مساوات انسانی فطرت کے برعکس ہے، وہ اس لیے کہ معاش کا تعلق پیٹ سے ہے اور پیٹ ہر ہر شخص کا برابر نہیں ہوتا، ہر ہر فرد کی بھوک الگ الگ ہے، ہر ہر فرد کی اکل و شرب میں پسند ناپسند الگ الگ ہے اور ہر ہر فرد کی جسامت، اسکے کام کی نوعیت اور ذہنی و جسمانی مشقت کے بعد جسم کے اکلی و شربی تقاضے مختلف ہیں۔ اس کے باوجود بھی اسلام نے معاشی نظام کو اس حد تک پابند کیا ہے کہ بنیادی ضروریات کے میدان میں معاشرے کے سب باشندوں کو برابر کے حقوق میسر ہوں۔ سب کم از کم پیٹ بھر کر سوئیں، بیماری کے عالم میں سب کو علاج کی کم از کم سہولیات ضرور میسر ہوں، بغیر کسی تفریق کے سب بچوں کو کم از کم بنیادی تعلیم کے مواقع حاصل ہوں وغیرہ۔

قرآن مجید اور اسلامی معاشی تعلیمات کے مطابق اگرچہ ہر شخص کو مساوی حقِ معیشت حاصل ہے مگر درجات معیشت میں مساوات کی بجائے فرق و تفاوت رکھا گیا ہے، یعنی اپنی قوت و صلاحیت کے مطابق حصول معاش کے لیے جدوجہد کا ہر شخص مساوی حق رکھتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اس جدوجہد کے نتائج و ثمرات میں بھی سب برابر اور مساوی ہوں۔ چنانچہ درجات معیشت کا یہ فرق و تفاوت بالکل فطری ہے۔ خدا کی اس کائنات میں، درجات معیشت ہی نہیں بلکہ اپنی کسی چیز میں بھی ایک انسان دوسرے انسان کے مساوی نہیں ہے۔ نہ قدو قامت میں سب برابر ہیں، نہ حسن و جمال میں سب یکساں ہیں، نہ جسمانی طاقت اور ذہنی قابلیت میں سب مساوی ہیں۔ اور نہ ہی فکر و خیال اور اخلاق میں ہم پلہ ہیں۔

دراصل یہ خدائی تقسیم ہے، جس میں قادر مطلق کی بے پایاں مصلحت و حکمت کار فرما ہے۔ جس طرح خدا کی یہ نعمتیں تمام انسانوں کو یکساں عطا نہیں ہتیں اسی طرح رزق میں بھی انسان اور انسان کے مابین تفریق رکھی گئی ہے۔ کیوں کہ ایسا نظم کو کائنات کو صحیح اور درست رکھنے کے لیے خدا نے کیا ہے۔ نظمِ کائنات کی صحت و بقاء کا تقاضہ ہے کہ اس میں امیر اور دولت مند بھی رہیں اور غریب اور ضرورت مند بھی پائے جائیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ﴾[1]

---

[1] سورۃ النحل:16/71

ترجمہ: اور دیکھو، اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت عطا کی ہے پھر جن لوگوں کو یہ فضیلت دی گئی ہے وہ ایسے نہیں ہیں کہ اپنا رزق اپنے غلاموں کی طرف پھیر دیا کرتے ہوں تا کہ دونوں اس رزق میں برابر کے حصہ دار بن جائیں تو کیا اللہ ہی کا احسان ماننے سے اِن لوگوں کو انکار ہے؟

یہ آیات خالق کائنات کی اس گوناگوں حکمت و مصلحت کی طرف اشارہ کر رہی ہیں جو درجاتِ معیشت یعنی رزق کی کمی وبیشی میں مضمر ہیں۔ مولانا امین احسن اصلاحی وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ کے ضمن میں موجود حکمت پر لکھتے ہیں: "یہ دنیا اللہ تعالی نے آزمائش کے لیے بنائی ہے اس وجہ سے اس کا نظام اس نے اس طرح رکھا ہے کہ اس میں ہر شخص دوسرے کا محتاج بھی ہے اور محتاج الیہ بھی۔ بڑے سے بڑا بادشاہ بھی دوسروں کا محتاج ہے اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی بھی اس میں محتاج الیہ ہے۔ یہاں کوئی بھی شخص دوسرے سے مستغنی نہیں اور کوئی بھی ایسا نہیں کہ معاشر میں کسی نہ کسی پہلو سے اس کی افادیت نہ ہو۔ دنیا کو درجات و مراتب کے اس فرق کے ساتھ پیدا کر کے اللہ تعالی یہ امتحان کر رہا ہے کہ جو لوگ اعلی صلاحیتوں اور بہترین وسائل کے امین بنائے گئے ہیں وہ اپنے وسائل اور صلاحیتیں کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ ان لوگون کو بھی دیکھ رہا ہے کہ جو فروتر اور کم تر وسائل کے ساتھ پیدا ہوئے ہین کہ وہ اپنے اپنے دائرہ کار میں اپنے فرائض کو پہچاننے والے اور اپنے خالق سے ڈرنے والے، اپنی خودی اور اپنی خودداری کی حفاظت کرنے والے ہیں یا اپنے فرائض چھوڑ کر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ وہ ان سب لوگوں کو اپنے زیرِ اثر کر لیں جو ان پر حاکم اور افسر بنے ہوئے ہیں"۔[1]

یوں قرآن مجید حقِ معیشت میں برابری اور مساوات کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ درجات معیشت میں بھی مساوات اور برابری ہو۔ بلکہ اس کی بجائے اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ دولت کی مساوی تقسیم کی بجائے منصفانہ تقسیم ہونی چاہیے۔

گویا رزق میں تفاوتِ درجات کی مصلحت آزمائش اور امتحان کی خاطر بھی ہے، خلاقِ عالم ایک جانب مالداروں کو عزت و مال سے نواز کر ان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی ثروت کو فقط اپنی ذاتی ملکیت سمجھنے کی بجائے یہ نظریہ رکھیں کہ وہ جس قدر زیادہ کمائے گا اسی قدر اس کی دولت پر اجتماعی حقوق زیادہ عائد ہوں گے، لہذا وہ صرف اپنے لیے نہیں کماتا بلکہ معاشروں کے دوسرے لوگوں کے لیے بھی کماتا ہے، کیونکہ یہاں دولت و ثروت کا مقصد صرف ذاتی نفع نہیں بلکہ انفرادی اور ذاتی ضروریات کے ساتھ ساتھ اجتماعی ضروریات و حاجات کی تکمیل بھی ہے۔ دوسری جانب وہ حاجت مند اور ضرورت مند افراد سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ متمول افراد کے ثروت و مال کو دیکھ کر خدا کے ساتھ کفران یا ناشکری و شکوے کا رویہ نہ اپنائیں، اور نہ ہی ان افراد کی نسبت اپنے دل

---

[1] تدبر قرآن، مولانا امین احسن اصلاحی، تاج کمپنی، دہلی، طبع 1979ء، 7/266

میں بغض و حسد کو جگہ دیں بلکہ اور شکرِ پروردگار کے ساتھ ساتھ اپنی عملی جدوجہد میں بڑھ کر اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق ان تمام حقوقِ معیشت سے متمتع ہو اور غنا و دولت حاصل کرے کہ جس کو تمام مخلوقِ خدا کے لیے عام اور مساوی کر دیا گیا ہے۔[1]

اسلام معیشت میں تفاوتِ درجات کا تو قائل ہے لیکن اس کی نظر میں اس معاشی فرق کے لیے بھی ایسے نکتہ اعتدال پر قائم ہونا ضروری ہے جہاں یہ تفاورت افراد معاشرہ کے اندر ظلم و استحصال کی وجہ نہ بن جائے، یعنی سادہ الفاظ میں یوں کہا جائے کہ معاشرے میں تفاوتِ درجات تو ہو لیکن نہ ایسا کہ معیشت انسانوں کو دو طبقوں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ ایک کی ترقی و خوشحالی دوسرے کے فقر و افلاس کی وجہ بن جائے اور نہ ہی افراد کو ایک گروہ کسی دوسرے گروہ کے معاشی اغراض کا آلہ کار بن جائے۔

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی، ص 51

فصل پنجم

اسلامی بیت المال اور امدادِ باہمی کا اصول

اسلامی بیت المال، مختصر تعارف اور تاریخ

لغوی اعتبار سے ہر اس گھر کو بیت المال کہا جاتا ہے جو کسی قسم کے مال کی حفاظت کے لئے تیار کیا جائے لیکن اصطلاحی طور پر اس سے مراد وہ ادارہ ہے جو مسلمانوں سے ان کی اجتماعی اموال وصول کر کے ان کے اجتماعی کاموں پر صرف کرنے کا ذمہ دار ہو۔ منیر حسن عدوان بیت المال کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ:

"بیت المال هو المؤسسة التي تُشرف على ما يَرِدُ من الأموال وما يخرج منها في أوجه النفقات المختلفة؛ لتكون تحت يد الخليفة أو الوالي، يضعها فيما أمر الله به أن تُوضع بما يُصلح شئون الأمة في السلم والحرب"[1]

ترجمہ: بیت المال ایک ایسا ادارہ ہے کہ جس میں مختلف انواع سے مال کی مقدار جمع ہوتی ہے اور پھر متعدد نفقات میں خرچ کی جاتی ہے البتہ یہ سب کچھ خلیفۃ المسلمین یا والی مسلمین کی زیر نگرانی انجام پاتا ہے وہ حالات امن وجنگ میں اللہ کے دیے گئے حکم کے مطابق اس کے استعمال کو یقینی بناتے ہیں۔

بیت المال دراصل ایک ایسا ادارہ ہے کہ جس میں مسلمانوں کے عمومی ملکیت والے اموال رکھے جاتے ہیں اور پھر انہیں مسلم کمیونٹی کے مفاد عامہ میں ہی خرچ کیا جاتا ہے، علامہ ماوردی بیت المال کے ادارے میں پائے جانے والی ضروری خصوصیات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"وأما اختصاصات بيت المال فكل مالٍ استحقَّه المسلمون، ولم يتعيَّن مالكه منهم فهومن حقوق بيت المال، وكلُّ حقٍ وجب صرفه في مصالح المسلمين فهو حقٌّ على بيت المال"[2]

ترجمہ: ہر وہ مال کہ جس کے مستحق مسلمان ہوں لیکن ان میں سے کوئی بطور خاص مالک نہ ہو، بیت المال کا حق ہے (اور اس میں جمع ہوگا) اور ہر ایسا حق جس کا مصالح مسلمین میں استعمال ہونا چاہیے وہاں بیت المال کی ذمہ داری ہے کہ اس کا اجراء کیا جائے۔

---

[1] مؤسسۃ بیت المال في صدر الاسلام، منیر حسن عبد القادر عدوان، مکتبۃ الجامعۃ الاردنیۃ 2014ء، ص 47

[2] الاحکام السلطانیۃ، ابو الحسن علي بن محمد الماوردي، دار الحدیث، قاہرۃ، سال اشاعت ندارد، ص 278

بیت المال کو اسلام کے ابتدائی دور میں بیت مال المسلمین یا بیت مال اللہ کہا جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس پر بیت المال کا اطلاق ہونے لگا۔ آنحضرت کے زمانے سے اس پر باضابطہ عمل ہوتا تھا۔ آپؐ اس مقصد کے لیے مختلف علاقوں اور منطقوں کے امراء اور عمال مقرر فرماتے تھے اور پھر ان پر یہ ذمی داری عائد فرماتے کہ وہ اس علاقے سے تمام مالی واجبات جیسا کہ زکاۃ، صدقات ، خمس، جزیہ اور خراج وغیرہ کو وصول کر کے آپؐ کی خدمت میں پیش کریں تاکہ اس مال کو اس کے لیے معین شدہ مصرف میں استعمال کیا جاسکے۔ جیسا کہ آپؐ نے حضرت معاذ بن جبل کو عمال سے صدقات وغیرہ کی وصول کرنے کی غرض سے یمن روانہ فرمایا تھا اور حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو جزیہ کی رقم وصول کرنے کے لیے بحرین کی طرف روانہ فرمایا تھا[1]۔ البتہ دور نبوی میں اس مقصد کے لیے کوئی باقاعدہ عمارت یا مکان نہیں تھا، کیونکہ زکوٰۃ، عشر اور خراج کی جو بھی رقم آتی تھی، وہ فوراً تقسیم کر دی جاتی تھی، جمع اور محفوظ رکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی تھی۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دور میں جزوی طور پر کتب تاریخ میں بیت المال کے قیام کا ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے اپنا وزیر خزانہ حضرت أبو عبیدہ کو بنایا تھا جو بیت المال کی کل آمدنی اور اس کے تمام اخراجات کا پورا حساب رکھتے تھے[2]۔ اس زمانے میں بھی بیت المال المسلمین کو کوئی باقاعدہ عمارت موجود نہ تھی بلکہ "سخ" کے مقام پر کہ جہاں آپ کی رہائش تھی اسی گھر میں ایک مکان اس مقصد کے لیے استعمال میں لایا جاتا تھا۔ لیکن جو کچھ بیت المال میں آتا آپ اس کو تقسیم فرمادیتے تھے اور اس میں کچھ باقی نہ بچتا تھا یہی وجہ ہے کہ ابن سعد کی بعض روایتوں کے مطابق وہ ہمیشہ بند پڑا رہتا تھا۔[3]

خلافتِ ثانیہ میں جن اولیات کی بنیاد رکھی ان میں بیت المال کی غرض سے عمارت کی تعمیر بھی تھی، انہوں نے بعنوان بیت المال ایک عمارت کی بنیاد رکھی اور مدینہ منورہ میں اسلامی خزانہ قائم کیا[4]۔ اس کے موارد و مصارف کے لئے ایک محکمہ تشکیل دیا اور اس کے لیے باقاعدہ افسر اور دوسرے عملہ مقرر کیے ۔ مرکز کے علاوہ اہم مقامات میں بھی بیت المال قائم کیے گئے۔ اس زمانے میں چونکہ ہر طرف سے شہروں پر شہر فتح کیے جا رہے تھے اور ہر طرف سے دولت کے انبار مدینہ منورہ آرہے تھے لہذا ان حالات میں ضروری تھا کہ اس حوالے سے نہ فقط مدینہ منورہ میں بلکہ ہر صوبے اور ڈویژن میں بیت المال کا ادارہ قائم ہو۔ اس مقصد

---

[1] کتاب الأموال، ابوعُبید قاسم بن سلام الهروی،، دارالفکر، بیروت، سن طباعت ندارد، ص41

[2] الطبقات الکبری، ابوعبداللہ محمد ابن سعد، دار صادر، بیروت، طبع اول 1968ء، 3/136

[3] ایضاً

[4] الکامل فی التاریخ، عزالدین ابن اثیر، دار الکتاب العربي، بیروت، لبنان، طبع اول 1997، ص2/290

کے لیے حضرت عمر فاروق نے 20ھ میں "دیوان" کا ایک محکمہ بھی تشکیل دیا جس کے تحت لوگوں کی فہرستیں تیار کی گئی اور باقاعدہ ریکارڈ مرتب کیا گیا تا کہ بیت المال سب لوگوں کے لیے باقاعدہ طور منظم اور فعال کردار ادا کر سکے[1]۔ آپ نے مدینہ کے بیت المال کو مرکزی بیت المال قرار دیا۔ اور مقامی و ضلعی بیت المالوں کو حکم جاری کیا کہ رقوم کو ان کے مقامی مصارف میں صرف کر کے جو کچھ بچے وہ مرکز میں منتقل کیا جائے۔

بیت المال المسلمین کے حوالے سے حضرت عمر کی سوچ بچت اور ذخیرہ اندوزی کی سوچ ہر گز نہ تھی بلکہ آپ اولین فرصت میں ہی بیت المال میں جمع ہونے والی رقوم اور اشیاء کو ان کے مستحقین تک پہنچانے کا اہتمام فرماتے۔ چنانچہ ابن جوزی کے مطابق:

"كان يأمر بكسح بيت المال مرة في السنة"[2]

ترجمہ: آپ سال میں ایک بار بیت المال کی مکمل صفائی (یعنی تقسیم) کا حکم فرماتے تھے۔

ایسا صرف حضرت عمر فاروق کے دور ہی میں نہیں ہوا بلکہ تمام خلفاء راشدین بیت المال کے محکمے میں خاص دلچسپی لیتے اور اس میں ذرہ برابر غفلت نہ برتی جاتی۔ حضرت علی ابن ابی طالب اس خوف سے کہ بیت المال کے مال و دولت خلیفہ اور اس کی عوام میں اختلاف یا فتنے کا سبب نہ بن جائیں، ہر شب جمعہ کو بیت المال کا تمام خزانہ مسلمانوں میں تقسیم کر دیتے یہاں تک کہ بیت المال میں کچھ نہ بچتا[3] ایک مرتبہ جب آپ نے بیت المال کے اندر سونا اور چاندی کی اشیاء کو آب و تاب میں دیکھا تو ارشاد فرمایا:

((يا صفراء اصفري، ويا بيضاء ابيضي، وغُرِّي غيري، لا حاجة لي فيك))[4]

ترجمہ: اے سونا و چاندی تم بے شک چمکو پر مجھے تمہاری ضرورت نہیں، تم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتے بلکہ میرے غیر کو جا کے دھوکے میں گرفتار کرو۔

---

[1] تاریخ الرسل والملوک (المعروف بہ تاریخ الطبري)، محمد ابن جریر الطبری، 2/519

[2] مناقب أمیر المؤمنین عمر بن الخطاب، عبد الرحمن بن علي ابو الفرج الجوزی، دار ابن خلدون، طبع 1996ء، ص79

[3] الاستقصا لأخبار دول المغرب الأقصی، احمد بن خالد الناصری، دار الکتاب، الدار البیضاء، سن طبع ندارد، 1/112

[4] تاریخ ابن الوردی، عمر بن مظفر ابن الوردی، دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول 1417ھ، 1/157

بیت المال کے ذرائع آمدن

بیت المال، ریاستِ اسلامی میں بسنے والے تمام مسلمانوں کے لیے مشترکہ ملکیت ہے۔ جس کی آمدن کے متعدد ذرائع ہیں، جن کا مختصر تذکرہ حسبِ ذیل ہے۔

1- زکاۃ اور اسکی تمام اقسام، جسے امام وصول کریگا، خواہ اموالِ ظاہرہ کی زکاۃ ہو یا اموال باطنہ، جیسے چرنے والے جانور، زرعی پیداوار، نقدی، سامان تجارت۔

2- مالِ غنیمت میں سے اس مال کا خمس جو قابل انتقال ہو، اور غنیمت سے مراد اراضی، جائیداد کے علاوہ ہر وہ مال ہے جو قتال کے ذریعہ کفار سے حاصل ہو، چنانچہ ایسے مال کا خمس بیت المال میں
داخل کیا جائے گا، تاکہ اسے غنیمت کے مصارف میں تقسیم کیا جاسکے۔

3- زمین سے نکلنے والی معدنیات سونا، چاندی، اور لوہا وغیرہ کا پانچواں حصہ [1]۔ اور ایک قول کے مطابق سمندر سے نکلنے والے موتی، عنبر وغیرہ میں بھی اسی طرح پانچواں حصہ لازم ہوگا۔ [2]

4- رکاز [مدفون خزانہ] کا پانچواں حصہ، رکاز سے ہر وہ مال مراد ہے جسے کسی انسان نے زمین میں دفن کر دیا ہو، یہاں اس سے مراد اہل جاہلیت اور کفار کے وہ خزانے ہیں جو کسی مسلمان کو ملیں، تو اس کا خمس بیت المال کو دیا جائے گا، اور خمس نکالنے کے بعد باقی حصہ جس شخص کو یہ خزانہ ملا ہے اسی کا ہوگا۔

5- مالِ فئ: ہر وہ منقولہ مال ہے جو قتال اور گھوڑے یا پیادہ سپاہیوں کو دوڑائے بغیر کفار سے حاصل ہوا ہو۔ [3]

6- بیت المال کی اراضی اور اس کی املاک کی پیداوار، اور تجارتی و اقتصادی منافع جات۔

7- ہدایا، تحائف، صدقات، اور وصایا جو جہاد یا دیگر مفادِ عامہ کی خاطر بیت المال کو پیش کیے جائیں۔ [4]

8- وہ تحفے تحائف جو ایسے قاضیوں کے پیش کئے گئے ہوں جنہیں منصب قضا پر آنے سے پہلے ان لوگوں سے تحائف نہ پیش کئے جاتے ہوں، یا اس منصب سے پہلے پیش تو کئے جاتے ہوں، لیکن ہدیہ پیش کرنے والے کا کوئی مقدمہ اس قاضی کے پاس

---

[1] ردالمحتار علی الدر المختار (حاشیہ ابن عابدین)، محمد امین بن عمر ابن عابدین، دار الفکر، بیروت، طبع ثانی1992ء، 43/2

[2] الخراج، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم، مکتبۃ الازہریۃ للتراث، سال طبع ندارد، ص:70

[3] الاحکام السلطانیہ للفراء، قاضی ابویعلی محمد بن الحسین الفراء، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، طبع ثانیہ2000، ص:235

[4] المغنی، ابن قدامہ، 507/8

زیرِ سماعت ہو، ایسے ہدایا اگر ہدیہ دینے والے کو واپس نہ کئے گئے تو بیت المال واپس جائیں گے [1]۔ کیونکہ پیغمبر اسلام نے "ابن التبیہ" کو دیا گیا ہدیہ واپس لے لیا تھا۔[2]

اسی طرح وہ ہدایا جو اہل حرب کی جانب سے حکمران کو پیش کئے جائیں، نیز وہ ہدایا جو حکومت کے کارندوں اور گورنروں کو پیش کئے جائیں۔[3]

9- ایسے ٹیکس جو رعایا پر انکی مصلحت کیلئے فرض کیے گئے ہوں، خواہ جہاد کیلئے ہوں یا کسی اور مقصد کیلئے، لیکن ایسا ٹیکس لوگوں پر اسی وقت لگایا جائے گا جب بیت المال سے ضرورت پوری نہ ہو رہی ہو، اور ضروری کام رہ جاتے ہوں، بصورتِ دیگر یہ آمدنی غیر شرعی ہو گی۔[4]

10- لاوارث اموال: یہ ہر وہ مال ہے جس کا مالک نامعلوم ہو، مثلاً: گرا پڑا سامان، ودیعت، رہن، اسی قسم میں وہ اموال بھی ہیں جو چوروں وغیرہ کے پاس سے نکلیں، اور ان کا کوئی دعویدار نہ ہو، ایسے اموال کو بیت المال میں داخل کر دیا جائے گا۔[5]

11- ایسے مسلمان کا ترکہ جو فوت ہو جائے، اور اسکا کوئی وارث نہ ہو، یا اسکا وارث تو ہو لیکن وہ پورے مال کا وارث نہ بنتا ہو-یہ ان اہل علم کے نزدیک ہے جو بقیہ مال وارث کو ہی لوٹانے کے قائل نہیں ہیں۔اسی طرح وہ مقتول جس کا وارث نہ ہو، یہ دیت فئ کے مصارف میں استعمال ہو گی۔

اس قسم میں بیت المال کا حق شافعی اور مالکی فقہاء کے ہاں بطور میراث ہے، یعنی بیت المال عصبہ بنتا ہے، حنفی اور حنبلی فقہاء کے ہاں ایسے مال کو بیت المال میں بطورِ فئ داخل کیا جائے گا، بطور میراث نہیں۔[6]

12- تاوان، چالان اور جرمانے کے طور پر ضبط کردہ مال، جیسا کہ زکاۃ نہ دینے والے سے اس کے مال کا ایک حصہ بطورِ تاوان لینا حدیث میں منقول ہے، اسحاق بن راہویہ، اور ابو بکر عبد العزیز اسی کے قائل ہیں۔[7]

---

[1] روضة الطالبين وعمدة المفتين، محي الدين النووي، 11/93

[2] صحیح بخاری، امام بخاری، حدیث رقم 6979، کتاب الحیل، باب احتیال العامل لیہدی لہ، 9/28

[3] الدر المختار شرح تنویر الأبصار وجامع البحار، محمد بن علي بن محمد المعروف بعلاء الدين، دار الكتب العلمية، طبع اول 2002ء، 3/280

[4] الاحکام السلطانیہ، قاضی ابو یعلی، ص:230

[5] روضة الطالبين وعمدة المفتين، محي الدين يحيى بن شرف النووي، 5/279

[6] فتح القدیر، کمال الدین محمد بن عبد الواحد المعروف بابن الہمام، دار الفکر، سال طبع ندارد، 5/277

[7] المغنی، ابن قدامہ، 2/573

اس قسم کے تاوان کا مصرف مصالح عامہ ہے۔ اور اس طرح یہ مال بیت المال کا حق قرار پائے گا۔ منقول ہے کہ حضرت عمر نے کچھ گورنروں سے ان کے مال کا نصف یہ دیکھ کر ضبط کر لیا تھا کہ ان کی گورنری کے سبب ان کے ہاں خوشحالی آگئی تھی[1]۔ پس اس طرح کے اموال بھی بیت المال میں داخل کئے جائیں گے۔

بیت المال کے مصارف

بیت المال میں آنے والے اموال مختلف اور متعدد مصارف کے لیے ہوتے ہیں اور ایک مصرف کی چیزیں دوسرے مصرف میں استعمال نہیں ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر امام اَبو یوسف کہتے ہیں کہ زکاۃ کے واجبات کو خراج کے مال سے الگ کرنا ضروری ہے اسی طرح سے صدقہ اور عشور کی مد میں آنے والے اموال کو خراج کے مال کے ساتھ جمع نہ ہونے دیا جائے اس لیے کہ خراج والا مال تمام مسلمانوں کے لیے "فیٔ" ہے جب کہ صدقات کو تمام مسلمانوں پر نہیں بلکہ صرف انہی موارد میں استعمال کیا جاسکتا ہے جن کا کتاب اللہ میں صریحاً تذکرہ موجود ہے۔[2] لہذا اس بنا پر ضروری ہے کہ بیت المال میں آنے والے اموال کو ان کے مصارف کے اعتبار سے مختلف فصول اور قسموں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ ان میں آسانی سے تصرف کیا جاسکے۔

اسلامی فقہ میں تصریح کی گئی ہے کہ بیت المال کے محاصل، چار مختلف شعبوں پر تقسیم ہوتے ہیں، اور ان چاروں شعبوں کے لیے الگ الگ اور جدا جدا بیوت قائم کے جائیں، حاکم کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی ایک شعبے سے قرض لے کر دوسرے شعبے کے مصارف میں خرچ کرے اور بعد میں وہ مقدار مقررہ شعبے کو لوٹانا واجب ہو گی مگر یہ کہ ان میں سے جس شعبے یا بیت سے مال اٹھایا گیا ہے اس کا استعمال دوسرے شعبے میں بھی جائز ہو[3]۔ بیت المال کے محاصل کو جن چاروں بیوت میں تقسیم کیا جاتا ہے وہ چاروں مرکزی بیت المال کے ماتحت ہی کام کریں گے۔

بیت المال میں قائم کیے جانے والے چار شعبے یا بیوت حسبِ ذیل ہیں۔

---

[1] فتوح مصر والمغرب، عبد الرحمن بن عبد اللہ بن عبد الحکم، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، سال طبع 1415ھ، ص:148

[2] الخراج، ابو یوسف، ص:80

[3] الدر المختار، علاؤ الدین، 2/58

(i) زکاۃ کا شعبہ

بیت المال کا یہ شعبہ، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، مالِ زکاۃ، عشر کے مال اور مسلمان تُجار سے وصول کیے گئے عشور کے متعلق ہے۔ اور اس شعبے کے مصارف وہ "مصارف ثمانیہ" یا آٹھ مصارف ہیں جن کا تذکرہ زکاۃ کے ضمن میں گزر گیا ہے۔ کتاب اللہ میں ہے:

﴿انمَّا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِّنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾[1]

ترجمہ: صدقات (یعنی زکوٰۃ وخیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنان صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور خدا کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیئے یہ حقوق) خدا کی طرف سے مقرر کر دیئے گئے ہیں اور خدا جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔

علامہ ماوردی نے اس بابت ایک اختلاف کا ذکر کیا ہے کہ آیا یہ مال صرف بیت المال میں جمع کرانا ہی ضروری ہے یا کہ اس کو اپنے طور پر مصارف میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اس حوالے سے حنفیہ قائل ہیں کہ مال زکاۃ، مالِ فیٔ کے جیسا ہے، یعنی یہ بیت المال کے حقوق میں سے ہے اور بیت المال ہی کو ادا کرنا واجب ہے۔ پھر بیت المال میں آنے کے بعد ہی اس کو مصارف ثمانیہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جب کہ امام شافعی کی رائے کے مطابق اگر مصارف ثمانیہ والے لوگ میسر آجائیں تو ان کو یہ مال ادا کر دیا جائے، لیکن ان کے میسر نہ آنے کی صورت میں ضروری ہے کہ ان اموال کو بیت المال میں پہنچایا جائے اور بیت المال ان اموال کے لیے درحقیقت ایک حرز اور امان گاہ کی طرح ہے کہ جس میں یہ مال اپنے حقداروں کے لیے امانت کے طور پر رکھے جاتے ہیں۔[2]

(ii) خمس کا شعبہ

بیت المال کا یہ شعبہ رکاز، کنز اور مال غنیمت سے متعلق ہے۔ امام شافعی کے مطابق مال فیٔ بھی اسی شعبے میں شامل ہے ،جب کہ حنفیہ اور مالکیہ مذہب کے مطابق فیٔ کا مال بیت المال کے خمس کے شعبے میں شامل نہیں ہے۔

---

[1] سورۃ التوبہ:9/60

[2] الاحکام السلطانیہ، الماوردی، ص214

اس شعبے کا مصرف پانچ حصے ہیں جن کا تذکرہ مالِ غنیمت کے خمس والی آیت میں ہو ہے۔ ان میں سے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے۔ ایک حصہ ذوی القربی کا جب کہ ایک ایک حصہ یتیموں، مسکینوں اور مسافروں میں سے ہر ایک کے لیے ایک ایک حصہ ہے۔[1] ان میں سے پہلا حصہ رسول اللہؐ اپنی زندگی میں خود وصول کیا کرتے تھے، جب کہ ان کے بعد امام یا خلیفہ کی رائے کے مطابق مصالحِ مسلمین میں استعمال ہو گا۔ پس اس کو بیت المال کے اس شعبے میں شامل کر دیا جائے گا جس میں فئ کا مال شامل ہوتا ہے۔ باقی چاروں حصے بیت المال میں داخل کروائے جائیں گے تا کہ ان کے مستحقین میں ان کو تقسیم کر دیا جائے۔ امام یا حاکم کو ان کے بارے یہ اختیار نہیں کہ انہیں عمومی مصالح میں استعمال کرے بلکہ ضروری ہے کہ یہ چاروں حصے انہی کے لیے مختص مستحقین کو ادا کیے جائیں[2]۔

(iii) اموالِ فاضلہ یا ضوائع کا شعبہ

لوگوں کا گرا پڑا مال بیت المال کے اس شعبے میں جمع ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مال مسروقہ کا مالک اگر نہ ملتا تو اسے بھی اس کھاتہ میں رکھا جائے گا۔ پس اس طرح کے اموال اس نیت سے اس شعبے میں رکھے جائیں گے کہ ان کے مالک اگر مل جائیں تو ان کا مال ان تک پہنچا دیا جائے۔ جب ان کے مالک کو ڈھونڈنے میں مایوسی ہو جائے اور بظاہر ان کا ملنا ممکن نہ رہے تو پھر اس مال کو اس شعبے کے مصارف میں استعمال کیا جائے گا۔

اس شعبے کے اموال کو، ابن عابدین کے مطابق، مریضوں کے علاج اور ان کی دواؤں وغیرہ پر خرچ کیا جائے بشرطیکہ وہ فقیر ہوں۔ نیز ان کے مُردوں کے کفن میں جن کے پاس مال نہ ہو اور لاوارث فقیر بچوں میں جو کہیں پڑے ہوئے ملیں اور ان کی خطا کے جرمانے میں اور جو شخص کسب سے عاجز ہو اس کے کھانے پہننے وغیرہ میں اور اسی قسم کے دیگر کاموں میں صرف کرے خلاصہ یہ کہ اس کو ان محتاجوں پر خرچ کیا جائے کہ جن کا کوئی والی وارث یا سرپرست نہ ہو۔[3]

سوم خراج وجزیہ اور وہ مال جو عاشر ذمی کافروں اور مستامن حربیوں کے تاجروں سے لیتا ہے اس مال کو مسلمانوں کی مصلحتوں میں خرچ کیا جائے یعنی لڑنے والوں کے عطیات دینے، حدود ملک کی حفاظت، قلعوں کے بنانے اور ملک کے راستوں کی حفاظتی چوکیاں قائم کرنے، پل وغیرہ بنانے اور درست کرانے، بڑی نہروں کو کھودنے، مسافر خانے، مسجدیں بنانے دریائوں کا پانی

---

[1] اس کی تفصیل خمس کے ذیل میں گزر چکی ہے

[2] الاحکام السلطانیۃ، ابو یعلی، ص:235

[3] حاشیہ ابن عابدین، ابن عابدین، 2/60

روکنے کے لئے بند بنانے میں خرچ کیا جائے، قاضیوں، مفتیوں، محتسبوں، معلموں اور طالبعلموں کا روزینہ بھی اس میں سے دیا جائے۔

(iv) خراج اور فئ کا شعبہ

بیت المال کا چوتھا شعبہ جزیہ، خراج اور فئ کا شعبہ ہے۔نہ صرف بیت المال بلکہ اسلامی اقتصادی نظام میں بھی اس شعبہ کو بہت اہمیت حاصل ہے۔اس شعبہ کی متعدد اور گوناں گوں جہات ہیں۔شریعت اسلامی میں مالِ فئ کا اطلاق درج ذیل نو چیزوں پر ہوتا ہے۔

1. وہ اراضی وجائیداد جنہیں مسلمانوں کے خوف سے کافر چھوڑ کر چلے جائیں، یہ اراضی وجائیداد وقف ہونگی، جس طرح قتال کے ذریعہ غنیمت میں حاصل اراضی وقف ہوتی ہیں، اور ان سے حاصل شدہ پیداوار ہر سال تقسیم کی جائے گی،شافعی فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے،اور اس کی تقسیم میں اختلاف ہے۔

2. وہ منقولہ اشیاء جو کفار چھوڑ کر چلے جائیں،ان اشیاء کو فوراً تقسیم کر دیا جائے گا وقف نہیں کیا جائے گا۔

3. کفار سے حاصل کیا گیا خراج، یا ان کی ایسی اراضی کی اجرت جنہیں مسلمانوں نے حاصل کیا، اور انہیں کرایہ پر کسی مسلمان یا ذمی کو دیا ہو، یا اہل ذمہ کی ان اراضی کی اجرت جنہیں ان کے قبضہ میں برقرار رکھا گیا ہو، خواہ صلح کے طور پر اس اجرت پر اتفاق ہو یا بزورِ طاقت ان پر قبضہ کرنے کے بعد انہیں ذمی مالکان کو دے دیا گیا ہو کہ وہ ہمیں خراج ادا کریں گے۔

4. جزیہ : لغت میں جزیہ کا معنی کسی چیز کا بدلہ ہے۔[1] فقہی ابواب میں جزیہ سے مراد ایسا مال ہے جو کفار مسلمانوں کے ملک میں رہائش کی وجہ سے کفار ادا کرتے ہیں، چنانچہ ہر بالغ اور قدرت رکھنے والے ذمی مرد پر ایک متعین مقدارِ مال بطورِ جزیہ واجب ہوتی ہے، یا مجموعی طور پر پورے شہر پر لازم کر دیا جاتا ہے کہ ایک متعین مقدار میں جزیہ ادا کیا جائے، اگر ایسا شخص جزیہ ادا کرے، جس پر جزیہ واجب ہی نہ ہو تو اس کی حیثیت جزیہ کی نہیں بلکہ تحفہ کی ہو گی۔[2]

5. اہل ذمہ کے عُشر: یہ وہ ٹیکس ہے جو ذمی سے ان کے ایسے اموال پر لیا جاتا ہے جن کو وہ تجارت کیلئے دار الحرب (کفار کے وہ ملک جن سے امن وامان کا کوئی معاہدہ نہ ہو) لے جاتے ہیں، یا دار الحرب سے دار الاسلام لاتے ہیں، یا دار الاسلام میں مختلف شہروں میں منتقل کرتے ہیں، اہل ذمہ سے عام حالات میں یہ ٹیکس سالانہ بنیاد پر وصول ہوتا ہے تاہم اگر وہ دارالاسلام چھوڑ

---

[1] تہذیب اللغۃ، الازہری، 101/11

[2] المغنی، ابن قدامہ، 507/8

دیں پھر واپس لوٹ آئیں تو یہ ٹیکس دوبارہ دینا ہوگا۔ اسی طرح یہ عُشر اُن حربی تاجروں سے بھی وصول ہوتا ہے جو امان لے کر سامانِ تجارت مسلمان ملک میں لائیں۔[1]

6. وہ مال جو حربی صلح کی رو سے مسلمانوں کو ادا کریں۔

7. مرتد[2] کا مال: اگر اسے قتل کر دیا جائے، یا وہ مر جائے، اور زندیق کا مال اگر اسے قتل کر دیا جائے، یا وہ مر جائے، ان دونوں کا مال وراثت میں تقسیم نہیں ہوگا، بلکہ وہ فئ ہوگا۔

8. ذمی کا مال: اگر کوئی ذمی مر جائے، اور اس کا کوئی وارث نہ ہو، یا وارث ہو تو اس کے وارث کے حصہ سے جو بچ جائے وہ بھی فئ ہے۔[3]

9. قتال کے ذریعہ غنیمت میں حاصل ہونے والی اراضی، ان سے مراد زرعی اراضی ہیں، اسے بیت المال میں شامل کیا جائے گا اُن حضرات کے مطابق جو ان کو غنیمت حاصل کرنے والے مجاہدین میں تقسیم کرنے کے قائل نہیں ہیں۔[4]

مذکورہ بالا وہ موارد ہیں جو شریعت کی رو سے فئ کے موارد ہیں۔ البتہ ان موارد کے علاوہ بھی نو چیزیں بیت المال کے اس شعبے میں شامل ہوں گی۔ جو کہ مال غنیمت سے خالق کائنات اور رسول کا خمس، سرکاری زمینوں کی پیداوار، اس مسلمان کا ترکہ جس کا کوئی وارث نہ ہو، قدرتی معدنیات، پٹرول، تیل اور گیس کی پیداوار کا پانچواں حصہ، مختلف اوقات میں ضرورت رعایا پر لگایا جانے والا ٹیکس، دوسرے ممالک سے سامان تجارت درآمد یا برآمد کرنے پر عائد کردہ کسٹم اور دوران ڈیوٹی سرکاری کارندوں کو عوام سے ملنے والے تحائف وغیرہ شامل ہیں، جن کی تفاصیل کتب فقہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اس شعبے کی طرح اس کے مصرف میں بھی بہت تفاصیل موجود ہیں۔ اس شعبے کے ضمن میں جو مال خراج و جزیہ اور عشور کے طور پر ذمی کافروں اور مستامن حربیوں کے تاجروں سے لیا جاتا ہے اس مال کو مسلمانوں کی عمومی مصلحتوں میں خرچ کیا جائے گا، پس یہ مال امام یا حاکم کے ہاتھ میں ہوگا اور اپنی صوابدید اور اجتہاد کے مطابق مصالحِ عامہ کے موارد میں خرچ کرے گا۔ جب بھی فقہاء اپنی گفتگو کے دوران بیت المال کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی مراد بیت المال کا یہی شعبہ ہوتا ہے، چونکہ سب شعبوں میں

---

[1] حاشیہ ابن عابدین، ابن عابدین، 2/39

[2] ایسا شخص جو اسلام سے پھر جائے مرتد کہلاتا ہے۔

[3] المغنی، ابن قدامہ، 8/128

[4] حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر، محمد بن احمد بن عرفۃ الدسوقی، دار الفکر، سال اشاعت ندارد، 2/190

تنہا یہی شعبہ ہے جو مصالحِ عامہ کے لیے وقف ہے اور جس کا مصرف ہی عمومی مصالح ہیں۔ مصالح عامہ کو حصر اَشمار میں لانا ممکن نہیں کیوں کہ یہ زمان و مکان کے بدلنے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اسی شعبے کے محاصل کو راہِ اسلام میں لڑنے والوں کے عطیات دینے، ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرنے، مملکت اسلامی کے تحفظ کے لیے قلعوں کے بنانے، راستوں کی حفاظتی چوکیاں قائم کرنے، سڑکیں اور پل وغیرہ بنانے اور ان کو درست کرانے، بڑی نہریں کھودنے، مسافرخانے، سکول، کالج، تعلیمی ادارے، ہسپتال، صحت کے مراکز اور مسجدیں بنانے، دریاؤں کا پانی روکنے کے لئے ان پر بند بنانے میں خرچ کیا جائے گا۔ نیز قاضیوں، مفتیوں، محتسبوں، معلموں اور طالبعلموں کا روزینہ بھی اس میں سے دیا جائے۔ اس کے علاوہ بھی وہ تمام امور جو مسلمانوں کی عمومی مصلحتوں کا تقاضہ ہیں اسی سے انجام دیے جائیں گے۔

حاکم، خلیفہ یا امام پر واجب ہے کہ بیت المال میں آنے والے تمام مال کو اس کے حق داروں تک پہنچائے اور اس مال کو ان سے روک کر نہ رکھے، بلکہ لازم ہے کہ وہ ان کے حالات وواقعت اور ضروریات سے آگاہ ہوا اور انہیں ان کی ضرورت اور علم وفضل کے مطابق مال عطا کرے۔ اگر اس نے اس میں قصور کیا تو اللہ تعالیٰ اس سے حساب لے گا۔ حاکم، خلیفہ یا امام، ان کے عاملوں اور مددگاروں کے لیے بیت المال سے اِسی قدر لینا حلال ہے جو کہ ان کے اور ان کے اہل وعیال کے لئے کافی ہو۔ اگر حاکمِ وقت اس میں کوتاہی کا ارتکاب کرے یا قصور کرے تو قیامت کے دن اس کا وبال بھی اسی کی گردن پر ہو گا۔

غربت کے خاتمے میں اسلامی بیت المال کا کردار

اسلامی بیت المال کی آمدنی کے ذرائع اور اس کے مصارف سے بخوبی عیاں ہے کہ اسلام دولت کو مفاد عامہ اور عوام الناس کی بھلائی کے لیے خرچ کرنے پر مصر ہے۔ اور انہیں اس بات کا پابند بناتا ہے کہ دولت کو عوام الناس کی فلاح وبہبود پر خرچ کرنے سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔ مندرجہ بالا سطور میں بیت المال کے مصارف کے ضمن میں تفصیل سے بیان ہو چکا کہ بیت المال کی اشیاء کو کن موارد میں اور کس طرح استعمال کیا جانا ضروری ہے۔ ان موارد میں سے اکثریت کا تعلق پسماندہ اور ضرورت مند افراد سے ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ پسماندگی، غربت اور تنگدستی کو دور کرنے کے لیے بیت المال کا ادارہ کلیدی کردار کا حامل ہے۔ بیت المال کی آمدنی اسلامی حکومت کی سرکاری آمدن کا دوسرا نام ہے۔ یہ آمدنی خلیفہ، امام یا حاکم کے اختیار اور اس کی رائے سے حکومت کے تمام شعبوں میں خرچ کی جاتی ہے۔ تمام کارکنانِ حکومت کی تنخواہیں، خود خلیفہ کی تنخواہ، جوج کا سامان رسد، آلات حرب و ضرب اور دیگر معاشرتی کاموں کی تکمیل بیت المال سے کی جاتی ہے۔

دراصل اسلامی ریاست بلکہ دارالاسلام میں بسنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام مملکت اسلامی کا شرعی فریضہ ہے اور اس فریضے سے نبرد آزما ہونے کے خاطر بیت المال کو استعمال میں لائے گی۔ یہ اہتمام اس درجہ تک ہونا چاہیے

کہ ایک فرد بھی ان ضروریات سے محروم نہ رہے۔ان بنیادی ضروریات میں غذا،لباس،مکان،تعلیم اور علاج وغیرہ شامل ہیں۔سرور کائنات نے حکمران کی ان ذمہ واریوں کے سلسلے میں حکم دیا کہ:

((مَا مِنْ إِمَامٍ يُغْلِقُ بَابَهُ دُونَ ذَوِي الحَاجَةِ، وَالخَلَّةِ، وَالمَسْكَنَةِ إِلَّا أَغْلَقَ اللَّهُ أَبْوَابَ السَّمَاءِ دُونَ خَلَّتِهِ، وَحَاجَتِهِ، وَمَسْكَنَتِهِ))[1]

ترجمہ: جو امام (حاکم، خلیفہ یا سربراہ مملکت) ضرور تمندوں، فقراء اور مساکین پر اپنے دروازے بند کر لیتاہے،اللہ تعالی اس کی ضروریات، فقر اور مسکینی پر آسمان کے دروازے بند کر لیتاہے۔

ایک اور حدیث مبارک میں ارشاد ہوا "اللہ تبارک و تعالی نے جس بندے کو بھی لوگوں کا حکمران بنایا اور اس نے ان کے ساتھ خیر خواہی نہ کی ہو تو ایسا بندہ (جنت جانا تو در کنار) جنت الفردوس کی خوشبو بھی اس کے مسام تک نہ آسکے گی۔ "[2]

شریعت مقدسہ نے حکمران کو تمام رعایا کا ولی بنایاہے اور اسکو حکم دیاہے کہ مملکت کے افراد کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے،اور رعایا کی خیر خوہی مد نظر رکھی جائے۔یعنی شریعت اسلامی کی روسے تمام افراد کی ضروریات زندگی کی تکمیل کا انتظام اور اہتمام اسلامی ریاست کے سربراہ پر لازم ہے۔

کفالت عامہ کی اس ذمہ داری کو ہر نیک دل سربراہ ریاست نے قبول کیاہے۔چنانچہ اسلامی حکومتوں بلخصوص خلافت راشدہ میں خلفاء کی کوشش تھی کہ مملکتِ اسلامی کی حدود میں نہ صرف انسان بلکہ جانوروں کو بھی کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے بلکہ ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام ہوتا رہے۔چنانچہ اس حوالے سے حضرت عمر فاروق کا وہ جملہ مشہور ہے جس میں آپ نے کہا تھا کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی بکری بھی بے سہارا ہونے کی وجہ سے مر جائے تو مجھے گمان ہے کہ اللہ قیامت کے روز اس بارے میں مجھ سے ضرور بازپرس کرے گا۔[3]

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کفالت عامہ کی اس گراں بار ذمہ داری کا خیال کر کے اکثر و بیشتر روتے رہتے تھے کہ کہیں قیامت کے روز عدالت خداوندی کے کٹہرے میں نہ کھڑے ہونا پڑے،ایک دفعہ نماز پڑھنے کے بعد آنسوؤں سے ان کی ریش مبارک تر تھی تو ان کی زوجہ نے وجہ پوچھی تو فرمایا: میں نے پوری امت محمدیہ کی ذمہ داری لے لی ہے،لہذا میں بھوکے فقیروں، بے

---

[1] سنن الترمذی، محمد بن عیسی الترمذی، باب ماجاء فی امام الرعیۃ، حدیث رقم 1332، ص 3/611

[2] صحیح بخاری، امام بخاری، کتاب الاحکام، باب من استرعي رعیۃ فلم ینصح، حدیث رقم 7150، ص 9/64

[3] مواسم العمر، جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمن بن علی بن محمد الجوزی، دار البشائر الاسلامیۃ، طبع اول 2004، ص 161

سہارا مریضوں، مجاہدین، مظلوم اور ستم رسیدہ افراد، غریب الدیار قیدیوں، بہت بوڑھے افراد اور ان کے بارے میں غور وفکر کر رہا تھا جو بکثرت اہل و عیال والے ہیں مگر مال دار نہیں ہیں اور مختلف علاقوں میں اس قسم کے لوگوں کے بارے میں متفکر تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ عنقریب قیامت کے روز اللہ تعالی مجھ سے ان کے بارہ میں پوچھے گا اور اللہ کے حضور میرے مقابلہ میں ان لوگوں کے وکیل سرکار دوعالم ﷺ ہیں۔ مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ جرح میں میری بات پایہ ثبوت کو نہ پہنچ سکے گی تو میں اپنی جان پر ترس کھا کر رونے لگا۔[1]

اسلامی دور حکومت یعنی خلافت راشدہ کے دور میں بیت المال کی آمدن کو ہر محتاج و غریب کے مسکن تک پہنچایا جاتا۔ حضرت عمر ابن عبد العزیز جن کے زمانے کے بارے میں مشہور ہے کہ زکاۃ لینے والا اس وقت میں نہیں ملتا تھا۔ ایک مرتبہ ان کے عامل نے ان کو لکھا کہ فوجیوں کو تنخواہ دینے کے بعد بیت المال میں کچھ رقم بچ گئی ہے تو اس کو کیا آپ کے پاس بھجوادوں، تو آپ نے اس کے جواب میں لکھا کہ "تم نے لکھا ہے کہ فوجیوں کو مدد دینے کے بعد تمہارے پاس بیت المال میں رقم بچ گئی ہے۔ لہذا یہ بچی ہوئی رقم اسے دے دو جس پر واجبی قرض ہے یا پھر اس کو دے دو جس نے نکاح کر لیا ہو مگر اس کے پاس گھر کے اخراجات چلانے کے لیے نقد روپیہ نہ ہو"[2]

لوگوں کو بنیادی ضروریات زندگی کے فراہم کرنے، ان کی احتیاج میں ان کی مدد اور تکافل کرنے، ان کی غربت و مسکنت میں ان کا خیال کرنے اور ان کی پرورش و نگہداشت کرنے میں بیت المال کا یہ وہ کردار ہے جس کے بارے میں خلفاء راشدین جیسی شخصیات بھی فکر مند رہیں کہ اس کے ادا کرنے میں ان سے کوئی کوتاہی سرزد نہ ہو جائے۔

کفالت عامہ کی طرح ملک کی معاشی تعمیر و ترقی بھی ریاستِ اسلامی کا فریضہ ہے۔ ایک مثالی مملکت پر لازم ہے کہ وہ ملک کی تعمیر و ترقی کا پورا اہتمام کرے۔ اس مقصد کے لیے بیت المال کا پیسہ ہی ہے جس کو حاکمِ وقت صحیح سمت میں خرچ کر کے اسلامی ریاست میں معاشی ترقی کے زینے طے کر سکتا ہے۔

امام ماوردی اسلامی ریاست کے سربراہ کا ایک فریضہ معاشی خوشحالی کو یقینی بنانا بتاتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اپنے زیر حکومت مملک اور شہروں کے جملہ مصالح کے تحفظ اور اس کی شاہراہوں اور دوسرے ذرائع

---

[1] الکامل في التاریخ، عزالدین ابن الاثیر، دار الکتاب العربي، بیروت، لبنان، طبع اول 1997ء، 24/4

[2] سیرۃ عمر بن عبد العزیز علی ماروا ہ الامام مالک بن انس واصحابہ، عبد اللہ بن عبد الحکم، عالم الکتب، بیروت، لبنان، طبع سادسہ 1984ء، ص:27

نقل و حمل کو بہتر بنا کر ان کی تعمیر و ترقی اور خوشحالی و آبادی کو قائم رکھے۔[1] خلافت راشدہ جو اسلامی نظامِ حکومت کا سنہرا دور شمار کیا جاتا ہے کے اندر ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جو معاشی و معاشرتی ترقی اور بہبود کے لیے بیت المال سے مال و دولت کو استعمال کرنے سے متعلق ہیں۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں اس مقصد کے لیے نہروں کی کھدائی، شاہراؤں اور پلوں کی تعمیر اور دوسرے تعمیری کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا گیا۔ شہروں کی تعمیر و ترقی کے کاموں کے فروغ کے لیے حضرت عمر فاروق نے ایک باقاعدہ محکمہ بنایا۔ اس محکمہ کو آج کل کی عرب دنیا میں "نظارت نافعہ" کہا جاتا ہے۔ آپ نے اس محکمہ کے زیر اہتمام پوری اسلامی مملکت میں مختلف سرکاری عمارتیں بنوائیں، سڑکیں بھی تعمیر کروائیں اور مختلف شہروں میں نہریں بھی کھدوائیں[2]۔ یہ سارے اور اس جیسے دیگر بہت سے کام بیت المال کی آمدنی سے ہی انجام پاتے تھے اور یوں بیت المال لوگوں کی معاشی ترقی اور فلاح و بہبود کے کاموں میں بھرپور کردار رہتا ہے۔

---

[1] ادب الدنیا والدین، ابو الحسن علي بن محمد الماوردی، دار مكتبة الحياة، طبع 1986، ص:82

[2] فتوح مصر والمغرب، عبد الرحمن بن عبد اللہ بن عبد الحکم، ص:135

فصل ششم

اسلام کا قانونِ وراثت

اسلامی قانونِ میراث: تعارف و اہمیت

اسلام نے تمدنی استحکام اور عائلی و خاندانی نظام کی نشو و نما کی خاطر نیز انسان کی معاشی و اقتصادی بہتری اور بھلائی کے لیے ایسے ابدی اور فطری احکامِ میراث پیش کر دیے ہیں جن میں نہ صرف ان تمام ناانصافیوں کا ازالہ کر دیا گیا ہے جو اس سے قبل انسانی معاشرے میں پائے جاتے تھے بلکہ معاشرے کی تمدنی و معاشی استحکام کے تمام امور کو ان میں جمع کر دیا گیا ہے جس سے معاشرہ سماجی و اقتصادی طور پر مستحکم اور مضبوط ہوتا ہے۔

اسلامی قانونِ وراثت کے لیے "علم المواریث" اور "علم الفرائض" کے الفاظ مستعمل ہیں۔ مواریث در حقیقت میراث کی جمع ہے جس کے عربی زبان کے مطابق دو معانی ہیں۔ ایک معنی بقاء اور باقی رہنا ہے، اسی معنی میں یہ لفظ اللہ کی ذات کے لیے ہے اور اللہ کے اسماء حسنی میں سے ایک "وارث" اسی معنی میں ہے یعنی باقی رہنے والا، فنا نہ ہونے والی ذات۔ کیونکہ ذات احدیت کے سوا کائنات کی ہر چیز کو فنا ہے لیکن وہ ہمیشہ کے لیے باقی رہنے والا ہے [1]۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَن مِّن بَعْدِهِمْ إِلَّا قَلِيلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوَارِثِينَ﴾ [2]

ترجمہ: اور کتنی ہی ایسی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اترا گئے تھے سو دیکھ لو، وہ ان کے مسکن پڑے ہوئے ہیں جن میں ان کے بعد کم ہی کوئی بسا ہے، آخر کار ہم ہی وارث ہو کر رہے۔

اس کا دوسرا معنی کسی شے کا دوسرے افراد کی طرف منتقل ہونا ہے۔ علامی البقری لکھتے ہیں:

"وَيُطْلَقُ الْإِرْثُ وَيُرَادُ مِنْهُ انْتِقَال الشَّيْءِ مِنْ قَوْمٍ إِلَى قَوْمٍ آخَرِينَ" [3]

ترجمہ: اشیاء کی ایک قوم سے دوسری قوم کی طرف منتقلی کے لیے ارث یا میراث کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

شریعت اسلامیہ کی نگاہ میں علم المیراث ایسے قوانین کا مجموعہ ہے جن کی رو سے یہ جاننا مقصود ہوتا ہے کہ میت کا کون وارث بنتا ہے اور کون وارث نہیں ہے، اور اگر کوئی وارث بنتا ہے تو میت کی جائداد سے اس کا حصہ کتنا ہو گا۔ میراث کی اصطلاحی تعریف یوں ہے کہ:

---

[1] لسان العرب، ابن منظور افریقی، 199/2

[2] سورۃ القصص: 58/28

[3] حاشیۃ محمد بن عمر البقری علی شرح المنظومۃ الرحبیۃ فی علم الفرائض، محمد بن عمر البقری، المطبعۃ المیمنیۃ، مصر، طبع 1334ھ، ص5

”ويطلق في الشريعة الإسلامية على استحقاق الإنسان شيئا بعد موت مالكه بسبب مخصوص, وشروط مخصوصة“[1]

ترجمہ: شریعت اسلامیہ کی روسے کسی چیز کے مالک کے مرجانے کے بعد کسی مخصوص سبب اور مخصوص شرائط کے تحت دوسرے افراد کا اس چیز کا مالک بن جانا ہے۔

وراثت کا یہ علم اس قدر اہمیت اور فضیلت رکھتا ہے کہ شریعت میں اسے علم الفرائض کا ایک مستقل نام دیا گیا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم کو سیکھنے اور سکھانے کی تلقین کی ہے۔ نبی اکرم خود اپنی زندگی میں وراثت کے قوانین کی تعلیم دیا کرتے تھے اور کبھی کبھی وراثت کے مسائل کے بارے میں صحابہ سے سوال وجواب بھی کیا کرتے تھے۔ اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم کی طرح میراث کے مسائل سیکھنے اور پھر دوسروں کو سکھانے کی بھی تلقین وترغیب دلاتے تھے۔ چنانچہ آپؐ فرمایا کرتا تھے((

تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ وَالفَرَائِضَ وَعَلِّمُوا النَّاسَ فَإِنِّي مَقْبُوضٌ))[2]

ترجمہ: قرآن اور میراث کے مسائل کو سیکھو اور پھر یہ چیزیں دوسرے لوگوں کو سکھاؤ اس لیے کہ میں نے (عنقریب) اس دنیا سے اٹھ جانا ہے۔

میراث کے مسئلہ میں تمام دیگر احکام کے برعکس تمام تر تفاصیل کو قرآن مجید نے خود طول وتفصیل سے بیان فرمایا۔ رسول اکرمؐ نے اپنے اصحاب کو جب قرآن مجید سیکھنے یا دیگر علوم کو سیکھنے کی طرف رغبت دلانا چاہی تو آپؐ نے علم الفرائض کا بالخصوص ذکر فرمایا۔ سیدنا ابن مسعود راوی ہیں کہ سید الرسل نے فرمایا:

((تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ وَعَلِّمُوهُ النَّاسَ، وَتَعَلَّمُوا الْعِلْمَ وَعَلِّمُوهُ النَّاسَ، وَتَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوهَا النَّاسَ، فَإِنِّي امْرُؤٌ مَقْبُوضٌ، وَإِنَّ الْعِلْمَ سَيَنْقُصُ حَتَّى يَخْتَلِفَ الِاثْنَانِ فِي الْفَرِيضَةِ، فَلَا يَجِدَانِ مَنْ يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا))[3]

---

[1] علم الفرائض والمواریث فی الشریعۃ الاسلامیہ والقانون السوری، محمد خیری المفتی، طبع وسن طبع ندارد، ص:6

[2] سنن الترمذی، محمد ابن عیسی ترمذی، ابواب الفرائض، حدیث رقم 2019، ص 3/484

[3] السنن الکبری، ابو عبد الرحمن النسائی، حدیث رقم 6271، ص 6/97

ترجمہ: قرآن سیکھو اوراور دوسروں کو تعلیم دو، اور میراث کے مسائل سمجھو اور دوسروں کو سکھاؤ، یقیناً میں دنیا سے رخصت ہو جاؤنگا۔ (قرآن اور میراث) کا علم اٹھالیا جائے گا اور فتنے ظاہر ہو جائیں گے اور عنقریب وراثت کی تقسیم میں دو لوگوں کے مابین جھگڑا ہو جائے گا تو انکو اپنا حکم نہ ملے گا۔

نیز فرمایا:

((الْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ، وَمَا سِوَى ذَلِكَ فَضْلٌ: آيَةٌ مُحْكَمَةٌ، أَوْ سُنَّةٌ قَائِمَةٌ، أَوْ فَرِيضَةٌ عَادِلَةٌ))[1]

ترجمہ: جن علوم کا سیکھنا ضروری ہے وہ تین طرح کے ہیں۔ جبکہ دوسرے علوم کا سیکھنا فضیلت کے باب میں آتا ہے۔ اور وہ یہ ہیں قرآن کی آیات احکام کا سیکھنا، دوسرا سنت نبوی کا علم، تیسرا فرائض یعنی وراثت کا علم جو سارے کا سارا حق پر مبنی ہے۔

آپؐ نے میراث کے علم کو نصف العلم قرار دیتے ہوئے فرمایا:

((تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوهَا، فَإِنَّهُ نِصْفُ الْعِلْمِ))[2]

ترجمہ: فرائض سیکھو اور لوگوں کو سکھاؤ، یقیناً یہ آدھا علم ہے اور یہ بھلا دیا جائے گا۔

مذکورہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو وراثت کے علم کو سیکھنا چاہیے کیونکہ دیگر علوم کے مقابلہ میں علم میراث کو سیکھنے کی بہت اہمیت ہے۔

حضرت عمر فاروق اس کی ترغیب دیتے ہوئے علم الفرائض یا میراث کے علم کو دین کے اہم ترین مسائل و احکام میں سے ایک بتلاتے اور مسلمانوں کو اسکے تعلیم و تعلم کی تلقین فرماتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

((تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ فَإِنَّهَا مِنْ دِينِكُمْ))[3]

ترجمہ: وراثت کے قوانین سیکھو کیونکہ یہ تمہارے دین کا حصہ ہیں۔

اسلامی احکام اور روایات سے قطع نظر، میراث کا نظام ایک طبیعی و فطرتی نظام بھی ہے۔ دراصل دنیا میں انسان کی دو حالتیں ہیں، ایک حالت وہ ہے کہ جس میں وہ زندہ ہوتا ہے جب کہ دوسری حالت اس کی حالتِ موت ہے۔ زندہ انسان اپنی تمام

---

[1] سنن ابو داؤد، ابو داؤد طیالسی، باب ماجائی فی تعلیم الفرائض، حدیث رقم 2885، 119/3

[2] سنن ابن ماجہ، ابن ماجہ، کتاب الفرائض، 908/2

[3] مسند الدارمي، عبد الصمد الدارمي، کتاب الفرائض، حدیث رقم 3060، ص:683

چیزوں کا خود ہی مالک و مختار ہوتا ہے جب کہ مرنے والا اپنی کسی چیز کے بارے میں اختیار رکھتا ہے نہ ہی مالک ہو سکتا ہے بلکہ اس کی چھوڑی گئی چیزیں زندوں میں ہی مختلف قواعد و قوانین کے تحت تقسیم کی جاتی ہیں۔ کسی مردہ انسان کی چھوڑی گئی اشیاء کا اس کے بعد والوں میں تقسیم ہونا ہی میراث کا قانون کہلاتا ہے۔ یہ نظام نہ فقط اسلامی بلکہ اقتصادی حوالے سے بھی ناگزیر ہے کہ اس کا نشاطِ اقتصاد میں ایک کلیدی کردار ہے۔

اسلام سے قبل مرنے والے کے ترکے اور جائیداد میں غیر مستحقین کو بھی وارث تصور کیا جاتا تھا جس سے حقیقی ورثاء محروم ہو جاتے تھے۔ اسلام نے غیر وارثوں کے لیے ایک تہائی کی وصیت کو تو برقرار رکھا ہے مگر بقیہ جائیداد کے لئے کڑے شرعی قواعد مقرر کر دیے۔ اس طرح سے متبنیٰ اولاد اور احباب کے لیے وصیت اور ہبہ کی شکل تو قائم کی گئی ہے مگر انہیں مستقل میراث کے حقدار نہیں ٹھہرایا گیا ہے۔

بعض معاشروں، ممالک اور قوموں میں اولاد میں سے بڑے بیٹے کا حق تو تسلیم کیا گیا ہے مگر دوسرے اعزاء کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس سے خانگی اور عائلی زندگی میں کئی نوعیت کی قباحتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اسلام نے تو رحم مادر میں موجود بچے کے ورثے کا حق بھی محفوظ کر دیا ہے۔ اس سے احترام آدم کی بہترین پیدا کی گئی ہے۔ قواعد میراث میں چھوٹے بڑے مرد و عورت حتیٰ کہ مفقود الخبر، ولد الزنا، ولد الملاعنہ اور خنثیٰ کی میراث کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔

اسلام کا قانونِ میراث در حقیقت اس بات کا اعلان ہے کہ اشیاء صرف و خرچ اور اپنی تمام جمع پونجی کو اپنی ضروریات پر خرچ کرنے، راہِ خدا میں صدقہ و خیرات کرنے اور زکاۃ و عشر و دیگر مالی واجبات ادا کرنے کے بعد بھی جو دولت ایک جگہ سمٹ کر رہ گئی ہو اس کے ارتکاز کو بھی اسلام پسند نہیں کرتا، چنانچہ اس کو پھیلانے کے لیے اسلام نے ایک اور تدبیر اختیار کی ہے جس کو قانونِ وراثت و میراث کہتے ہیں۔ اسلام اس وسیلے سے فقر و تنگدستی کا سبب بننے والے ایک بہت بڑے عامل یعنی ارتکاز دولت کی راہ مسدود کرتا ہے اور اس کا انسداد کر کے تقسیم و گردشِ دولت کے قانون کو عام کر کے غربت کے خاتمے کی ایک اور بنیاد فراہم کرتا ہے۔

اسلام کا یہ قانونِ وراثت ایک غیر اختیاری انتقالِ ملکیت ہے جس کے ذریعہ ایک مرنے والے کا ترکہ اس کے ورثاء میں بطریق جانشینی منتقل ہو جاتا ہے۔ کسی مرد یا عورت کے انتقال پر اسکا مال متروکہ اسکے والدین، ااولاد اور بیوی یا شوہر کے درمیان ایک مقرر نسبت اور دستور کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔ اور اگر اولاد یا والدین نہ ہوں تو اس کے بھائی بہنوں کو دیا جائے۔[1]

---

[1] معیشت و اقتصاد کا اسلامی تصور، حکیم محمود احمد ظفر، ص594

یوں اسلام دولت کے اکتناز کی بیخ کنی کرتا ہے، کیونکہ دولت کا ایک جگہ جمع ہوتے رہنا اور اور مستحق افراد میں تقسیم نہ ہونا سرمایہ داری اور اکتناز کی بدترین شکل ہے۔ جب کہ دوسری طرف یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ اگر مال و دولت، زمین اور جائیدادیں ورثاء میں تقسیم ہوتی رہیں تو یہ دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کی بجائے ہزاروں لاکھوں بلکہ بے شمار انسانوں کے درمیان تقسیم ہوتی رہے گی اور ان کی نفع بخشی اور فائدے کا باعث بنتی نظر آئے گی۔ ابتداء اسلام میں جب میراث کے احکام نازل ہوئے تو سرمایہ دارانہ ذہنیت اور معیشت رکھنے والے قبائل، افراد اور قوموں نے اس کے خلاف یہ دلیل دے کر آواز بلند کی کہ اگر تقسیمِ وراثت کا یہ نظام نافذ کر دیا گیا تو یہ اقدام دولت و ثروت کا خاتمہ کر دے گا اور تھوڑے ہی عرصے میں بڑی بڑی جائیدادیں تقسیم ہو کر چند کھیتوں یا یونٹوں کی صورت میں باقی رہ جائیں گی۔ اسلام کا تو منشاو مقصد یہی ہے کہ گردشِ دولت و ثروت کو ہر صورت میں یقینی بنایا جائے اور اس کے چند ہاتھوں میں جمع ہو کر کنز بن جانے کے عمل کو ہر صورت میں روکا جائے۔ اس لیے کہ اسلام کی نگاہ میں دولت تقسیم و استعمال ہونے کے لیے ہے جمع ہونے کے لیے نہیں، لہذا قانونِ وراثت کے ضمن میں تقسیمِ دولت کی ایک مزید راہ کھول دی گئی ہے۔

اسلامی احکام کے باب میراث کے شرعی احکام تمام تر طول و تفصیل کے ساتھ پروردگار نے نازل کر کے اس سے فیض پانے والے لوگوں اور وارثوں کو ان کے نصاب اور حاصل ہونے والے حصوں کی تمام تر تفاصیل بتا دی گئی ہیں۔ جب حصہ پانے والوں کے علم میں ہو کہ ان کا یہ حصہ پروردگار کی طرف سے نازل کیے گئے خاص احکام کی بدولت انہیں ملا ہے تو ان میں اس سے کارِ خیر کرنے اور منہیات و معصیات میں استعمال نہ کرنے کا جذبہ اور ارادہ جنم لیتا ہے جس سے معاشرتی عدل و انصاف کی منزل متعین ہوتی ہے۔ اسی مرحوم کی میراث سے جن افراد کو حصہ نہیں ملتا تو انہیں اس بات کا ادراک ہوتا ہے کہ میت سے مال نہ پانے کی وجہ اسلامی ارثی قوانین اور آسمان سے نازل ہونے والا حکمِ پروردگار ہے لہذا وہ اس بات پر قانع اور شاکر رہتے ہیں،

اگر خدانخواستہ یہ معاملہ انسانوں کے ہاتھ میں ہوتا اور دور کے رشتہ داروں کو محروم کر دیا جاتا تو اس سے محرومیاں اور نفرتیں جنم لیتیں جن کی گود سے سازشیں اور فتنے اٹھتے ہوئے دیر نہیں لگاتے۔[1]

قانونِ میراث کی معاشی اہمیت

شاہ ولی اللہ اسلام کے قانونِ میراث کی انسانی اخلاقیات اور معاشیات پر پڑنے والے اثرات کے حوالے سے باب الفرائض کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

---

[1] الاقتصاد السیاسی وجدلیۃ الثروۃ والفقر، محمد حرکات، مطبعۃ المعارف الجدیدۃ، الرباط، طبع اول 2002، ص:231

"اعْلَم أَنه أوجبت الْحِكْمَة أَن تكون السّنة بَينهم أَن يتعاون أهل الْحَيّ فِيمَا بَينهم، ويتناصروا، ويتواسوا، وَأَن يَجْعَل كل وَاحِد ضَرَر الآخر ونفعه بِمَنْزِلَة ضَرَر نَفسه ونفعه،وَلَا يُمكن إِقَامَة ذَلِك إِلَّا بجبلة تؤكدها أَسبَاب طارئة، ويسجل عَلَيْهَا سنة متوارثه بَينهم فالجبلة هِيَ مَا بَين الْوَالِد، وَالْولد، والأخوة، وَغير ذَلِك من المرادة.والأسباب الطارئة هِيَ التألف، والزيارة، والمهاداة، والمواساة فَإِن كل ذَلِك يحبب الْوَاحِد إِلَى الآخر، ويشجع على النَّصْر والمعاونة فِي الكريهات.

وَأما السّنة فَهِيَ مَا نطقت بِهِ الشَّرَائِع من وجوب صلَة الْأَرْحَام وَإِقَامَة اللائمة على إهمالها، ثمَّ لما كَانَ من النَّاس من يتبع فكرا فَاسِدا، وَلَا يُقيم صلَة الرَّحِم كَمَا يَنْبَغِي، ويعد مَا دون الْوَاجِب كثيرا مست الْحَاجة إِلَى إِيجَاب بعض ذَلِك عَلَيْهِم، أشاءوا، أم أَبَوا مثل عِيَادَة الْمَرِيض، وَفك العاني، وَالْعقل، وإعتاق مَا ملكه من ذِي حم وَغير ذَلِك، وأحق هَذَا الصِّنْف مَا اسْتغنى عَنهُ بالإشراف على الْمَوْت، فَإِنَّهُ يجب فِي مثل ذَلِك أَن يصرف مَاله على عينه فِيمَا هُوَ نَافِع فِي المعاونات المنزلية، أَو يصرف مَاله من بعده فِي أَقَاربه"[1]

ترجمہ: یاد رکھو کہ بلاشبہ عقل و حکمت کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان لازمی اور ضروری امر ہے کہ اہل قبیلہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور دردمندی و بہی خواہی کا ثبوت دیں، اور ایک دوسرے کے نفع و نقصان کو اپنا ذاتی نفع و نقصان سمجھیں۔ اور یہ بات ایسی خلقت اور جبلت کے بغیر ناممکن ہے جس کی پشت پر اس کو مضبوط بنانے کے لیے خارجی اسباب اور اس کو محفوظ رکھنے کے لیے "سنت متوارثہ" موجود نہ ہو۔ یہاں جبلت اس علاقہ اور تعلق کا نام ہے جو باپ اور بیٹے یا مثلاً بھائی اور بھائی کے درمیان موجود ہے اور اسی طرح دو یا چند عزیزوں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔

اسباب خارجی باہمی الفت و محبت، رہنمائی، غمگساری و ہمدردی وغیرہ کا نام ہے کیونکہ یہ امور آپس میں محبت پیدا کرتے ہیں اور مصائب و آلام میں ایک دوسرے کی اعانت و نصرت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ اور سنت ان امور کو کہتے ہیں جو لوگوں میں رشتہ اخوت پیدا کرنے کا سبب ہیں، مثلاً شریعت حکم دیتی ہے کہ صلہ رحمی ضروری اور فرض ہے اور ایسا نہ کرنے والا گناہگار ہے، مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ بعض انسانی طبائع برے خیالات و افکار کے پیچھے لگی رہتی ہیں اور صلہ رحم جیسے عمدہ اوصاف کے خلاف بغاوت کرتی ہیں تو بہت سارے غیر ضروری کام کرنے پر آمادہ رہتی ہیں۔

ایسے حالات میں ایک بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس قسم کے اخلاقی امور کو ضروری قرار دیا جائے اور لوگوں کے قبل و انکار سے بالاتر ہو کر ان پر لازم کر دیا جائے مثلاً مریض کی عیادت، مقروض، اسیر و مقروض وغیرہ جیسے مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت

---

[1] حجۃ اللہ البالغۃ، شاہ ولی اللہ دہلوی، 2/182، 181

،دیت اور اقرباء پر پڑے ہوئے تاوان کی ادائیگی، اپنے ذی رحم محروم کو غلامی سے نجات دلانا وغیرہ اور اس قسم کی معونت و نصرت موت کے کنارے کھڑے شخص کے لیے زیادہ لازم ہے، ایسے وقت میں اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مال کو اپنے ذاتی اور معاشرتی فائدے کے لیے استعمال کرے یا پھر اپنی موت کے بعد اپنے اقرباء کے لیے چھوڑ جائے اور اس طرح ان کی اعانت و مدد کرے، بہر حال اسلام کا یہ قانونِ توارث (یعنی اپنے بعد والوں کے لیے دولت کا چھوڑ جانا اور اس کا باقاعدہ اسلامی قوانین کے مطابق مستحقین میں تقسیم ہونا) تقسیمِ دولت کا ایک بہترین طریقہ ہے۔

میراث کے معاملے میں کتاب اللہ کا اختیار کردہ اصول یہ ہے کہ جو مال ایک شخص کی زندگی میں یکجا مرتکز ہو گیا ہو وہ اس کے مرنے کے بعد مرتکز نہ رہنے دیا جائے بلکہ اس کے قرابت داروں میں پھیلا دیا جائے۔ یہ اصول توریثِ خلفِ اکبر (Prime Genetive) یعنی صرف بڑے بیٹے کے وارث ہونے کے اصول اور مشترک خاندانی جائیداد یعنی Joint Family System اور ایسے ہی دوسرے طریقوں کے برعکس ہے، جن کا نتیجہ تو یہ ہے کہ مرتکز شدہ دولت مرنے والے کے بعد بھی مرتکز ہی رہے۔[1]

اللہ کی کتاب متبنّی بنانے کے طریقے کو بھی رد کرتی ہے اور یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ جو لوگ واقعی رشتہ دار ہیں، میراث میں حق انہی کا ہے، کسی غیر آدمی کو بیٹا بنا کر مصنوعی طور پر وارث نہیں بنایا جا سکتا۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ أَدْعِيَاءَكُمْ أَبْنَاءَكُمْ ذَٰلِكُمْ قَوْلُكُم بِأَفْوَاهِكُمْ وَاللَّهُ يَقُولُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيلَ﴾[2]

ترجمہ: اور نہ تمہاری منہ بولی اولاد کو اولاد قرار دیا ہے یہ سب تمہاری زبانی باتیں ہیں اور اللہ تو صرف حق کی بات کہتا ہے اور سیدھے راستے کی طرف ہدایت کرتا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں کسی بھی مرنے والے کے حقیقی اور اصلی وارث اس کے رشتہ دار ہی ہیں البتہ حقیقی وارث رشتہ داروں کے حقوق کی پوری طرح حفاظت کر دینے کے بعد قرآن ان کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ تقسیمِ میراث کے موقع پر جو غیر وارث رشتہ دار، یتیم اور مساکین وغیرہ آئیں تو ان کو بھی وہ اپنی خوشی سے کچھ نہ کچھ دے دیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

---

[1] معاشیات اسلام، ابو الاعلی مودودی، ص:91،90

[2] سورۃ الاحزاب:33/4

﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ﴾[1]

ترجمہ: اور جب تقسیم کے موقع پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور اُن کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔ لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں۔

اپنی ضروریات پر خرچ کرنے اور راہِ خدا میں دینے اور زکاۃ ادا کرنے کے بعد بھی جو دولت کسی ایک جگہ سمٹ کر رہ گئی ہو ،اس کو پھیلانے کے لیے پھر ایک تدبیر اسلام نے اختیار کی ہے اور وہ اس کا قانونِ وراثت ہے۔ اس قانون کا منشا یہ ہے کہ جو شخص مال چھوڑ کر مر جائے، خوہ وہ مال زیادہ ہو یا کم، اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے نزدیک و دور کے تمام رشتہ داروں میں ایک ضاطبہ کے مطابق درجہ بدرجہ پھیلا دیا جائے۔ اور اگر کسی کا کوئی وارث نہ ہو یا نہ ملے تو بجائے اس کے کہ اسے متبنی بنانے کا حق دیا جائے، اس کے مال کو مسلمانوں کے بیت المال میں داخل کر دینا چاہیے تا کہ اس سے پوری قوم فائدہ اٹھائے۔ تقسیمِ وراثت کا یہ قانون جس طرح اسلام میں پایا جاتا ہے، کسی اور معاشی نظام میں نہیں پایا جاتا۔ دوسرے معاشی نظاموں کا میلان اس طرف ہے کہ جو دولت اس شخص نے سمیٹ کر جمع کی تھی وہ اولادِ اکبر کی جانشینی کے قانون (Primogeneture) کے قانون کے تحت یا مشترک خاندان کے طریقے (Joint Family System) کے تحت چند افراد و اشخاص کے ہاتھوں ہی میں رہے۔ مگر اسلام دولت کے سمٹنے کو پسند ہی نہیں کرتا بلکہ وہ اس کو پھیلانا چاہتا ہے تا کہ دولت کی گردش میں آسانی ہو۔[2]

اسلام کا یہ قانون وراثت ساری دنیا کے نظاموں سے انوکھا ہے۔ یورپ میں مرنے والے شخص کا سب سے بڑا بیٹا ہی وراثت کا حق دار ہوتا ہے اور دیگر بیٹوں اور بیٹیوں کو وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملتا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے بڑے بیٹے کو اپنی جائیداد سے محروم کر کے کسی بھی شخص کو اپنی وراثت منتقل کر سکتا ہے۔ جس کا نتیجہ بہت خراب نکل سکتا ہے۔

ہندوستان میں عورتیں وراثت کی حق دار نہیں ہیں۔ صرف مرد ہی وراثت کے حق دار تسلیم کیے گئے ہیں۔ لیکن ان سب مظاموں کے برعکس اسلام کے نظامِ معیشت میں تقسیمِ وراثت میں مرد اور عورت دونوں کو وراثت میں حق دار قرار دیا گیا

---

[1] سورۃ النساء: 8،9/4

[2] معاشیات اسلام، ابوالاعلی مودودی، ص: 90،91

ہے۔ چنانچہ اس قانونِ وراثت کے پورے نظامِ معیشت پر بہت دور رس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یہ اثرات فرد اور معاشرہ دونوں پر مرتب ہوتے ہیں۔

میراث کے اسلامی قانون کے تحت نہ صرف زمین و جائیداد بلکہ عام استعمال تک کی تمام چیزیں، منقولہ و غیر منقولہ تمام اشیاء جب تقسیم کے عمل سے گزرتی ہیں تو اس سے دولت و ثروت کی گردش کے وجود میں آنے سے بہت ساری معاشی سرگرمیاں جنم لیتی ہیں۔ دولت و ثروت کا گردش کرنا بذاتِ خود ہی بہت بڑی اور کلیدی اہمیت کی حامل معاشی و اقتصادی سرگرمی ہے، جس سے معاشرے میں غربت و افلاس و محرومی سے نبرد آزما ہونے کے لیے کئی بنیادیں فراہم ہوتی ہیں۔ اسلامی قانونِ میراث کا معاشرے کے درج ذیل پہلوؤں پر زبردست اثر پڑتا ہے

اولاً: سب سے بڑا اثر جو معاشرہ پر اس قانون سے پڑتا ہے وہ ارتکاز دولت کا خاتمہ ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ارتکاز دولت سے روکنے کا دنیا میں اس سے بڑا اور اعلی قانون موجود نہیں ہے تو مبالغہ نہ ہو گا۔ اس قانون کے تحت میت کے ترکہ کو "ذوالفروض، عصبات اور ذی الارحام" میں اس طرح تقسیم کرنے کا منصوبہ قراان مجید نے پیش کیا ہے کہ کوئی قریبی عزیز اس سے محروم نہیں رہتا۔ پھر دور کے رشتہ داروں یا ان لوگوں کے لیے جن کو قانون وراثت میں حصہ نہیں ملتا جیسے پوتا اور نواسہ وگیرہ ان کے لیے قانونِ وصیت مقرر کیا گیا ہے۔ اگر بالفرض مرحوم کا کوئی قریبی رشتہ دار موجود نہ ہو تو اس کے دور کے رشتہ دار وراثت کے حق دار ہیں۔ اس کے لیے ایک اصول "الاقرب فالاقرب" (یعنی پہلے قریبی عزیز اور بعد ازاں دور کے رشتہ دار) مقرر کیا گیا ہے۔ اسلام کے اس قانونِ وراثت میں جمع شدہ دولت جو معاشرہ میں گردش کر رہی ہے یا نہیں کر رہی، دو تین پشتوں میں تقسیم در تقسیم کے ذریعہ معاشرہ میں پھیل جائے گی اور ارتکاز دولت کے بد اثرات سے معاشرہ محفوظ ہو جائے گا۔

ثانیاً: جب قانون وراثت کے ذریعہ دولت مختلف عزیزوں اور رشتہ داروں میں تقسیم ہو گی تو جاگیروں کو بھی تقسیم در تقسیم ہو کر چھوٹے چھوٹے حصوں بٹ جانا ہے اور جاگیرداری نظام خود بخود سبوتاژ ہو جائیگا۔ کوئی قانون بنانے کی ضرورت ہی نہیں ہو گی۔ اور اس نظام سے وابستہ تمام خرابیاں اپنی موت آپ مر جائیں گی۔

ثالثاً: جب دولت تقسیم ہو گی اور دولت کا ارتکاز ختم ہو گا تو وہ خود بخود معاشرہ میں گردش میں آئے گی اور معیشت میں صرفِ دولت میں اضافہ واضح شکل میں نظر آئے گا، پیداواری عمل بڑھے گا، روزگار کے مواقع زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں گے اور پورے ملک میں معاشی ترقی کی رفتار تیز ہو گی۔

رابعاً: بڑی بڑی کاگیروں میں جاگیر دار اپنی زمینوں کی طرف پوری توجہ نہیں دیتے اور نہ دے سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی جاگیر دار پیداواری عمل میں بذاتِ خود حصہ لیتا ہے بلکہ ان کی زیادہ تر توجہ اپنے ذاتی مشاغل مثلاً سیاست و سیاحت وغیرہ پر ہوتی

ہے۔اسلامی قانون وراثت کی رو سے جب بڑی بڑی جاگیروں کی تقسیم عمل میں آئے گی تو زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر نئے مالکان زیادہ توجہ اور محنت سے بہتر پیداوار حاصل کر سکیں گے۔وراثت کی صورت میں تقسیم ہونے والی زمین کے بے آباد یا بنجر رہ جانے والے حصوں اور ٹکڑوں کی آباد کاری کی کوشش کریں گے۔ جس کے نتیجے میں زرعی پیداوار میں زیادتی اور ملکی معیشت کی رفتار میں اضافہ ہوگا جس سے ملک میں زیادہ سے زیادہ افراد کو روزگار کے مواقع حاصل ہوں گے۔[1]

خامساً: احکام میراث کے اس عمل سے صدیوں سے اسلامی معاشرہ ایک مستحکم خاندانی نظام میں پرویا ہوا دکھائی دیتا ہے اس سے کسی معاشرے اور ریاست میں معاشی حسن بھی پیدا ہوتا ہے۔کیونکہ احکام میراث سے جاگیرداری نظام کے خاتمے میں مدد ملتی ہے۔ نیز ارتکاز دولت کے رجحانات بھی کمزور پڑتے ہیں۔وراثت اور ترکے کی تقسیم سے چھوٹے یونٹ وجود میں آتے ہیں جس سے پیدائش کے عمل میں افزائش اور تیزی پیدا ہوتی ہے۔یہ قواعد گردش دولت کو وجود میں لاتے ہیں جس سے قوم اور ملک کے مجموعی معاشی عمل میں قوت اور استحکام پیدا ہوتا ہے۔

اسلامی میراث کے ذریعے معاشرتی استحکام اور تہذیبی اور تمدنی عروج بھی نصیب ہوتا ہے۔اس سلسلے میں شریعت نے موانع میراث کی جو تفصیل پیش کی ہے۔اس سے اس ضابطے کے مزید حکیمانہ پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔شریعت نے جہاں حقداروں کے حصوں کا تعین کردیا وہاں پر غلاموں، ناحق قتل عمد اور شبہ عمد کا ارتکاب کرنے والوں ،اختلاف مذہب،اختلاف مملکت،ارتداد اور اشتباہِ وارث و مورث کی صورت میں جائز حصہ داروں کو بھی وراثت سے محروم کردیا ہے۔

اسلامی معاشی اصول اور فقر وافلاس کا خاتمہ

مسلمانوں کا پختہ ایمان ہے کہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں جس کے بارے میں ان کے رسول مبارک حضرت محمد انکے لیے رہنمائی ،نمونہ عمل یا قاعدہ وضابطہ یا اصول نہ چھوڑا ہو۔اسلامی نکتہ نظر غربت میں کمی اور اس کے خاتمے کے لیے تین مختلف اور ممتاز قسم کے اقدامات اٹھاتا ہے۔ مثبت اقدامات(positive measures)،حفاظتی اقدامات (preventive measures)

مثبت اقدامات(positive measures)

جہاں تک مثبت اقدامات کا تعلق ہے اسلام غربت و افلاس اور فقر وفاقہ کے خاتمے کے لیے تین مختلف طرح کے مثبت اقدامات اٹھانے کا اعلان کرتا ہے۔

---

[1] معیشت واقتصاد کا اسلامی تصور، حکیم محمود احمد ظفر، ص:598،597

(i) آمدنی میں ترقی وبڑھوتری (Income Groath)

(ii) آمدنی کی فعال، مناسب اور عادلانہ تقسیم (Functional Distribution of Income)

(iii) معاش کے متنوع اور مساوی مواقع (Equal Opportunity)

(i) آمدنی میں ترقی وبڑھوتری (Income Groath)

اسلام افراد کو اپنی آمدن حلال ذرائع سے کمانے اور پھر اس کو میانہ روی کے ساتھ خرچ کرنے کی ترغیب و تلقین دلاتا ہے، اور انفرادی واجتماعی سطح پر اعتدال پسند رویے کو پسندیدہ قرار دیتا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ چونکہ یہ رویہ انفرادی اور مجموعی معیشت دونوں کے لئے ضروری بچت کا ماحول اور مواقع پیدا کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اسلام ایک خاص حد سے آگے مزید دولت کو کمانے پر پابندی لگاتا ہو بلکہ اسلام کہتا ہے کہ تمام مالی حقوق کو ادا کیا جائے اور فاضل مال کو انسان اپنی اور اپنے علاوہ دوسرے افراد کی بھلائی اور اچھائی کے لیے استعمال کرے۔ اسلام مالی گھٹن اور تنگی و محتاجی کو پسند نہیں کرتا لیکن مالی فراخی کو پسند کرتا ہے بلکہ چاہتا ہے کہ ہر شخص اپنے پاؤں پر کھڑا ہو نیز اپنے خاندان کے لیے مناسب اور بہترین وسائل زندگی مہیا کرے [1]۔ اس مقصد کے لیے انسان کو ان تمام کاموں کی طرف رغبت دلاتا ہے جو اس کو مالی آسودگی دے سکتے ہیں اور اس کی محتاجی و فقر کو ختم کرسکتے ہیں۔

یہاں پر بعض اسلام مخالف عناصر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح طبقاتی تفریق پیدا ہو سکتی ہے کہ صرف باصلاحیت افراد کے پاس ہی پیسہ مرکوز ہو کر رہ جائے گا۔ لیکن اسلام نے ایک جامع اقتصادی نظام دیا ہے جس میں زکوٰۃ و صدقات، عشر و خمس اور انفاق فی سبیل اللہ کا نظام پیسے کا ارتکاز چند مخصوص ہاتھوں سے نکال کر معاشرے میں نسبتاً کم صلاحیت کے حامل و کمزور اور مستحق افراد تک بھی باعزت طریقے سے معاشرتی مساوات کے تحت پھیلاتا ہے۔

عمومی مشاہدے کی بات ہے کہ کسی بھی قوم یا ملک کی ترقی، دفاعی و فوجی طاقت کی بنیاد اور اس کے سیاسی استحکام کی لازمی شرط معاشی تعمیر ہے۔ لہٰذا معاشی واقتصادی ترقی غربت کے خاتمہ اور خود کفالت کے لئے ضروری ہے۔ دینِ الٰہی اس لیے بھی مالی حد و قید کا تعین نہیں کرتا اور مالی فراخی کے لیے تمام اسباب کو جائز طریقے پر استعمال کرنے کو پسند کرتا ہے، چونکہ تمام افراد پر ایک خاص حد کے بعد مالی واجبات کی ادائیگی لازم ہو جاتی ہے لہٰذا جتنے زیادہ افراد مالی آسودگی کی حالت تک پہنچیں گے اتنا ہی زیادہ تعداد میں مالی حقوق کی ادائیگی ہوگی۔ جس کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ محروم طبقے کے ساتھ مالی تعاون عمل میں لایا جاسکے گا۔ اور جتنے زیادہ

---

[1] مادیت و کمیونزم، ناصر مکارم شیرازی، دارالثقافہ الاسلامیہ، کراچی، طبع اول 1987ء، ص:58

افراد کے ساتھ تعاون کی صورت میں اور مالی واجبات کی ادائیگی کی صورت میں تعامل ہو گا اتنے زیادہ افرا کو مالی محتاجی اور فقر و افلاس کی حالت سے باہر نکالا جا سکتا ہے۔لہذا فقر و افلاس کے خلاف لڑی والی جنگ کا ایک مثبت پہلو اس صورت میں سامنے آسکتا ہے کہ افراد کو ان کی معیشت میں

اضافے اور بڑھوتری کی نہ صرف اجازت ہو بلکہ ان کی حوصلہ افزائی بھی کی جارہی ہو تا کہ ان کے مالی واجبات کی صورت میں زیادہ سے زیادہ غرباء و فقراء کی مدد کی جا سکے اور یہی کچھ اسلام چاہتا ہے۔[1]

ان گذارشات کی روشنی میں انسان اپنی روزی کمانے کے لیے (دائرہ شریعت میں رہ کر) جو اور جیسی بھی محنت کرے، خواہ وہ محنت جسمانی ہو یا دماغی، اسلام اس کی اجازت دیتا ہے اور اجازت ہی نہیں دیتا ہے بلکہ محنت کرنے پر ابھارتا ہے، جو لوگ اپنا پسینہ بہا کر اپنی روٹی حاصل کرتے ہیں ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان لوگوں کو ناپسند کرتا ہے جو بغیر محنت کے دوسروں کے سہارے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ خصوصیت سے جسمانی اور معمولی محنت کے کام کرنے والوں کو جنہیں آج کی مہذب دنیا میں بھی معاشرہ میں وہ بلند مقام حاصل نہیں ہے جو دوسرے طبقوں کو حاصل ہے، اسلام ان کو وہی مقام عطا کرتا ہے جو مملکت کی بڑی سے بڑی شخصیت کو حاصل ہوتا ہے اور یہ حق ان کو محض نظری اور قانونی طور پر نہیں دیا گیا ہے بلکہ اسلام کے اصلی نمائندوں نے اپنے عمل اور اپنی سیرت سے اس کا ثبوت دیا ہے۔ انبیاء کرام جو اپنے اخلاق و کردار اور عزت و شرافت کے اعتبار سے پوری انسانیت کا جوہر ہیں انہوں نے خود محنت اور مزدوری کی ہے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی روزی کمائی ہے، دوسروں کی بکریاں چرا کر اور گلہ بانی کر کے اپنی قوت لایموت کا سامان کیا ہے۔

البتہ اتنا ضرور ہے کہ اسلام نے محنت کو بے لگام نہیں چھوڑ دیا۔ وہ پسینہ، محنت اور مزدوری میں آزادی کا قائل ہے مگر اس کے ساتھ ایسی محنتوں پر وہ پابندی بھی لگاتا ہے جو معاشی یا اخلاقی حیثیت سے معاشرہ کے لیے مضر ہوں۔

دیکھا جائے تو اسلام انسان کو پائیدار اور مستقل اخلاقی قدریں دیتا ہے اور ان قدروں کی پامالی وہ کسی حالت میں پسند نہیں کرتا چونکہ وہ معاش کو بھی ان قدروں کا پابند بنانا چاہتا ہے اس لیے وہ نہ تو مغرب کی بے قید معیشت اور محنت کی اس بے قید تعریف کو تسلیم کرتا ہے جس کے مطابق جس کسی کام سے بھی، چاہے وہ اخلاقی حوالے سے معیوب و ممنوع ہی کیوں نہ ہو، آدمی کو مادی یا غیر

---

[1] Islam and the Economic Challenge, M. Umer Chapra, The Islamic Foundation, Leicester, U.K., p.426.

مادی معاوضہ حاصل ہو وہ محنت بار آور ہے اور وہ کام بھی ٹھیک ہے۔ اور نہ اشتراکیت کی بے اخلاقی جبری محنت کو پسند کرتا ہے بلکہ اسلام صرف اس محنت کو بار آور محنت کہتاہے جو اجرت ومنفعت کے اعتبار سے آزاد ہو مگر اس کی آزادی اخلاقی حدود کے اندر رہو۔

تعلیماتِ اسلامی میں اسلام نے رزق حلال اور محنت سے کمائی میں بڑی خیر وبرکت کی نوید دی ہے۔ اور ہر مرحلے پر محنت کی ہمت افزائی کی ہے اور دستِ سوال دراز کرنے سے روک کر محنت کی راہ پر لگایاہے۔ انسان اگر محنت سے کسبِ معیشت نہیں کرے گا اور محنت سے جی چرائے گا تو نتیجۃً وہ ضروریات زندگی کے لئے دوسروں کا دستِ نگر بن جائے گا اور اپنی عزت و آبرو سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا تھا

:((وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ، فَيَحْتَطِبَ عَلَى ظَهْرِهِ خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَأْتِيَ رَجُلًا، فَيَسْأَلَهُ أَعْطَاهُ أَوْ مَنَعَهُ))[1]

ترجمہ: تم میں سے ایک شخص اپنی رسی پکڑے اور اپنی پیٹھ پر لاد کر لکڑیوں کا گٹھا لائے، پھر اسے بیچ کر پیٹ پالے اور اپنے چہرے کو لوگوں سے سوال (کی ذلت) کرنے سے بچائے (یہی بہتر ہے کیونکہ لوگوں کا کیاہے) اسے کچھ دیں یا نہ دیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے سوال اضطراری حالت کے بغیر جائز نہیں۔ سید المرسلین ﷺ نے صرف قولاً محنت کی ہمت افزائی ہی نہیں کی بلکہ ایک عرصہ تک محنت ومشقت سے رزق حلال حاصل کر کے دنیاوالوں کے سامنے ایک نمونۂ عمل پیش کیا اور بتایا کہ محنت ہی شعار انسانیت ہے۔

کچھ سطحی فکر کے لوگوں میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ دین صرف نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ کا نام ہے باقی چیزیں دین سے خارج ہیں۔ یہ اندازِ فکر غلط اور دینی مزاج کے منافی ہے۔ وہ تمام امور جو شریعت کے احکام و حدود کے مطابق ہوں، چاہے وہ چھوٹے ہو یا بڑے اہم ہو یا غیر اہم انفرادی ہو یا اجتماعی، وہ دین ہے، کار ثواب ہے اور باعث برکت ہے۔ چنانچہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کسب معاش کرنا اور شرعی حدود میں رہ کر اس کے لئے جدوجہد کرنا بھی دین ہے، عین عبادت کا کام ہے اور اس پر ثواب بھی مترتب ہوتا ہے۔

[1] صحیح بخاری، محمد بن اسماعیل بخاری، کتاب الزکاۃ، باب الاستعفاف عن المسئلۃ، حدیث رقم 1470، ص 2/123

﴿هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاکِبِهَا وَکُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖط وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ﴾[1]

ترجمہ: وُہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو نرم و مسخر کر دیا، سو تم اس کے راستوں میں چلو پھرو، اور اُس کے (دیے ہوئے) رِزق میں سے کھاؤ، اور اُسی کی طرف (مرنے کے بعد) اُٹھ کر جانا ہے۔

چونکہ کسبِ معاش کرنے اور دولت پیدا کرنے کا ایک اہم اولین بنیادی اور کلیدی ذریعہ یا عامل انسان کی ذاتی محنت بھی ہے جس کے بغیر خام حالت میں پڑے ہوئے بہت سے خزائنِ الٰہی قابل منفعت نہیں بن سکتے۔ لہذا اس پر محنت و مشقت کرنا اور ان کو قابلِ استفادہ بنانے کے لیے جدوجہد اور مزدوری کرنا عین عبادت ہے اور اللہ کا پسند کیا ہوا کام ہے۔ رسول اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((إن الله تعالى يحب أن يرى عبده تعبا في طلب الحلال))[2]

ترجمہ: بے شک اللہ پسند ماتا ہے کہ اپنے بندے کو حلال روزی کی تلاش میں تھکا ہوا دیکھے۔

ہمارے معاشرے میں غربت و افلاس، تنگ دستی اور آمدنی و پیداوار میں کمی کا ایک سبب اس ذریعہ دولت یعنی محنت سے جی چرانا ہے۔ یہ محنت سے جی چرانا کچھ تو ذاتی سستی، کاہلی اور لاپرواہی کے باعث ہوتا ہے مگر زیادہ تر اس کا باعث ذریعہ معاش کے طور پر کوئی پیشہ اختیار کرنے اور مزدوری کو معیوب سمجھنا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں عقلاً و نقلاً انسان کے لئے نقصان دہ ہیں۔ مقام غور ہے کہ اگر خالق کائنات نے انسان کے ساتھ ایک چھوٹا پیٹ لگایا ہے تو اس نے اس پیٹ کو بھرنے کے لئے دو ہاتھ، دو پاؤں، جسمانی قوت، سوجھ بوجھ اور دوسری مخلوق کے برعکس اسے عقلی و دماغی صلاحیتیں بھی عطا فرمائی ہیں جنہیں کام میں لاکر زمین میں پھیلے ہوئے بے شمار رزق الٰہی کو بآسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

معیار شرافت اور سماجی قدریں بدل جانے کی وجہ سے آج کل معاشرے میں محنت مزدوری کرنے والے' اہل ہنر کو دوسرے درجے کا شہری سمجھا جاتا ہے اور ان کے مسائل واحوال سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے۔ ان کی محنت و مشقت کے بل بوتے

---

[1] سورۃ الملک: 15/67

[2] فیض القدیر، علی بن زین العابدین المناوی، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، مصر، طبع اول، 1356ھ، 26/2

پر عیاشی کرنے والے دولت مند لوگ انہیں کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے اور مزدوری کے انتظار میں سڑکوں پر بیٹھی ہوئی اس بے ضرر اور مسکین مخلوق کو دیکھ کر اس طرح منہ پھیر لیتے ہیں جیسے وہ انسان نہ ہوں۔

یہ انداز خسروانہ اس لئے ہے کہ انہیں محنت کی عظمت اور اللہ کے ہاں اس کی قدر و قیمت کا پتہ نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں یہ بھوک سے مرجھائے ہوئے چہرے' پسینے میں شرابور کالے بدن' چلچلاتی دھوپ میں ہتھوڑا چلانے والے کھردرے ہاتھ اور زندگی کی آسائشوں اور بنیادی ضرورتوں سے محروم یہ لوگ کسی عزت واحترام کے مستحق نہیں کیونکہ ان کے پاس دولت کے انبار اور عیش وعشرت کے وہ لوازمات نہیں جو ہمارے پاس فراوانی کے ساتھ ہیں۔

اللہ کے ہاں عزت وعظمت اور قدر و منزلت کا یہ بے معنی اور دنیا دارانہ معیار نہیں ہے۔ اس کے ہاں قابل احترام اور عزت وآبرو والا وہ شخص ہے جو غیرت مند، باوقار، محنتی اور خود دار ہے اور کسی کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنے ہاتھوں سے کما کر کھاتا ہے اور اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا گوارا نہیں کرتا[1]۔ دوسروں کی محنت پر شاہ خرچیاں کرنا اور ان کے حقوق غصب کرکے' اپنے محلات اور عشرت کدے تعمیر کرنا اور انہیں محنت کا غیر منصفانہ معمولی معاوضہ دے کر ٹرخا دینا اور اپنی آسائشوں کی سیج سجانا غیر اخلاقی وغیر شرعی رویہ ہے۔

اس رویے کی بجائے اسلام ذاتی محنت و مشقت کا قائل ہے اور اسی پر یقین کرنا سکھاتا ہے۔اس بارے میں فرمان رسول ہے کہ:

((من طلب الدنيا حلالا استعفافا عن المسألة وسعيا على أهله وتعطفا على جاره بعثه الله يوم القيامة ووجهه كالقمر ليلة البدر))[2]

ترجمہ: ”جس نے حلال راہ سے دنیا طلب کی تاکہ دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بچ سکے اور اپنے اہل وعیال کو کما کر کھلا سکے اور اپنے پڑوسی کی بھی مدد کرسکے۔ وہ اللہ کے حضور اس شان سے آئے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہوگا“۔

محنت کرنے والے پیشہ ور اور چھوٹے چھوٹے کاروبار سے منسلک لوگ عام طور پر اتنے خوش حال نہیں ہوتے کہ اپنی ہر ضرورت پوری کرسکیں اس لئے وہ دنیا داروں کی نظر میں نہیں جچتے۔ وہ انہیں کم نصیب اور بے حیثیت سمجھتے ہیں اور حقیر نظروں

---

[1] محاضراتِ معیشت وتجارت، ڈاکٹر محمود احمد غازی، ص141

[2] الکتاب المصنف فی الاحادیث والآثار (مصنف ابن ابی شیبہ)، ابو بکر بن ابی شیبۃ، مکتبۃ الرشد، الریاض، طبع اول 1409ء، 4/467

سے دیکھتے ہیں اور اپنی کوتاہ نظری یا کم ظرفی اور کمینگی کی وجہ سے کوئی سماجی مقام دینے کیلئے تیار نہیں ہوتے مگر یہی لوگ اپنی محنت و مشقت اور ہنر مندی کے ساتھ حلال کمائی کرنے کی وجہ سے اتنے معزز ہوتے ہیں کہ اللہ ان سے محبت فرماتا ہے اور پسینے میں شرابور ' بدبودار اور میل کچیل میں اٹا ہونے کے باوجود ان سے نفرت نہیں فرماتا بلکہ ان کے اس جذبہ عمل اور جوش وخروش کے ساتھ محنت کرنے کی وجہ سے انہیں اپنا قرب عطا فرماتا ہے۔ وجہ یہ کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل میں حلال وطیب کمائی کے حصول کے لیے کوشاں ہوتے ہیں اور اپنی غیرت وخودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

(ii) آمدنی کی فعال، مناسب اور عادلانہ تقسیم (Functional Distribution of Income)

اسلامی اقتصادی تعلیمات کے مطابق مال و دولت کو اپنی اخروی زندگی کے لیے وسیلہ بنایا جائے اور اس کے ذریعہ آخرت کی زندگی کی کامیابی اور فلاح کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ البتہ اسلام دنیا میں رہ دنیاوی ضروریات اور حاجات دنیا کو اپنی جائز حد میں رہتے ہوئے پورا کرنے کی نہ صرف اجازت دیتا ہے بلکہ تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ ارشاد پروردگار ہے:

﴿وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ﴾[1]

ترجمہ: اور جو (مال) تم کو خدا نے عطا فرمایا ہے اس سے آخرت کی بھلائی طلب کیجئے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلائیے اور جیسی خدا نے تم سے بھلائی کی ہے (ویسی) تم بھی (لوگوں سے) بھلائی کرو۔

(iii) معاش کے متنوع اور مساوی مواقع (Equal Opportunity)

اسلامی نقطۂ نظر سے زمین اور اس کی سب چیزیں اللہ نے نوعِ انسانی کے لئے بنائی ہیں، اس لئے ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس حق میں تمام انسان برابر شریک ہیں، کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ نہ کسی کو اس معاملے میں دوسروں پر ترجیح حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی شخص نسل یا طبقے پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہو سکتی کہ وہ رزق کے وسائل میں سے بعض کو استعمال کرنے کا حقدار ہی نہ رہے، یا بعض پیشوں کا دروازہ اس کے لیے بند کر دیا جائے۔ اسی طرح ایسے امتیازات بھی شرعاً قائم نہیں ہو سکتے جن کی بنا پر کوئی ذریعہِ معاش یا وسیلۂ رزق کسی مخصوص طبقے یا خاندان کا اجارہ بن کر

---

[1] سورة القصص:28/77

رہ جائے۔ اللہ کی بنائی ہوئی زمین پر اس کے پیدا کیے ہوئے وسائلِ رزق میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا سب انسانوں کا یکساں حق ہے اور اس کوشش کے مواقع سب کے لیے یکساں کھلے ہونے چاہییے۔[1]

البتہ اس بات کا فیصلہ کہ اس کو کتنا کمانا چاہیے اور اس کی حد کیا ہے، اس کی محنت، قابلیت اور کام کرنے کی صلاحیت پر رکھا گیا ہے۔ جتنا وہ کام کرے گا اسی حساب سے معیشت میں اس کا درجہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَى بَعْضٍ فِي الْرِّزْقِ﴾[2]

ترجمہ: اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق (کے درجات) میں فضیلت دی ہے (تاکہ وہ تمہیں حکمِ انفاق کے ذریعے آزمائے)۔

پس اسلامی تعملیات میں پیش کیے گئے معاشی عدل وانصاف کے نظرے سے مراد یہی ہے کہ وسائل رزق اور معیشت پر چند افراد کی اجارہ داری نہ ہو بلکہ معاش کی راہیں سب کے لیے یکساں

طور پر کھلی ہوں۔ اور ہر انسان کو ان سے استفادہ کرنے اور فائدہ اٹھانے کے مساوی حقوق میسر ہوں اور ان کے اس حق کے حصول میں دیگر افرادِ معاشرہ کی جانب سے رکاوٹیں اور بندشیں پیدا نہ کی جائیں۔ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلاً مَّا تَشْكُرُونَ﴾[3]

ترجمہ: اور بیشک ہم نے تم کو زمین میں تمکّن و تصرّف عطا کیا اور ہم نے اس میں تمہارے لئے اسبابِ معیشت پیدا کئے، تم بہت ہی کم شکر بجالاتے ہو۔

اسلام نے ایک جانب فرد کے سرمایہ میں اس کی ملکیت کو تسلیم کیا تو دوسری جانب اس پر قانونی واخلاقی پابندیاں عائد کیں، تاکہ توازن بر قرار رہے، نیز مزدوروں اور سرمایہ داروں میں تقسیم عمل و نفع کی ایک منصفانہ راہ پیدا کی، جس سے دونوں طبقات کا بھلا ہوتا ہے، اور کہیں بھی ناانصافی کا کوئی شائبہ بھی باقی نہیں رہتا۔ اس طرح اس نظام میں " فرد و معاشرے "کی مصلحتوں کا ایک توازن قائم کیا گیا ہے، اگر کسی جگہ فرد کی رعایت سے جماعت کی مصلحت فوت ہوتی ہو تو وہاں جماعت و معاشرے کی رعایت کو اہم مانا گیا ہے۔

---

[1] اسلامی معاشیات، سید مناظر احسن گیلانی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص 33

[2] سورۃ النحل: 17/16

[3] سورۃ الاعراف: 10/7

رائج معاشی نظاموں میں اقتصادیات کے اخلاقی پہلو کی کمی

موجودہ رائج معاشی نظام جن بنیادوں پر قائم ہیں ان سے مادہ پرستی، آزادروی اور افادیت پسندی کی نفی نہیں کی جاسکتی۔ یہ وہ اقدار ہیں جن سے پر سکون اور عادلانہ معاشرہ کبھی بھی وجود میں نہیں آسکتا۔ جب افراد تمام اخلاقی حدود سے آزاد ہو کر ذاتی نفع کی غرض سے تعامل کریں گے تو یہ یقیناً یہ سوچ اور انداز فکر خود غرضی اور خود پرستی کر جنم دے گا۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں ہمدردی، اخوت اور خیر خواہی کے جذبات ختم کر کے باہمی کشمکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ آزادروی کی پیدا کردہ بے قیدی اور بے راہ روی معاشرتی انضباط کی قدروں کو تہس نہس کر کے رکھ دیتی ہے اور ایک مادر پدر آزاد معاشرے کی بنیاد رکھ دیتی ہے جہاں نہ روایات و اقدار کی کوئی پرواہ ہوتی ہے اور نہ ہی اخلاقیات کا کوئی لحاظ، بلکہ ایسی فضا میں معاشی ومالی مسابقے کا ماحول فروغ پاتا ہے جس میں افراد کا ہم و غم صرف اور صرف اقتصادی و معاشی امور ٹھہرتے ہیں اور زندگی کی ہر حرکت انہی کے تابع ہو جاتی ہے۔ ایسی سوچ اور عمل کے نتیجے میں مالی و معاشی حوالے سے کمزور افراد پس کر رہ جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں افادیت پسندی افراد کو اجتماعی مفاد سے بے نیاز کر کے خویش پروری اور لذت پرستی کا اسیر بنا دیتی ہے۔ ایسے خود سر، خود پسند اور خود غرض انسانوں سے تشکیل پانے والا معاشرہ کثرت وسائل کے باوجود معاشی مشکلات و مصائب سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔[1]

خواہشات بے پناہ ہیں اور انسان کو خواہشات کی تکمیل کے لیے بنیادی طور پر جس چیز کی ضرورت ہے وہ سرمایہ ہے۔ سرمایہ ہی وہ بنیادی عنصر ہے جس کے ذریعے تمتع فی الارض اور تمتع فی الدنیا کے امکانات وقوع پذیر ہوسکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ عقلیت مابعد الموت سے بحث نہیں کرتی ہے بلکہ اس کے نزدیک موت ہی اختتامِ زندگی ہے۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ عقلیت میں زیادہ سے زیادہ سرمائے کا حصول اسی دنیا کو جنت بنانے کے سوا کچھ نہیں، اسی لیے ایک سرمایہ دار انسان کی ساری تگ ودو اور کدوکاوش کا مرکزی نکتہ سرمایہ ہوتا ہے۔[2]

مادی سوچ کے حامل نظام ہائے معیشت اپنی فکری اساس کے زیر اثر چونکہ اخلاقی اقدار کی کارفرمائی سے یک قلم عاری ہیں اس لیے کاروباری حضرات منافع کے لیے تمام حربوں اور حیلوں کو جائز سمجھتے ہیں۔ چونکہ منافع کے حصول کے لیے حلال و حرام کی کوئی تفریق نہیں لہذا اس سبب سے معاشرے میں بہت سی اخلاقی برائیاں پھیلتی ہیں، اس لیے کہ زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کا محرک سے اکثر لوگوں کے سفلی اور غیر اخلاقی جذبات کو اپیل کر کے ان کی غلط خوہشات کی تسکین ہوتی ہے جس کی وجہ سے

---

[1] معیشت واقتصاد کا اسلامی تصور، حکیم محمود احمد ظفر، ص78

[2] محمد احمد حافظ، سرمایہ دارانہ نظام کی شرعی حیثیت، مشمولہ "اسلام یا جمہوریت"، کتاب محل، 2016، ص۷۶،۷۷

معاشرے میں اخلاقی بگاڑ پھیلتا ہے۔ منافع کے حصول میں دی گئی آزادی کے ضرر رساں اثرات یہاں تک ہی پھیلے ہوئے نہیں بلکہ ذاتی منافع کے محرک پر حلال و حرام اور انسانی اخلاقی پابندیاں نہ ہونے کی وجہ سے سود، قمار، سٹہ بازی اور ذخیرہ اندوزی جیسی بیماریاں آئے روز پھیلتی جارہی ہیں اور معیشت کے فطری توازن میں بگاڑ پیدا کررہی ہیں۔

رائج نظام ہائے اقتصاد کے اصولوں میں انسانی زندگی کی وحدت کا تصور نظر انداز کردیا گیا ہے۔ دراصل انسانی زندگی بے شمار پہلوؤں مثلاً روحانی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، قانونی، سیاسی اور نفسیاتی پہلوؤں کا مجموعہ ہے۔ لیکن اقتصادی نظام کے نام پر یہاں بھی زندگی کی اس وحدت کو پارہ پارہ کردیا گیا ہے اور ہر علم نے کوشش کی ہے کہ زندگی کی پوری اکائی کو صرف اپنے محدود نقطہ نظر سے دیکھے، اُس کی تعبیر کرے اور اُس کو بدلنے کی کوشش کرے۔ معاشیات میں بھی زندگی کے باقی تمام پہلو، خواہ اُن کا تعلق نفسیات سے ہو، اخلاقیات سے ہو، سیاست سے ہو، معاشرت سے ہو یا ادارات سے ہو نظر انداز کیے گئے تو اس کے نتیجے کے طور پر ایک غیر فطری نظام بن کر سامنے آیا ہے جس میں صلاحیت (Efficiency) اور عدل (Equity) میں توازن برقرار نہیں رکھا گیا۔ بلاشبہ انسان کی معاشی زندگی میں کارکردگی، اہلیت، پیداآوری (Productivity) اہم ہیں، جسے معاشیات کی اصطلاح میں efficiency کہتے ہیں۔ لیکن efficiency سب کچھ نہیں ہے۔ بلکہ صلاحیت یعنی (Efficiency) کے ساتھ ساتھ عدل، انصاف، حقوق کی پاسداری اور اس اہلیت اور صلاحیت کا ایسا استعمال جس کے نتیجے کے طور پر انسانی معاشرہ بہتر ہوسکے، ضروری ہے۔ محض دولت کی فراوانی مطلوب نہ ہو بلکہ تمام انسانوں کی خوشحالی مطلوب ہو۔ تو اصل مسئلہ یہ ہے کہ صلاحیت (Efficiency) اور عدل (Equity) ایک دوسرے سے کٹ گئے ہیں، جس کی نتیجے میں صرف وہ لوگ جن کے ہاتھ میں مالی قوت تھی، جو ٹیکنالوجی پر حاوی تھے، وہ اس پورے نظام کے کرتادھرتا ہوگئے۔ جس سے نظام کے اندر بے شمار خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں۔[1]

---

[1] عالمی معاشی بحران اور اسلامی معاشیات، پروفیسر خورشید احمد (آن لائن مضمون:

https://www.urduweb.org/mehfil/threads/73140 (retrived at 24-11-2016)

باب پنجم

فقر کا حل سرمایہ دارانہ نظام کی روشنی میں

فصل اول: فرد کی معاشی آزادی کا تصور

فصل دوم: ریاست کی عدم مداخلت

فصل سوم: ذاتی منافع کا محرک

فصل چہارم: صارف کی حکمرانی

فصل پنجم: ذاتی کاروبار کے مواقع اور عوامی آگاہی فراہم کرنا

سرمایہ دارانہ نظام

سرمایہ داری نظام جس کو فری مارکیٹ اکانومی بھی کہا جاتا ہے، جاگیر داری کے نظام کے زمین بوس ہونے کے فوراً بعد سے لے کر آج تک کا مغرب کا نمایاں ترین نظام ہے جس کا پوری مغربی دنیا پر مکمل طور پر غلبہ ہے۔ اگرچہ سرمایہ داری کی موجودگی زمانہ قدیم ہی سے ہے اور اس کا وجود قدیم انسانی تہذیبوں اور آثار میں صاف پایا جاتا ہے، اسی طرح قرون وسطی میں اس کی ترقی و پھیلاؤ واضح شکل میں نظر آتا

ہے لیکن بطور نظام، سرمایہ داری کا وجود بظاہر سولہویں صدی سے ہی پڑا۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام کی اصل ترقی سولہویں ، سترہویں اور اٹھارویں صدی میں کپڑے کی انگریزی صنعت کے عروج اور پھیلاؤ کے ساتھ شروع ہوئی۔ یہاں سے سرمایہ دارانہ نظام اپنی گذشتہ شکل سے ممتاز جس نکتے کی وجہ سے ہوا وہ نکتہ میناروں اور مندروں پہ روپے پیسے کی کھپت کی بجائے پیداوار کی مقدار میں اضافہ پر مبنی تھا تاکہ پیداوار میں اضافہ کیا جاسکے۔[1]

سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں جملہ حقوق، معاشی آزادی، مسابقت و مقابلہ کی فضا، منافع خوری ، حکومت و ریاست کی عدم مداخلت، نجی ملکیت اور ذاتی منافع کا محرک اس نظام کی وہ خصوصیات ہیں جن کو اس نظام کے ارکان یا بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ یہی خصوصیات اس نظام کی پہچان ہیں۔

ایک آئیڈیل سرمایہ دارانہ نظام دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں کیونکہ سرمایہ دارانہ ممالک نے بھی لازمی کچھ چیک لگائے ہوتے ہیں جن کے مختلف مقاصد ہوتے ہیں مثلاً ملک چلانے کے لئے سیاستیں بشمول خارجہ پالیسیاں اور اخراجات کے اہداف وغیرہ (اس کے لئے برامداد وغیرہ کے چیکس وغیرہ شامل ہیں)۔ اسی طرح غریب کے فائدے اور فراڈ کے خاتمے کے لئے کچھ قوانین مثلاً مناپلی آرڈیننس وغیرہ۔ اب ہمارے ہاں جسے سرمایہ دارانہ نظام کہا جاتا ہے اسکا اطلاق ایسے نظام پر ہے جو آئیڈیل نظام سے قریب تر ہو۔

کہا گیا ہے کہ ”سرمایہ داری یا سرمایہ دارانہ نظام یا سرمایہ دارانہ تہذیب سے ہماری مراد حقیقی ترقی اور قانونی اداروں کے ارتقاء کا وہ مرحلہ ہے جس میں محنت کار، آلات پیداوار کی ملکیت کے حق سے اس انداز سے دست بردار ہو جاتے ہیں کہ ان کی حیثیت محض اجرت کاروں کی رہ جاتی ہے۔ ان کی بقاء، تحفظ اور شخصی آزادی قوم کے اقلیتی گروہ کی خواہش اور صوابدید پر انحصار

---

[1] Encyclopaedia Britannica, 1964,Vol.9, pp.839-845

کرنے لگتی ہے۔ یہ گروہ اپنے قانونی حق ملکیت کی رو سے زمین، مشینا ور قوت محنت کے اداروں پر کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں اور ان کا بنیادی مقصد زیادہ سے زیادہ انفرادی مفاد کا حصول ہوتا ہے۔"[1]

اس نظام کی بنیادی اور نمایاں خصوصیات میں ذاتی ملکیت کا استحقاق، مسابقت، ذاتی منافع کا محرک، نظام اجرت، حکومت کی عدم مداخلت اور قیمتوں کی میکانیت جیسے اہم پہلو شامل ہیں جو اس نظام کی بنیاد اور ارکان سمجھے جاتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں سرمایہ کاری اور اس سے متعلق تمام فیصلے عوامل پیدائش کے مالکین اور سرمائے کے مراکز کی طرف سے کیے جاتے ہیں جب کہ قیمتوں کا تعین بازار میں ہونے والی مسابقتی کیفیت کے حساب سے ہوتا ہے۔[2]

ماہرین اقتصادیات اور مؤرخین نے سرمایہ دارانہ نظام کو مختلف عنوانات اور متعدد پہلوؤں سے دیکھا ہے اور عملی طور پر اس کی کئی اقسام کو بھی بیان کیا ہے جس میں فری مارکیٹ سرمایہ دارانہ نظام، فلاحی سرمایہ دارانہ نظام اور ریاستی سرمایہ دارانہ نظام(State-sanctioned social policies) شامل ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کے کئی ڈھانچے متصور ہو سکتے ہیں جو کہ منڈیوں میں مقابلہ کی نوعیت، حکومتی ریگولیشن اور مداخلت کا کردار اور ریاست کی ملکیت کا دائرہ کار کے بدلنے اور مختلف ہونے کی وجہ سے سرمایہ دارانہ نظام کے کئی ڈھانچے یا اشکال متصور ہو سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام کی پائے جانے والی موجودہ اشکال میں سے سب سے زیادہ مخلوط سرمایہ دارانہ معیشتیں ہیں، کہ جن میں آزاد منڈیوں کے عناصر کے ساتھ حکومتی عناصر اور حکومتی پالیسیاں واثر و رسوخ بھی شامل ہو جاتے ہیں، البتہ بعض صورتوں میں ان کے ساتھ معاشی منصوبہ بندی کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔[3]

سرمایہ داری نظام انسان کو قائم بالذات اور اسکی آزادی کے فروغ کو عقل کے بدیہی مقصد کے طور پر مان لینے کا نام ہے۔ اس نظام کی سوچ اور فلسفے کے مطابق انسان اصولاً آزاد ہے، ان معنی میں کہ وہ اپنے اندر یہ خواہش اور صلاحیت رکھتا ہے کہ قائم بالذات (self-determined) بن جائے، لیکن عملاً وہ آزاد نہیں کیونکہ اسکی آزادی کو مادی، سماجی اور قانونی ہر تین طرح کی قوتیں محدود کرتی ہیں۔ سرمایہ داری ان مادی، سماجی اور قانونی پابندیوں کے خلاف جدوجہد کا نظام ہے جو ارادہ انسانی کی متصور آزادی پر لگی ہوئی ہیں یا لگائی گئی ہیں۔

---

[1] اسلام اور جدید معاشی نظریات، سید ابوالاعلی مودودی، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، اشاعت ششم 1969ء، ص:77

[2] Comparing Economic Systems, Andrew S. Zimbalist, Howard J. Sherman, Stuart Brown Harcourt Brace Jovanovich, Harcourt College Publications,1989, p.6-7

[3] Political Economy: the Contest of Economic Ideas, Frank Stilwell, First Edition. Oxford University Press. Melbourne, Australia. 2002, p.97

مثلاً مادی سطح پر آج انسان نظام شمسی سے باہر نہیں جا سکتا، زلزلے یا طوفان کو نہیں روک سکتا، بوڑھا ہو جاتا ہے، موت کا شکار ہو جاتا ہے، ماں باپ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا وغیرہ۔ انسانی ارادے کی تکمیل میں حائل ان مادی رکاوٹوں کو کم کرنے کیلئے سرمایہ داری نے جو علمی نظام وضع کیا اسے ٹیکنو سائنسز (techno-sciences) کہتے ہیں جنکا مقصد کائنات پر ارادہ انسانی کے تسلط کو ممکن بنانے کی پیہم جدوجہد کرنا ہے۔ یہ تنویری علمیت (Modernization) اس جنون کو پروان چڑھاتی ہے کہ انسان کو اسکے ارادے سے ماوراء ہر کائناتی قوت سے آزاد کرانا ممکن ہے۔

اسی طرح سماجی سطح پر بھی وہ رکاوٹوں کا شکار ہے جس کی سب سے بڑی شکل روایتی تعلقات کے تانے بانے ہیں۔ تنویری فکر (Modernization) کے خیال میں ان معاشرتی حدبندیوں کی وجہ یہ ہے کہ یہ معاشرے حصول آزادی کے سواء کسی دوسرے مقصد (مثلاً حصول رضائے الٰہی) کیلئے قائم کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا اس کا حل انہوں نے مارکیٹ یا سول سوسائٹی کی صورت میں پیش کیا، جہاں تعلقات توڑنے اور جوڑنے کی بنیاد فرد کی ذاتی اغراض کا حصول ہوتا ہے۔ ان مفکرین کے نزدیک سول سوسائٹی وہ فریم ورک فراہم کرتی ہے جس کے اندر فرد جو چاہنا چاہے چاہ سکتا اور اسے حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ دوسرے کے حق خود ارادیت کو چیلنج نہ کرے۔ ایسا معاشرتی نظم کیسے قائم ہوتا ہے نیز اسے کیسے ریگولیٹ کیا جانا چاہئے، اس کی حکمت عملی سوشل سائنسز وضع کرتی ہیں۔

اسی طرح فرد قانونی حدبندیوں کا شکار بھی ہے، مثلاً یورپ و امریکہ میں دوسری شادی نہیں کر سکتا، کیوبا میں زمین نہیں خرید سکتا، پاکستان یا سعودی عرب میں سرعام بدکاری نہیں کر سکتا وغیرہ۔ اس مسئلے کا حل لبرل مفکرین کے نزدیک ہیومن رائٹس کا پابند جمہوری نظام ہے جہاں قانون کا مقصد تحفظِ آزادی کے سواء اور کچھ نہیں ہونا چاہیے۔ ان کے نزدیک ریاست کو ایسے تمام عقائد، اداروں، روایات و تعلقات کا قلع قمع کر دینا چاہیے جو فرد کی آزادی چاہنے کی اس خواہش میں کمی کا باعث بنتے ہوں۔

سرمایہ داری ان تین قسم کی اداراتی صف بندیوں (سرمایہ دارانہ علمیت یعنی سائنس و سوشل سائنسز، سول و مارکیٹ سوسائٹی اور جمہوری ریاستی نظم) کی تنظیم و تشکیل کا نام ہے۔ چونکہ آزادی کی

عملی تجسیم و مجرد شکل سرمایہ ہے (کہ سرمایہ انسان کو اسکی ہر چاہت حاصل کرنے کا مکلف بناتا ہے)، لہٰذا سرمایہ دارانہ تنظیمات کا مقصود سرمائے میں لامحدود اضافے کو ممکن بنانا ہوتا ہے، ہر وہ ترتیب خواہشات جو سرمائے میں اضافے کا باعث نہ بنے سرمایہ دارانہ نظام میں غیر معقول سمجھی جاتی ہے۔

فصل اول

فرد کی معاشی آزادی کا تصور

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد فرد کو مکمل آزادی دے کر اس کے مصالح کے تحفظ کرنے پر ہے۔اس لئے کہ فرد کے مصالح ہی فطری طور پر ایک سماج کی مصلحت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔افراد کے مصالح کا لحاظ رکھنا حکومت کی ذمہ داری ہے، تاکہ اس طرح معاشرہ خود بخود روبہ ترقی ہو جائے۔

ورلڈ بینک کی ایک رپورٹ میں غربت کے خاتمے اور روک تھام کے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے تین امور کو ضروری قرار دیا گیا:

> "Prevention and reduction of poverty calls for expanding opportunities, empowerment and security, so as to enable people to manage their lives."[1]
>
> ترجمہ: غربت کے خاتمے اور روک تھام کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کو اپنی زندگی کے انتظامات کرنے کے قابل بنانے کے لیے ملازمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع پیدا کیے جائیں، ان کو بااختیار بنایا جائے اور امن وامان کے مواقع میسر کیے جائیں۔

سرمایہ داری بطور ادارہ اور بطور نظام انسان کے لیے فقط معاشی میدان میں ہی آزادی کا خواہاں نہیں ہے بلکہ اس نظام میں چار قسم کی آزادی کا تصور پایا جاتا ہے۔

سیاسی آزادی

اقتصادی آزادی

فکری آزادی

شخصی آزادی

<u>سیاسی آزادی:</u> اس آزادی کا مطلب یہ ہے ہر شخص عمومی زندگی اور سماجی بہبود کے منصوبوں میں رائے دینے کا حق رکھتا ہے، حکومتیں عوام کی رائے سے قائم ہوں گی اور ہر شخص کی رائے کا احترام کیا جائے گا۔ حکومت انہی عوام کی بہتری کیلیے قائم کی جاتی ہے۔اس کے قیام میں ان سے رائے لینا اور پھر ان کی رائے کا احترام کرنا ایک بنیادی فرض ہے جسے نظر انداز کرنا ناانصافی اور ظلم ہے۔وہ اپنی مصلحت کو بہتر سمجھتے ہیں اور اسی سمجھ کے مطابق حکام کا انتخاب کر سکتے ہیں۔اس مسئلہ میں کسی ایک فرد یا چند افراد کو

---

[1] The World Bank World Development Report (WDR) 2000/2001: Attacking Poverty, Oxford University Press, New York, 21 September 2000

ترجیح نہیں دی جاسکتی، یہ پورے سماج کی موت وحیات کا مسئلہ ہے۔ اس میں ہر شخص کو اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرنا ہوگا اور پھر جب اجتماعی زندگی کے نتائج واثرات میں سب برابر کے شریک ہیں تو کوئی معنی نہیں ہیں کہ اس کی تشکیل و تنظیم میں انہیں برابر سے شریک نہ کیا جائے۔ اسی بنیاد پر الیکشن کا قانون نافذ ہو اور حکومتوں کے اختیارات کو اکثریت کی رائے کا تابع بنادیا جائے۔

اقتصادی آزادی: اس نظریہ کے پرستاروں کا یہ عقیدہ ہے کہ اقتصادی میدان کی یہ آزادی جو ایک قسم کی فطری حیثیت رکھتی ہے ایک عظیم سیاست ہے جو سماج کی اصلاح اور اقتصادی توازن کے قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ انسان میں ذاتی فائدہ کا جذبہ ہوتا ہے جو اسے ہر تکلیف کو برداشت کرنے اور ہر عملی میدان میں نشاط ظاہر کرنے کی دعوت دیتا ہے اور یہی تحمل ونشاط ایک دن سماجی ارتقا کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ بازار میں پیداواروں والوں اور بیوپاریوں کی آزادی سے پیدا ہونے والے مقابلے سے مختلف معاملات میں جو حرج عدل وانصاف پیدا ہوسکتی ہے اور کوئی آدمی بھی زیادتی سے کام نہیں لے سکتا۔ اقتصادیات کا فطری قانون ہے کہ جب کسی جنس کی قیمت اس کی فطری حیثیت سے زیادہ ہو جائے گی تو اس کی طلب خود بخود کم ہو جائے گی اور طلب کی کمی خود ہی ایک دن قیمت کی کمی کا سبب بن جائے گی۔ ہر شخص اپنے مال کو نکالنے کے لیے قیمت کم کرے گا اور اس طرح نتیجہ میں قیمتوں میں توازن پیدا ہو جائے گا، یہی حال شخصی آزادی اور بازاری مقابلے کا ہو گا۔ شخصی آزادی انسان کو آمادہ کرے گی کہ اپنے فائدے کے لیے زیادہ سے زیادہ جنس پیدا کرے، مصارف کم سے کم ہوں اور یہ بات ذاتی اور انفرادی ہونے کے باوجود اجتماعی مصلحت کا پیش خیمہ بن جائے گی۔[1]

اس طرح بازار میں مقابلہ کی بنیاد پڑے گی ہر شخص اشیاء کی قیمت، مزدور کی اجرت کا خاص لحاظ رکھے گا۔ ہر ایک کو قیمت کے اضافے اور مزدور کی اجرت کی کمی سے اندیشہ ہو گا اور ذاتی منافع کے زیر سایہ بھی سماجی فلاح پروان چڑھ جائے گی۔

فکری آزادی: اس آزادی کے معنی اور مفہوم یہ ہیں کہ لوگ اپنے عقائد و نظریات میں آزاد رہیں۔ اپنے ذہن کے مطابق سوچیں اور اپنی عقل کے مطابق فیصلہ کریں۔ حکومت ان کی کسی فکری خواہش یا نفسانی طلب پر پابندی لگانے کی حق بجانب نہیں اور نہ ان معاملات میں مداخلت کرسکتی ہے۔

شخصی آزادی: جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے رہن سہن کے طریقوں میں ہر قید و بند سے آزاد رہے، اپنے ارادہ کا مالک ہو، اور اپنی رغبت میں مختار۔ چاہے اس سلوک سے کتنے ہی غلط اثرات پیدا کیوں نہ ہوں اور قوت ارادی کس قدر کمزور ہی کیوں نہ ہو

---

[1] Principles of Political Economy and Taxation, Ricardo David‹John Murray Publisher, 3rd edition, P.207

جائے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ انفرادی آزادی دوسروں کی آزادی پر منفی اثر مترتب نہ کرے اور ان کے حقوق سے مزاحمت پیدا نہ کرے۔ اب ہر شخص اپنی پسند اور خواہش کے مطابق رسم ورواج، عادت وشعار کو اپنا سکتا ہے جب تک دوسرون کی رسم پر کوئی اثر نہ پڑے۔ کیونکہ یہ مسئلہ اس کی ذات سے متعلق ہے اور ذاتی مسائل میں چھیڑ چھاڑ خلاف عقل ومنطق ہے۔

اس نظام میں دینی آزادی کا نظریہ شخصی آزادی کے ضمرے میں آتا ہے عملی میدان میں اس کا اندراج شخصی آزادی کے ضمن میں ہو جاتا ہے، یعنی اجتماعی مصلحت کا دارومدار انفرادی مصالح پر ہے۔ فرد ہی وہ مرکز ہے جس پر جماعت کو قائم ہونا چاہیے اور فرد ہی وہ نقطہ ہے جس سے سماج کا دائرہ تیار ہوتا ہے۔ حکومت کا کام افراد کے مصالح کا تحفظ کرنا اور ان کے فائدے کا بہتر سے بہتر انتظام کرنا ہے۔[1]

نظامِ سرمایہ داری بظاہر تو ایک معاشی نظام ہے لیکن اس کا تعلق ان تمام معاملات سے بھی ہے جو انسان کی معاشیات سے جڑے ہوئے ہیں، یہ انسانی اقتصادیات کے علاوہ اس اس کے معاشرتی، مذہبی، فکری اور سیاسی ضرورتوں کی بھی بات کرتا ہے اور ان کے لیے باقاعدہ ایک روڈ میپ بھی فراہم کرتا ہے۔ فریڈریک ہائیک(Freidrich Hayek) کہتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کی معاشی آزادی، سیاسی آزادی کی ایک شرط ہے۔ اور جب تک سیاسی آزای نہیں دی جائے گی اور حکومت وریاست کو معاشی واقتصادی امور سے الگ نہیں کیا جائے گا اس وقت تک فرد کی انفرادی معاشی آزادی ممکن نہیں ہے۔ انکے مطابق مارکیٹ میکینزم ہی وہ واحد اور اکلوتا راستہ ہے کہ جس کے ذریعے زور زبردستی اور جبر کا طریقہ استعمال کیے بغیر اس بات کا پتا لگایا جا سکتا ہے کہ کیا پیدا کرنا ہے اور کتنی مقدار میں پیدا کرنا ہے اور پھر اس کی تقسیم کس طرح عمل میں لائی جاتی ہے۔[2] ان کے بعد ملٹن فرائیڈ مین (Milton Friedman)، اینڈریو برینن(Andrew Brennan)اور رونالڈ ریگن(Ronald Reagan)نے بھی اسی نظریے کی حمایت اور تبلیغ کی۔ فرائیڈ مین نے اس تناظر میں یہ دعوی کیا تھا کہ تمام اہم اور مرکزی اقتصادی کام اور کارروائیوں ہمیشہ سیاسی اثر ورسوخ اور جبر کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہیں جن سے معاشرے کے افراد کو آزادی دلانا ضروری ہے اور یہ کام فقط سرمایہ دارانہ نظام ہی کر سکتا ہے کہ جس میں مارکیٹ ہر طرح کے سیاسی وحکومتی اثر ورسوخ سے آزاد ہوتی ہے۔ اس کے مطابق آزاد منڈی کے تحت تشکیل پانے والی معیشت میں لین دین کے تمام امور رضاکارانہ طور پر انجام پانے ہیں اور ان پر کسی قسم کا سیاسی یا حکومتی اثر ورسوخ یا جبر

---

[1] آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات، باقر الصدر، ص:27،26

[2] The Road to Serfdom, Friedrich Hayek, University Of Chicago Press, 1944, p.147

کارفرما نہیں ہوتا۔ رضاکارانہ طور پر انجام دی گئی معاشی سرگرمیوں کا وسیع تنوع، جابر سیاسی راہنماؤں کے معاشی اقدامات اور احکامات لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اور ان کی معاشی جبر پر مبنی پالیسیوں کو بڑی حد تک محدود اور کم کر دیتا ہے۔

فرائیڈ مین کے ان نظریات کی اشاعت اور ترویج جو ہن کینز (John Maynard Keynes) نے نہایت بہادری اور دلفشانی سے کی۔ اس کا یہ ماننا تھا کہ:

"The Capitalism is vital for freedom to survive and thrive."[1]

ترجمہ: آزادی سے زندہ رہنے، آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے سرمایہ داری نظام ایک اہم اور بنیادی امر ہے۔

امریکہ کے تھنک ٹینک، فریڈم ہاؤس (Freedom House) جو کہ جمہوریت، سیاسی آزادی اور انسانی حقوق پر انٹر نیشنل لیول پر تحقیق کے پروگرامز منعقد کرواتا ہے، نے یہ بات اپنی تحقیقات کے ذریعے ثابت کی ہے کہ سیاسی آزادی اور اقتصادی آزادی کی سطح کے درمیان اعداد و شمار پر مشتمل ایک اعلیٰ اور نہایت اہم باہمی ارتباط و ربط موجود ہے[2]۔

جب افراد معاشرہ کو یہ تمام آزادیاں میسر ہوں اور اس پر کسی قسم کی سیاسی، فکری، معاشی یا شخصی قدغن اور پابندی نہ ہو تو وہ آزادی سے اپنی تمام قواہ اور طاقتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور خوب محنت اور مشقت کرتا ہے جس سے نہ صرف فرد بلکہ معاشرے کی اقتصاد پر بھی مثبت اور دیرپا اثرات پڑتے ہیں۔ اس طرح سے نہ صرف اس شخصِ خاص بلکہ معاشرے کے سر پر بھی منڈلانے والے معاشی خطرات اور فقر و فلاس او غربت کے امکانات دم توڑ جاتے ہیں اور معاشرہ مثبت سمت میں ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

نجی ملکیت کا استحقاق اور جدوجہد کی آزادی

سرمایہ دارانہ نظام میں افراد کے لیے نجی ملکیت کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔ اس نظام میں شخصی حقوقِ ملکیت کا تحفظ کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف قسم کی اشیاء مثلاً کپڑے، برتن اور مویشی وغیرہ ہی نہیں بلکہ ایسی چیزوں پر بھی حقوق تسلیم کیے گئے ہیں جن کی

---

[1] The Cambridge History of Twentieth Century Political Thought, Richard Bellamy, Cambridge University Press, p.60

[2] Freedom in the World: The Annual Survey of Political Rights and Civil Liberties, Adrian Karatnycky, Transaction Publishers, 2001, p. 89

مدد سے مزید اشیاء پیدا کی جا سکتی ہیں، جیسے مشینیں، آلات، زمین اور دیگر اشیاء پیداوار وغیرہ۔ اس نظام کا سنگِ بنیاد یہی ہے کہ اس نے حقوقِ ملکیت کو مان لیا ہے۔ اور جب کبھی کسی فرد کا کسی ایک شے پر قبضہ ہو جاتا ہے تو وہ قانونی لحاظ سے بھی اس کا حق بن جاتا ہے اور اس سے کوئی دوسرا چھین نہیں سکتا نیز اس نظام میں حقوق ملکیت پر کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔[1]

نظامِ سرمایہ داری میں قانونی ذرائع سے جو دولت بھی حاصل کی جائے وہ اس فرد کی ملکیت سمجھی جائے گی جو اس کے حصول کے لیے کوشش کرے گا۔ جب وہ اس کی ملکیت ہو گئی تو اب وہ اس سے اپنی شخصی ضرورتوں، شخصی حاجات کی تسکین اور اس سے مزید دولت پیدا کرنے کے لیے مختلف منصوبوں میں سرمایہ کاری کر سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سود اور اگر چاہے تو اچھے اور برے دونوں کاموں میں پانی مرضی سے اس دولت کو لگا سکتا ہے۔

اس نظام معیشت میں فرد یا افراد اپنے وسائل کو جس طرح چاہیں اپنی مرضی سے اور آزادی سے استعمال کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی شخصی ضروریات کو پورا کرنے کا جو انداز چاہیں اختیار کریں اور اپنی دولت میں اضافہ اور بڑھوتری کے لیے اپنی پسند کا کوئی بھی کام اور پیشہ اختیار کر لیں ان پر کوئی قدغن اور پابندی نہیں ہے۔ وہ پیشہ یا ذریعہ غلط ہو یا درست، اخلاقی ہو یا غیر اخلاقی سب کو اختیار کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ کام ریاست کے قوانین اور معاہدات کے خلاف نہ ہوں۔[2]

افراد کیا یہ حق ہے کہ وہ فرداً فرداً یا چھوٹے گروہوں کی شکل میں مل کر اپنے ذرائع کو جس میدان عمل میں چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کوشش میں فوائد یا نقصانات انہیں کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ گویا ان کی ذاتی سعی کو ہی اس میں دخل ہوتا ہے اور وہ آزادانہ طور پر کوئی پیشہ اختیار کر سکتے ہیں۔ اشیاء کی پیدائش، صرف و خرچ اور تقسیم وغیرہ کا اختیار انہیں ہی حاصل ہوتا ہے۔ پیدائش کے عوامل کا باہمی اور نسبتی اشتراک عمل بھی انہی کا مرہون منت ہوتا ہے اور خود اس کے دائرہ کار کا تعین کرتے ہیں۔ اجر و مستاجر اور زمیندار و مزارع کے مابین شرائط بھی باہمی صلاح و مشورہ سے طے پاتی ہیں۔

سرمایہ دارانہ معاشی آزادی کی حدود

سرمایہ دارانہ نظام کی نظر فرد پر ہوتی ہے۔ وہ اس کی مصلحت کا خواہاں ہوتا ہے اور اسی کو اپنے نظام اقتصاد کا محور قرار دیتا ہے۔ اس سسٹم میں فرد کو معاشی آزادی بدرجہ اتم دی ہے تاکہ وہ اپنے مال و ثروت کے حوالے سے ہر طرح کی معاشی

---

[1] اسلامی معیشت، فرزانہ بخاری، ص98،97

[2] معیشت واقتصاد کا اسلامی تصور، حکیم محمود احمد ظفر، ص:75

آزادی کو محسوس کر سکے اور اپنا سکے۔ نظامِ سرمایہ داری میں جب معاشی آزدی کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے تو یہ اصطلاح حاصل شدہ مال و دولت کو اپنی مرضی و اختیار سے استعمال کرنے سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

اس نظام کی طرف سے دی گئی معاشی آزادی سے مراد تین قسم کی آزادی ہے

(i) آزادیٔ ملکیت

اس نظام کا قانون یہ ہے کہ ہر فرد کو ملکیت میں مطلق العنان ہونا چاہئے۔ اس پر کسی قسم کی پابندی نہ ہونی چاہئے۔ وہ جن اشیاء کو چاہے حکومتی و ریاستی قوانین کے اندر رہ کر اپنی ملکیت میں لا سکتا ہے ۔ اس کی آزادی کی حمایت کرنا حکومت کا فرض ہے۔ ہاں اگر کسی وقت اجتماعی مصالح کی بنا پر کسی ملکیت کو عام کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو اسے مملکت پر صرف کیا جاسکتا ہے۔

درحقیقت یہ نظام، اشتراکیت سے پورا پورا تضاد رکھتا ہے۔ وہاں اصلی حیثیت اجتماع کو حاصل تھی۔ افراد کو املاک، استثنائی حالت میں دی جاتی تھیں اور یہاں اصل حیثیت افراد کو حاصل ہے۔ اجتماع پر ان کے اموال کو صرف بعض ضروری حالات میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

(ii) آزادیٔ تصرف

ہر شخص کو اس بات کا اختیار ہو گا کہ اپنے اموال میں اضافہ کرنے کے لئے پیداوار کے مختلف ذرائع استعمال کرے۔ اپنی زمین میں چاہے تو خود زراعت کرے چاہے اسے کرایہ پر دے دے یا بیکار پڑا رہنے دے۔ حکومت کو دخل اندازی کا اختیار نہ ہو گا۔

اس قانون کا منشا یہ ہے کہ افراد اپنے مصالح کو بہتر جانتے ہیں اور اس کے لئے بہتر سعی کر سکتا ہے۔ لہٰذا اگر نظام اقتصادی کو اسی محور پر چلا دیا جائے تو قہری طور پر پیداوار میں اضافہ ہو گا اور معاشرہ کی حالت سدھر جائے گی۔ اور غربت و افلاس کی بیماری سے چھٹکارا پایا جاسکے گا۔

(iii) آزادیٔ صرف

ہر شخص کو اپنے اموال کو صرف کرنے کا اختیار ہونا چاہئے جس طرح جس راہ میں چاہے صرف کر سکتا ہے۔ ہاں اگر کسی اجتماعی مصلحت کی بنا پر حکومت رد کر دے تو پھر اسے رک جانا پڑے گا اس لئے کہ اجتماعی مصلحت ایک اہم درجہ رکھتی ہے جیسے منشیات کا کاروبار۔

گویا کہ سرمایہ داری کے معاشی آزادی کے اصول و قوانین کا خلاصہ تین الفاظ ہیں:

(۱) آزادیٔ ملکیت

(۲) آزادیٔ تصرف

(۳) آزادئ صرف

معاشی آزادی کا غربت وفقر کے خاتمے کے لیے کردار

انسانی فطرت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ حکومت وریاست یا اجتماع پسند نظام، اپنے افراد کو مکمل معاشی آزادی فراہم کریں تاکہ وہ اپنے ذاتی اغراض کے پیش نظر کام کریں اور تاکہ ذاتی اغراض کے حصول کے نتیجے میں خود بخود اجتماعی مصالح وجود میں آئیں۔ اور چونکہ انفرادی آزادی ہی تمام اجتماعی اور سماجی مصالح کا سرچشمہ ہے اس لئے اس کا پورا پورا تحفظ ضروری ہے[1]۔ اس دعویٰ کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ انسان کے ذاتی مصالح ہمیشہ اجتماعی مصالح سے ہمرنگ ہوتے ہیں لہٰذا اگر انسان کو انفرادی آزادی دے دی جائے تاکہ وہ اپنے لئے ہی کوئی کام کرے تو اس کا فائدہ اجتماع کو بھی پہنچ جائے گا اور اس کی ذات کو بھی۔ جب افراد کے اندر سے معاشی آزادی کے سبب کام کرنے کی بندشیں اور موقع کی عدم دستیابی جیسے امور ختم ہو جائیں گے تو افراد اپنی مرضی کے کام کا انتخاب کرکے اپنے لیے معاشی آسودگی پیدا کریں گے۔ ان کی یہ معاشی آسودگی نہ صرف ان کی ذاتی زندگی سے افلاس وفقر کا خاتمہ کرے گی بلکہ افراد کے اندر سے فقر وافلاس کے خاتمے کے ذریعے معاشرے کو بھی اس مرض اور بیماری سے پاک کیا جا سکے گا۔[2] یہ امر طے شدہ ہے کہ ذاتی فائدہ کا اثر بھی اجتماعی مصلحت پر پڑتا ہے لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ غیبی طریقے سے اس کام سے استفادہ کرلے گا۔

سرمایہ دارانہ معاشی آزادی کے دور میں ہر کارخانے والا اپنے کارخانے کو ترقی دینے کی کوشش کرے گا۔ مقابلہ کا بازار گرم ہوگا۔ ہر شخص کو دوسرے کے آگے بڑھ جانے کا خطرہ ہوگا اور نتیجہ میں وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے گا اور عمدہ سے عمدہ آلات استعمال کرے گا۔ اچھی سے اچھی ایجادیں کرے گا اور اس طرح صرف ذاتی اغراض کی بنا پر انسانی ضرورت کی تمام چیزیں بہتر سے بہتر عالم وجود میں آسکیں گی۔ آزادی فقط واقعی اور خارجی حیثیت ہی نہیں رکھتی بلکہ یہ انسان کی داخلی طلب اور فطری تقاضہ بھی ہے جس کا قبول کرنا انسانی فرض ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ افراد کو دی گئی معاشی آزادی پیداوار میں بھی اضافے کا سبب ہے۔ آزادی کے عالم میں انسان پورے طور سے پیداوار پر زور دے سکتا ہے اس لئے ہر شخص کو اس آزادی سے بہرہ ور ہونا چاہیے تاکہ اپنے ذاتی اغراض کی بنا پر پیداوار سے پوری پوری دلچسپی لے اور اس طرح معاشرہ میں ثروت کا اضافہ ہو۔ آزاد معاشرہ میں کارخانوں کا مقابلہ ہوتا ہے اور ہر شخص

---

[1] Political Economy: the Contest of Economic Ideas, Frank Stilwell, P:37

[2] Capitalism, James D.Forma, Dell Publishing New York,1976, p.31

اپنی اجتماعی حالت کو خوشگوار بنانے کے لئے زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر جنس ایجاد کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہی آزادی ملک کو جنس ومتاع کی فراوانی سے مالامال کر دیتی ہے۔[1]

[1] The Global Economy and its Economic Systems, Paul R. Gregory, Robert C. Stuart, South-Western College Pub, p.107

فصل دوم

ریاست کی عدم مداخلت(Laissez Faire)

سرمایہ دارانہ نظام کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ حکومت کو تاجروں کی تجارتی سرگرمیوں میں مداخلت نہیں کرنی چاہئے۔ وہ جس طرح کام کررہے ہیں ان کی معاشی سرگرمیوں میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ نہ ان پر حکومت کی طرف سے زیادہ پابندیاں عائد کرنی چاہئے۔ اس کام کے لیے اس نظام میں Laissez Faire کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

Laissez Faire فرنسیسی لفظ ہے جس کے معنی ہیں "کرنے دو"یعنی حکومت سے کہا جارہا ہے کہ جو لوگ اپنی معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہیں وہ جس طرح بھی کام کررہے ہیں کرنے دو۔ اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالو، نہ اس کو قانونی پابندیوں میں جکڑا جاسکتا ہے۔

Laissez Faire بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام کی وہ پالیسی ہے جس کے تحت افراد کی معیشت میں حکومتی کردار محدود ہو گیا ہے۔ اس اصطلاح کا استعمال کب سے شروع ہوا، اس بارے بزرگوں سے نسل در نسل زبانی نقل ہونے والی روایات یہ کہتی ہیں کہ یہ اصطلاح، فرانس کے کنگ لیوس چہاردہم (King Louis XIV) کے معاشی و اقتصادی امور کے کنٹرولر جنرل Jean-Baptiste Colbert کو کارخانے داروں کی طرف سے دیے گئے اس جواب سے ماخوذ ہے کہ جب ان سے Jean-Baptiste Colbert نے پوچھا تھا کہ کاروبار میں ان کی مدد کے لیے حکومت کو کون کون سے اقدامات کرنے چاہیں۔ تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ Leave us alone یعنی ہمیں آزاد چھوڑ دو اور حکومتی دخل اندازی کو بند کر دو، حکومت کی طرف سے کاروباری سرگرمیوں کے حق میں یہی تعاون ہو سکتا ہے۔[1]

سرمایہ دارانہ نظام کا اصل فلسفہ بھی یہی ہے کہ معیشت اور معاشی سرگرمیوں کو آزاد چھوڑا جائے۔ اگرچہ بعد میں سرمایہ دارانہ ممالک میں رفتہ رفتہ اس پالیسی کو محدود کر دیا گیا اور عملاً ایسا نہیں ہوا کہ حکومت بالکل مداخلت نہ کرے۔ بلکہ حکومت کی طرف سے بہت سی پابندیاں نظر آنے لگ پڑیں۔ کبھی ٹیکسوں کے ذریعے مختلف پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔ کبھی کسی کام کی ہمت افزائی کیلئے حکومت بہت سے اقدامات کرتی ہے۔ آج پوری دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں تجارت کے اندر حکومت کی بلکل کوئی مداخلت موجود نہ ہو، لیکن سرمایہ دارانہ معیشت کا بنیادی فلسفہ یہی تھا کہ حکومت مداخلت نہ کرنے بلکہ تاجروں کو کھلی چھٹی دے دے۔[2]

---

[1] https://www.britannica.com/topic/laissez-faire

[2] اسلام اور جدید معیشت و تجارت، مفتی محمد تقی عثمانی، ص30

سرمایہ دارانہ نظام میں حکومت افراد کو نجی وذاتی ملکیت سے روکتی نہیں اور نہ ہی ان کو اپنی مرضی کی جگہ پر کام کرنے سے روکتی ہے۔ حکومت پابندی نہیں لگاتی کہ ادارے اپنے ملازمین کو کتنی زیادہ اور پرکشش تنخواہ پیش کریں گے اور نہ ہی اس بات سے کوئی رکاوٹ ڈالتی ہے کہ وہ اپنی پیداواری اشیاء کی کیا قیمتیں معین و مقرر کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض کئی ممالک میں کم از کم اجرت کے قوانین اور کم از کم حفاظتی معیارات موجود ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کے کچھ ورژن کے تحت حکومت وریاست بھی کئی ایک معاشی امور کو انجام دیتی ہے، جس میں کرنسی نوٹوں کا اجراء، عوامی استعمال کی اشیاء کی فراہمی اور ترسیل کی نگرانی اور نجی معاہدوں کی تنفیذ کے معاملات وغیرہ شامل ہیں۔ جب کہ کئی ایک ممالک میں مسابقتی قوانین پائے جاتے ہیں جو کہ افراد یا کمپنیوں کے اجارہ داریاں قائم کرنے یا مافیا بنانے جیسے امور سے رکاوٹ بنتے ہیں۔ اسی طرح سے بعض ممالک میں سرکاری ایجنسیاں کئی ایک اہم صنعتوں میں سروس کے معیار کو ریگولیٹ کرتی اور ان کی مانیٹرنگ کا کام انجام دیتی ہیں، جیسا کہ نشریات اور ہوابازی کے شعبہ جات وغیرہ۔ علاوہ ازیں ایسے ممالک میں حکومت سرمایہ کے بہاؤ کی بھی خود نگرانی کرتی ہے اور مالیاتی ٹولز جیسا کہ شرح سود وغیرہ کو بھی حکومتی نگرانی میں رکھا جاتا ہے تاکہ افراطِ زر، مہنگائی اور بے روزگاری وغیرہ کے عوامل کو کنٹرول میں رکھا جاسکے۔[1]

Laissez Faire یا حکومت وریاست کی عدم مداخلت کا اصول قیمتوں اور اجرتوں کے حوالے سے بازار اور مارکیٹ سے ہٹ کر کسی بھی نظام کے قبول نہ کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ مثلاً گورنمنٹ کے امتیازی ٹیکسز، سبسڈی، ٹیرف، حکومتی جابرانہ یا تشدد آمیز حربے یہاں تک کہ کسی قسم کی بھی حکومتی اجارہ داریاں سرمایہ دارانہ نظام کے اس وصف کو قبول نہیں ہیں۔ یعنی کہ بازار ،منڈی یا مارکیٹ کے علاوہ جو مرضی نظام قیمتوں اور اجرتوں کے تعین کے حوالے سے متعارف کروایا جائے ترجیح ہمیشہ اس کے عدم قبولیت ہی کو دی جائے گی۔ فریڈرک ہائیک (Fredrich Hayek) اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> "The goal is the preservation of the unique information contained in the price itself."[2]

ترجمہ: Laissize Faire کا مقصد قیمتوں کے ذریعے ہی منفرد معلومات کا تحفظ یقینی بنانا ہے۔

---

[1] Capitalism, World Book Encyclopedia, published in 1988,P:194

[2] The Pure theory of Capital, Friedrich A.Hayek, University of Chicago Press, P,352

یعنی کہ قیمتوں کے میکانکی نظام کے ذریعے معاشرے کی تمام احتیاجات و ضروریات کی جانکاری کرنا اور پھر ان کی پیداوار کو یقینی بنا کر مارکیٹ تک پہنچانا ہے۔ لہذا قیمتوں کی میکانیت کے اس خود کار نظام کے علاوہ جتنے بھی اثر و رسوخ یا مداخلت کے امکانات ہیں Laissize Faire کا مقصد ان تمام کو رد کرنا اور آزاد منڈی نظام کی حفاظت کرنا ہے۔

Laissize Faire یا حکومتی عدم مداخلت کے نظام کا موقف یہ ہے کہ جب کاروبار میں منافع کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ لاگت کم سے کم ہو اور پیداوار زیادہ سے زیادہ ہو تو کاروباری شخص کو اپنا مفاد مجبور کرتا ہے کہ زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے نئے طریقے اور سائنسی آلات استعمال کیے جائیں۔ اپنی مشینری کو اچھی حالت میں رکھنے خام مال کم قیمت پر حاصل کرے اپنے کام کو ترقی دینے کے لیے ہر وقت کوشاں رہے اور وہ بیرونی مداخلت کے بغیر ہی کاروبار کو وسیع تر کرتا جائے۔ اس لیے حکومت کی مداخلت کی کم ضرورت پڑتی ہے۔ چونکہ نفع حاصل کرنے کے شوق میں آجر اپنے حالات کو درست رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔[1]

سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی معاشی قوانین یہ کہتے ہیں کہ کسی بھی اقتصادی و معاشی نظام کو حکومتی اثر و رسوخ اور دخل اندازی سے آزاد ہونا چاہیے اور بازار اور منڈی کے علاوہ اس پر کسی چیز کا دباؤ، اثر یا دخل قبول نہیں کیا جائے گا۔ جہاں تک سرمایہ دارانہ نظام کی روح کا تعلق ہے یا ایک آئیڈیل سرمایہ دارانہ نظام کا تعلق ہے اس میں حکومتی دخل اندازی کی قطعاً کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے بانی سمجھے جانے والے ایڈم سمتھ (Adam Smith) کا یہ ماننا تھا کہ فطری طور پر تمام انسان اپنے ذاتی فائدے کے خواہاں ہوتے ہیں اور اسی کے لیے کوشش کرتے ہیں، لہذا جب ان کی اقتصادی سرگرمیوں پر کسی قسم کی کوئی دخل اندازی نہیں ہو گی تو باہمی فائدے کی بنیاد پر پیداوار اور تبادلے کا ایک متوازن نظام ابھر کا سامنے آئے گا۔[2]

آزاد منڈی کی معیشت کے حامیوں کا خیال ہے کہ ریاست کو معیشت کے معاملات میں دخل نہیں چاہئیے. ریاست کا کم سرمایہ داروں اور بڑے کاروباری اداروں کو زیادہ سہولیات فراہم کرنا ہے. انہیں ایسے حالات فراہم کرنا ہے جن میں وہ اپنا کام بہتر طریقے سے سرانجام دے سکیں. ریاست کا کام سکول، ہسپتال، کارخانے اور کاروباری ادارے چلانا نہیں بلکہ ریاست کا کام سرمایہ داروں اور بڑے کاروباری اداروں کو سہولتیں باہم پہنچانا ہے۔ ایسے حالات فراہم کرنا ہے جن میں وہ اپنا کام بہتر طریقے سے سرانجام دے سکیں. ریاست کا کام اسکول، ہسپتال، کارخانے اور کاروباری ادارے چلانا نہیں بلکہ ریاست کا کام سرمائے کے پھیلاؤ اور نقل و

[1] اسلامی معیشت، مہر محمد نواز خان، مسز فرزانہ بخاری، ص97

[2] http://www.businessdictionary.com/definition/laissez-faire-economics.html

حرکت کے راستے میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا ہے [1]۔کارخانے،کاروباری ادارے، ہسپتال، اسکول اور دیگر سماجی خدمات کے ادارے سرمایہ داروں کو چلانے چاہیں، ریاست صرف سہولت کار کا کردار ادا کرے، امیر افراد، بڑی کمپنیوں اور کاروباری اداروں پر ٹیکسوں کی شرح کو کم سے کم رکھا جائے۔ اجرتوں کو کم رکھا جائے اور ان میں غیر ضروری اضافہ نہیں ہونا چاہئیے۔کاروباری لاگت کو بڑھنے نہ دیا جائے. ایسی معاشی پالیساں اپنائی جائیں جن کے نتیجے میں نجی سرمایہ داری کو فروغ حاصل ہو، نجکاری اور ڈی ریگولیشن کے ذریعے سرکاری ادارے نجی شعبے کے حوالے کئے جائیں۔

سرمایہ دارانہ نظام کا بنیادی اصول بے قید مشقت ہے، اس کے مطابق صنعت و تجارت اور کسب معاش کے تمام طریقے اور معاشیات کا پورا نظام ہر قسم کے سرکاری قانون اور مذہبی پابندیوں سے کامل طور پر آزاد ہونے چاہئیں، حکومت اور مذہب کو کسی فرد کے معاشی اور اقتصادی نظام میں کسی قسم کی مداخلت کا حق نہیں۔

فرد کی حد سے بڑھتی ہوئی یہ آزادی اس مفروضے پر قائم ہے کہ ہر شخص اپنے اچھے برے کی سمجھ خود رکھتا ہے، اس کو یہ بتانے کی حکومت کو ضرورت نہیں ہے کہ وہ اپنا معاشی کاروبار کیسے چلائے، اور نہ کسی معلم اخلاق کی ضرورت ہے جو حرص و طمع سے باز رہنے اور ایثار و سخاور جیسی صفات کی تلقین کرے۔

پس ان نظام میں انفرادی ملکیت خوہ وسائلِ پیداوار (زمین، مالِ تجارت، شین اور خام پیداوار وغیرہ) کی ہو یا عام اشیاء کی ،کامل طور پر آزاد ہوتی ہے۔ لین دین کی کوئی بھی صورت جو طرفین کی رضامندی سے طے پا جائے، اسے روکنے کا اختیار نہ مذہب کو ہے، نہ کسی حکومت کو۔ تجارت وصنعت یا ملازمت و مزدوری وغیرہ کے ذریعہ نفع اندوزی پر کسی قسم کی قانونی یا مذہبی تحدید عائد نہیں کی جاسکتی۔ افرا کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے کہ اپنی پیداوار کو جس قدر چاہیں گھٹائیں یا بڑھائیں، مال کی جو قیمت اور اس پر جتنا منافع چاہیں حاصل کریں، پیداوار جس قسم کی چاہیں تیار کریں، اور کاروبار کے لئے جو ضابطے چاہیں مقرر کریں [2]۔

اس نظام کی بنیادی چیز جس کو پورے معاشی نظام کی روح قرار دیا گیا ہے، وہ ہر کاروباری کا ذاتی نفع ہے، یعنی کاروباری کیلئے تجارت و صنعت میں ملک و قوم کے نفع نقصان کو بھی پیشِ نظر رکھنا لازم نہیں، بلکہ ہر وہ پالیسی اختیار کر سکتا ہے جو اس کی ذات کیلئے مفید ہو، ملک و قوم کو اس سے فائدہ کی بجائے اگر نقصان پہنچتا ہو تو فرد اس کا جوابدہ نہیں۔

---

[1] Business and Socity, P.G.Aquinas, Anmol publications, New Delhi, 2005, P:97

[2] Business Environment, A.C.Fernando, Dorling Kindersley(India), New Delhi, 2011, p.143

جس طرح اس نظام میں افرادی ملکیت حاصل کرنے کے تمام ذرائع میں فرد کو آزاد چھوڑا گیا ہے، اسی طرح خرچ کرنے کے معاملے میں بھی اس پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی، مذہب یا قانون کسی سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی دولت کا کوئی بھی حصہ ایسے مد میں خرچ کرے جس میں وہ اپنا مادی نفع نہیں دیکھتا۔[1]

سرمایہ دارانہ اقتصادی آزادی کا معنی یہ کہ ہر قسم کی آمدنی، ایجاد، پیداوار، تجارت کی مکمل ازادی رکھتا ہے حکومت کا فرض ان کی آزادی کا تحفظ کرنا ہے اسے مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور یہ اعلان بھی اس وقت ہو جب صنعتی انقلاب سر اٹھا رہا تھا ۔نئے نئے آلات ایجاد ہو رہے تھے دستکاری کا جنازہ تیار ہو چکا تھا گھریلو صنعت کے کارخانے بند ہو رہے تھے۔ اب کیا تھا قوم کے صاحبان اقتدار نے جدید آلات پر قبضہ کیا، نئی نئی پیداوار بازار میں لے آئے اور ایک بڑی تعداد اپنے وسیلہ رزق سے محروم ہو گئی۔[2]

سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں ریاست فرد یا افراد کے کاروبار میں مداخلت نہیں کرتی۔ اس کا کام صرف امن و امان کا قیام ہے تاکہ اس فضا میں سرمایہ کاری عام ہو سکے اور عدل و انصاف کی فراہمی ہو۔ معاشی فیصلوں اور ان پر عمل درامد کا کام کلیتہً افراد پر چھوڑ دی جاتا ہے کیونکہ افراد اپنے مفاد کے بہترین محافظ ہوتے ہیں اور ریاست کی مداخلت بعض ملکی مفاد کو نقصان پہنچاتی ہے۔[3]

سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ حکومت کو تاجروں کی تجارتی سرگرمیوں میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے وہ جس طرح کام کر رہے ہیں ان کی معاشی سرگرمی میں رکاوٹ نہ ڈالی جائے، نہ ان پر حکومت کی طرف سے زیادہ پابندیاں عائد کرنی چاہئیں۔ عام طور پر اس اصول کے لیے (Laisses Faire) کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی کہ حکومت کی عدم مداخلت کی پالیسی، گویا کہ حکومت سے کہا جا رہا ہے کہ جو لوگ اپنی معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہیں وہ جس طرح بھی کام کر رہے ہیں ان کو کرنے دو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالو۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا اہم اصول ہے اور سرمایہ دارانہ نظام کا اصل بنیادی فلسفہ یہی ہے۔

حکومت کی مداخلت کے بارے سرمایہ دارانہ نظام کی مختلف شکلیں سامنے آتی ہیں، نیز سرمایہ دارانہ نظام کا منڈی یا بازار کے ساتھ مختلف قسم کا تعلق ہونے کی وجہ سے اس کی کئی قسمیں متصور ہو سکتی ہیں۔

---

[1] یورپ کے تین معاشی نظام، مفتی محمد رفیع عثمانی، ادارۃ المعارف، کراچی، طبع 2007، ص:29،30

[2] آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات، باقر الصدر، ص:33

[3] معیشت و اقتصاد کا اسلامی تصور، حکیم محمود احمد ظفر، ص:77

(1) ریاستی سرمایہ دارانہ نظام(State Capitalist System)

بنیادی طور پر سرمایہ دارانہ نظام میں ذرائع پیداوار کُلاًیا اغلباً نجی اور انفرادی ملکیت میں ہوتے ہیں اور نجی ملکیت میں رکھتے ہوئے ہی نفع کی غرض سے اس کی سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ عمومی طور پر سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ کاری، تقسیم اموال، آمدنی اور قیمتوں کا تعین اور نگرانی حکومت وریاست کی بجائے آزاد منڈی یا مارکیٹ کرتی ہے۔ لیکن سرمایہ دارنہ نظام کی ایک ایسی شکل بھی موجود ہے جس میں ریاست یا حکومت کا ایک باقاعدہ کردار رہتا ہے، اسی وجہ سے اس معاشی نظام کو ریاستی سرمایہ دارنہ نظام کہتے ہیں۔ ریاستی سرمایہ دارانہ نظام(State Capitalist System) میں بازار یا منڈی پر کم سے کم انحصار کیا جاتا ہے جب کہ ریاست خود یا توبالواسطہ معاشی منصوبہ بندی کرتی ہے یا پھر اپنے اداروں کے ذریعے سرمائے کی گردش کو یقینی بناتی ہے۔[1]

(2) آزاد منڈی کی سرمایہ دارانہ معیشت(Free Market Economy)

آزاد منڈی(Free Market) یا حکومت کی عدم مداخلت والی قسم(Lassize Faire) میں، مارکیٹوں کا سب سے زیادہ بڑے پیانے پر استعمال ہوتا ہے اور اس قسم میں اشیاء کی خدمات، سپلائی یا قیمتوں کے تعین میں حکومت وریاست کردار کم سے کم یا نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

(3) فلاحی سرمایہ دارنہ معیشت(Welfare Capitalism)

فلاحی سرمایہ دارنہ معیشت(Welfare Capitalism) اور مخلوط نظام معیشت(Mixed Economies) میں بازار یا منڈی کا معیشت وتجارت میں ایک نمایاں کردار ہوتا ہے لیکن کسی حد تک یہ ساری سرگرمیاں گورنمنٹ کی نگرانی میں انجام پاتی ہیں۔ تاکہ کساد بازاری کی صورت میں یا پھر معاشی فلاح کے منصوبوں کو پھیلانے کے لیے حکومت اپنا کردار ادا کرتی رہے۔

فری مارکیٹ اکانومی

فری مارکیٹ اکانومی سے مراد آزاد منڈی اور معیشت ہے جس میں حکومت کا عمل دخل اصولاً ذرا سا بھی نہیں ہوتا۔ چونکہ ایک آئیڈیل سرمایہ دارانہ نظام کہیں پر بھی موجود نہیں ہے لہٰذا موجودہ نظام میں حکومت کا عمل دخل عملاً ختم نہیں ہوا البتہ اس کو کم سے کم کر دیا گیا اور اب حکومت کا عمل دخل ایک مخصوص حد تک ہی ہوتا ہے۔ فری مارکیٹ کی بنیاد شخصی آزادی پر ہے لہٰذا اگر کوئی سے دو اشخاص آپس میں کوئی معاہدہ یا کاروبار کرنا چاہیں تو وہ آزاد ہیں اور کر سکتے ہیں۔ وہ قیمتوں کا تعین اپنی مرضی

---

[1]Capitalism, James Augustus-Henry Murray, University of Minnesota Press, p. 94

سے کر سکیں، البتہ معاشرتی انصاف کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے قیمتوں کا تعین کا جائے، بلا شبہ اس میں ٹیکس وغیرہ کا حصہ موجود ہوتا ہے۔

فری مارکیٹ اکانومی یا آزاد منڈی کی تجارت سے مراد ایک ایسا معاشی نظام ہے جہاں اشیاء کی قیمتیں اور خدمات طلب و رسد کے قانون کی مدد سے طے کی جاتی ہیں، اور ان کو حکومتی پالیسی کی طرف سے مداخلت کیے بغیر معاشی توازن حاصل کرنے کی مکمل اجازت ہے۔ دراصل یہ معاشی نظام عام طور پر انتہائی مسابقتی منڈیوں کے لئے مواقع پیدا کرتا ہے اور پیداواری کاروباری اداروں میں نجی ملکیت کی حمایت کرتا ہے۔ Laissez Faire آزاد منڈی کی معیشت کی ایک زیادہ وسیع شکل ہے جہاں ریاست کا کردار املاک کے حقوق کے تحفظ تک محدود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مارکیٹ میکنزم سرمایہ داری نظام کی مہم ترین خاصیت ہے، اس کو پرائس میکنزم بھی کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں منافع جو کہ مارکیٹ میکنزم ہی سے متعلق ہوتا ہے وسائل کی تقسیم کا ذریعہ اور سبب بنتا ہے۔ اس نظام کے تحت پورا اقتصادی نظام اور ڈھانچہ مارکیٹ میکنزم کے ارد گرد چلتا ہے۔ البتہ یہ اقتصادی طریقہ کار وسائل کی تقسیم کے لئے مناسب منصوبہ بندی کی کمی اور طلب و پیداوار کے درمیان مناسب ہم آہنگی کے فقدان سے دوچار ہے۔ قیمتوں کا میکانیت کا طریقہ کار پیداوار، کھپت اور تقسیم کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ قیمتوں میکانیکی نظام سرمایہ دارانہ معاشرے میں ریگولیٹری میکانزم کے طور پر کام کر رہا ہے۔[1]

سرمایہ دارانہ معیشت میں صارفین خریداری کے لئے اشیاء کا انتخاب کرنے میں مکمل آزاد ہوتے ہیں اور وہ مرضی کے تحت اشیاء کو خریدتے اور بیچتے ہیں ان کے کسی معاملے میں حکومت یا کسی اور ادارے کا عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ خالص ذاتی مرضی و پسند سے ہی معاملہ کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔ نظام سرمایہ داری میں کنزیومر ہی مارکیٹ یا بازار کے بادشاہ ہوتے ہیں جنہیں کسی قسم کو کوئی روک ٹوک نہیں ہوتی۔ کاریگر، صنعت کار یا کارخانے والا صارفین کی مانگ، پسند اور ترجیح شدہ چیزوں ہی کی پیداوار سامنے لاتے ہیں اور ان کو بازار کی رونق بناتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کی پیداوار میں کسی کی دلچسپی نہ ہونے کے سبب ان کا مال ضائع ہو جانا یقینی ہوتا۔ یاد رہے کہ اس پورے عمل میں حکومت کا کہیں کوئی کردار نہیں ہوتا، بلکہ سرمایہ دارانہ معیشت میں معاشی نظام کے بنیادی مسائل کو نفع کے محرک کے تحت قیمتوں کی میکانیت کے ذریعے حل کیا جاتا ہے۔ جاگیرداروں، سرمایہ کاروں، تاجروں اور آجروں کو پیداواری عمل کو منظم کرنے کے عوض منافع حاصل ہوتا ہے۔

---

[1] A vocabulary of culture and society , Raymond Williams, Oxford University Press, 1985, p.288

اس سسٹم میں معاشی اور اقتصادی سرگرمیوں کا رخ متعین کرنے کے لیے سب سے اہم اور مؤثر کردار قیمتوں کی میکانیت کا ہے لوہی چیزیں پیدا کی جاتی ہیں جن کی قیمتیں اتنی ہوں جو آجر کے لیے منافع کا باعث بن سکیں۔ گویا پیداواری وسائل کا رخ کن اشیاء اور پیشوں کی طرف ہو گا، اس کا فیصلہ قیمتیں کرتی ہیں۔ قومی اور اجتماعی مفاد اس بارے میں ثانوی اہمیت رکھتا ہے۔ اشیاء کی عاملین پیدائش کے معاوضوں اور تنخواہوں کا تعین بھی قیمتو کی میکانیت کے تحت ہوتا ہے۔ جن عاملین پیدائش کی فسد ان کی طلب سے کم ہو گی ان کے معاوضے بھی کم ہوں گے اور جن کی طلب اس کی رسد سے زیادہ ہو گی ان کے معاوضے بھی زیادہ ہوں گے۔ جن عاملین کے معاوضے زیادہ ہوں گے ظاہر ہے کہ قومی آمدنی میں ان کا حصہ بھی زیادہ ہو گا۔[1]

آجر اپنا منافع زیادہ سے زیادہ کرنے کے لیے عاملین پیدائش کا وہی اشتراک منتخب کرتا ہے جس پر اس کی لاگت اور خرچہ کم سے کم ہو۔ وہ ایک طرف تو اپنی لاگت یعنی مصارف پیدائش دیکھتا ہے اور دوسری طرف اشیاء کی قیمتوں پر نظر رکھتا ہے۔ اس سے نہ صرف اس کو پیدا کی جانے والی اشیاء کی نوعیت بلکہ اس مقدار کا تعین کرنے میں بھی بڑی راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ قیمتوں کی میکانیت کا یہ خود کار نظام سرمایہ دارانہ نظام میں معاشی سرگرمیوں کو رواں دواں رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

فری مارکیٹ کی خوبصورتی یہ ہے کہ بازار میں کسی بھی چیز کی متعدد طرح کی، مختلف معیار کی اور مختلف قیمت کی اقسام موجود ہوتی ہیں۔ مثلاً روٹی نان ہی کی بات کی جائے تو مارکیٹ میں طرح طرح

کے نان آ گئے ہیں، قیمے والا نان، آلو والا نان اور نا جانے اور بھی کتنی قسموں کے نان۔ کسی کو بھی یہ نان سڑک کے کنارے بنے ڈھابے پر بھی مل جائے گا، ایک دکان پر بھی، کسی بڑے شاپنگ سنٹر کے فوڈ کورٹ میں بھی یا پھر کسی برانڈ کا بھی نان۔ روزی کمانے کا اور اپنی مرضی کے ریٹ مقرر کرنے کا جتنا حق ایک ڈھابے والے کا ہے اتنا ہی حق ایک برانڈ کا بھی ہے۔ جب کسی عام دکان یا ڈھابے سے کوئی بھی چیز لی جاتی ہے تو وہاں کسی بھی چیز کے دام کم بھی کرائے جا سکتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص کسی برانڈ سے کوئی چیز خریدتا ہے تو وہاں اشیاء کے ریٹس فکس ہوتے ہیں۔

اس سب کچھ کے تناظر میں معیاری اشیاء کم قیمت میں پیدا کرنا مسابقت اور مقابلہ کا رجحان پیدا کرتا ہے اور اس کی بدولت ہمیں اشیاء مختلف قیمت اور معیار پر ملتی ہیں۔ تاجران اپنی مرضی سے اشیاء کی قیمتوں کا تعین کرتے ہیں اور منافع بھی کماتے ہیں۔ لیکن آزاد منڈی کی تجارت میں سپلائر اور پروڈیوسر ناجائز منافع نہیں کما سکتے، چونکہ ناجائز منافع تبھی امکان رکھتا ہے جب کوئی سی خاص چیز بنانے والا صرف ایک ہی تاجر ہو، یا دوسرے تاجروں کو حکومت کی جانب سے یہ پابندی ہو کہ وہ حکومت کی اجازت سے ہی وہ چیز بنا

---

[1] معاشیات اسلام، مظفر حسین ملاٹھوی، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی، 1984ء، ص:69،68

سکیں گے۔اس طرح کی کسی بھی پابندی کی وجہ سے پروڈیوسر صرف ایک ہوتا ہے پس مسابقت کا ماحول قائم نہ ہونے کی وجہ سے ایک ہی تاجر ناجائز منافع کمائے گا۔جب کہ فری مارکیٹ اکانومی آزادی دیتی ہے کہ کوئی بھی کم قیمت پر معیاری اشیاء مارکیٹ میں متعارف کرواسکتا ہے [1]۔اس طرح صارف کے پاس بھی اختیار ہوتا ہے کہ جہاں سے بھی اسے کم قیمت میں اشیاء ملیں وہاں سے لے۔

طلب ورسد کا قانون

اس کائنات میں بہت قدرتی قوانین کار فرما ہیں جو ہمیشہ ایک جیسے نتائج پیدا کرتے ہیں ۔ انہی میں ایک قانون رسد(Supply)اور طلب(Demand)کا بھی ہے۔رسد کسی بھی سامان تجارت کی اس مجموعی مقدار سے عبارت ہے جو بازار میں فروخت کیلئے لائی گئی ہو اور طلب خریداروں کی اس خواہش کا نام ہے کہ وہ یہ سامانِ تجارت قیمتاً بازار سے خریدیں۔اب رسد وطلب کا قدرتی قانون یہ ہے کہ بازار میں جس چیز کی رسد طلب کے مقابلے میں زیادہ ہو اس کی قیمت گھٹ جاتی ہے اور جس چیز کی طلب اس کی رسد کے مقابلے میں بڑھ جائے اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے، یہ ایک قدرتی قانون ہے جس کو قانونِ رسد وطلب(Law of Demand and Supply) کہا جاتا ہے [2]۔

سرمایہ داری نظام میں نجی ملکیت کی آزادی، آزادانہ مقابلہ، ذاتی پسند، وسائل کے استعمال میں منافع کی شرح کو مد نظر رکھنا، اشیا کی قیمتوں کا طلب اور رسد کے توازن سے طے ہونا، عاملینِ پیدائش کا نجی ملکیت میں ہونا اور حکومتوں کی عدم مداخلت یا ان کا محدود کردار شامل ہے۔ ایسا نظام جہاں معاشی سرگرمیوں کا مقصد شرح منافع میں اضافہ ہے۔اس طرح طلب ورسد کا جہاں توازن ہو جاتا ہے تو اشیاء کی قیمت بھی طے ہو جاتی ہے۔طلب ورسد کا قانون عملاً مارکیٹ یا بازار میں حکومت وریاست کی عدم مداخلت کا خواہاں ہے۔

سرمایہ دارانہ قوانینِ معیشت کے مطابق معاشی معاملات میں حکومتی مداخلت نہیں ہونی چاہیے، ورنہ مارکیٹ کے عمل میں مسائل پیدا ہو جاتے ہیں –مارکیٹ خود کار نظام کے تحت کام کرتی ہے اور جب بھی کبھی مارکیٹ میں کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو مارکیٹ خود اسے حل کر لیتی ہے اور حکومتی مداخلت کی کوئی ضرورت نہیں پڑتی [3] –

---

[1] Education and Capitalism, Joseph L. Bast, Herbert J. Walberg , Hoover Institution Press, p.88,89

[2] Microeconomics and Basic Mathematics, T.R Jain, VK Publications, New Delhi, p.28

[3] Horizontalists and Verticalists: The Macroeconomics of Credit Money, Basij J. Moore, Cambridge University Press, 1988, p.193

نظامِ سرمایہ داری کا یہ ماننا ہے کہ کسی بھی معیشت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ معیشت میں موجود سرمایہ کی منڈی، محنت کی منڈی اور اشیاو خدمات کی منڈیاں مکمل آزادی سے کام کر رہی ہوں، نہ تو کم سے کم اجرت ہو اور نہ ہی شرح سود پر کوئی روک تھام ہو۔ اگر یہ تمام چیزیں اسی انداز میں انجام پا رہی ہوں تو طلب و رسد کے قانون کے تحت اجرت، پیداوار کی شرح اور شرح سود جیسے معاملات خود بخود توازن میں آجاتے ہیں۔ اور مارکیٹ اور صارف کی ترجیحات کا تعین بھی بآسانی کر لیا جاتا ہے۔

طلب اور رسد کے قانون سے ترجیحات کا تعین اس طرح ہوتا ہے کہ جب ہم نے ہر شخص کو زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کیلئے چھوڑ دیا تو ہر شخص اپنے منافع کی خاطر وہی چیز بازار میں لانے کی کوشش کریگا جس کی ضرورت یا طلب زیادہ ہو گی۔ تاکہ اسے اس کی زیادہ قیمت مل سکے۔ زراعت پیشہ افراد وہی چیز اگانے کو ترجیح دینگے جن کی بازار میں طلب زیادہ ہے۔ اور صنعتکار وہی چیز تیار کرنے کی کوشش کرینگے جن کی بازار میں زیادہ مانگ ہے۔ کیونکہ اگر یہ لوگ ایسی چیز بازار میں لائیں جن کی طلب کم ہے تو انہیں زیادہ منافع نہیں مل سکے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر شخص اگرچہ اپنے منافع کی خاطر کام کر رہا ہے۔ لیکن رسد و طلب کی قدرتی طاقتیں اسے مجبور کر رہی ہیں کہ وہ معاشرے کی طلب اور ضرورت کو پورا کرے۔

جب کوئی شخص ترجیحات کا باقاعدہ تعین کر لیتا ہے تو اسی حساب سے موجودہ وسائل کو مختلف کاموں میں لگاتا ہے۔ لہٰذا رسد اور طلب کے قوانین جس طرح زراعت پیشہ افراد کے لیے ترجیحات کا تعین کرتے ہیں کہ بازار میں طلب کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ اپنی زمینوں میں کیا چیز اگائیں اسی طرح یہی قانون صنعتکاروں اور تاجروں کیلئے اس بات کا تعین کرتا ہے کہ وہ کیا چیز کتنی مقدار میں بازار میں لائیں۔[1]

ترجیحات کا تعین معاشرے کے ہر دو طبقہ کے لیے مفید ہوتا ہے اور انہیں اقتصادی سرگرمی کرنے کا موقع ملتا ہے جو کہ غربت وافلاس کو ختم کرنے کی خاطر بذاتِ خود ایک مؤثر قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب ہر معیشت کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنی پیداوار کو ترقی دے اور اپنی پیداوار میں کماً اور کیفاً اضافہ کرے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے فلسفے کے مطابق یہ مسئلہ بھی اسی بنیاد پر حل ہوتا ہے کہ ہر شخس کو جب زیادہ سے زیادہ منافع کیلئے آزاد چھوڑا جائے گا تو رسد و طلب کے قدرتی قوانین اسے خود بخود اس بات پر آمادہ کریں گے کہ وہ نئی سے نئی چیز اور بہتر کوالٹی بازار میں لائے۔ تاکہ اس کی مصنوعات کی طلب زیادہ ہو اور اسے زیادہ نفع حاصل ہو۔

---

[1] Do labour supply and demand curves exist?, Steve Fleetwood, Cambridge Journal of Economics, Volume 38, 2014, p.247

فصل سوم

ذاتی منافع کا محرک

افراد کی معاشی جدوجہد کا ایک محرک ذاتی منافع ہے اور یہ سب سے بڑا محرک ہے چنانچہ جہاں کسی فرد کو زیادہ منافع کی توقع ہوگی وہاں بے دھڑک اپنا سرمایہ لگائے گا اور زیادہ سرمایہ کے حصول کے لیے شبانہ روز کوشش کرے گا۔ اگر سرمایہ کاری میں ذاتی منافع کا محرک نہ ہو تو کوئی شخص بھی کسی جگہ اپنے سرمایہ کو صرف نہیں کرے گا۔[1]

ذاتی منافع کا محرک سرمایہ دارانہ نظام میں ایک ایسی تھیوری ہے جس کا مطلب کاروبار کا حتمی اور اہم مقصد پیسہ بنانا، اپنا مالی فائدہ کرنا، اپنے منافع کے لیے تگ و دو کرنا اور اپنی ذات کو مالی سہولیات باہم پہنچانا ہے۔ اس نظام میں کسی بھی شخص کی حرکت کا مقصد اور اس کا ہدفِ اصلی ذاتی مالی منافع کا حصول ہے۔ بالالفاظ دیگر ہر قسم کی مالی و تجارتی سرگرمیوں کا مقصد منافع کمانا اور پیسہ اکٹھا کرنا ہے۔ اس نظریے کے مطابق افراد اپنے بہترین مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے مالی امور انجام دیتے ہیں، اور ان کا واحد مقصد اپنی ذات کو نفع باہم پہنچانا ہوتا ہے، ان کی مالی سرگرمیوں اور معاملات میں ملی، مذہبی یا معاشرتی ذمہ داری کی ادائیگی وغیرہ کے جیسے جذبات اور احساسات کار فرما نہیں ہوتے۔ پس تاجر یا آجر حضرات اپنی ذات یا اپنے شئیر ہولڈرز کو ہی زیادہ زیادہ سے نفع باہم پہنچانے کے درپے نظر آتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں ذاتی منافع کے محرک کا ہدف وسائل کی پیداوار اور تقسیم دونوں کو موثر اور مفید طریقے پر انجام دینا ہے۔

مثال کے طور آسٹریلوی معیشت دان ہینری ہیزلٹ (Henry Hazlitt) اس بات کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ:

> "If there is no profit in making an article, it is a sign that the labor and capital devoted to its production are misdirected: the value of the resources that must be used up in making the article is greater than the value of the article itself."[2]
>
> ترجمہ: ایک آرٹیکل یا مضمون لکھنے میں اگر کوئی مالی فائدہ نہ پہنچ رہا ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس مضمون کی لکھائی میں جو محنت اور سرمایہ استعمال ہوا ہے دراصل ان کا استعمال درست طرز پر نہیں ہوا۔ کیونکہ مضمون کی لکھائی میں جن وسائل کا استعمال کیا گیا ہے ان کی اہمیت و افادیت لکھے گئے آرٹیکل کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ (لہذا ضروری ہے کہ ان وسائل کا مالی فائدہ برآمد ہو وگرنہ ان کا استعمال ضائع ہوا)۔

---

[1] معیشت واقتصاد کا اسلامی تصور، حکیم محمود احمد ظفر، ص:75

[2] Economics in One Lesson, Henry Hezlitt, Crown Publishing Group 2010, p.151

نظریاتی طور پر آزاد اور مسابقتی منڈیوں میں منافع کی مقدار اور معیار کو بڑھانا اس بات کو یقینی بنا رہا ہوتا ہے کہ وسائل کا ضیاع نہیں کیا جارہا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس مسابقتی فضا میں آجر اپنے نفع اور طمع کی خاطر سعی و عمل میں زیادہ کوشش کرتا ہے اور اس طرح اس میں یہ جذبہ ابھرنے سے پیداوار زیادہ سے زیادہ حاصل کی جاتی ہے۔[1]

ذاتی فائدہ یا منافع ایک ایسا عنصر ہے جو ہر فرد بشر کو معاشی حوالے سے سرگرم اور متحرک رکھتا ہے، اور یہ معاشی سرگرمی یا تحرک غربت و افلاس کے خلاف جنگ لڑنے میں بہت کارآمد اور زود اثر ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب معاشرے کا ہر فرد اپنے ذاتی منافع و فائدہ کی خاطر ہمہ وقت معاشی سرگرمیوں میں سرگرمِ عمل رہے گا تو وہ جہاں اپنے نان و نفقہ کمانے پر قادر ہو جائے گا وہیں معاشرے کے دوسرے افراد کے لیے بھی وسائل کی پیداوار کا ذریعہ بنے گا جس سے معاشرتی ضروریات بطریق احسن پوری کرنے میں مدد ملے گی[2]۔ پس کوئی بھی شخص معاشی و اقتصادی مسائل میں سستی و کوتاہی کو مرتکب نہیں ہو گا بلکہ اپنے ذاتی نفع کی لالچ میں تگ و دو کرے گا۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام کا ایک اصول یہ ہے کہ پیداوار کے عمل میں جو محرک کارفرما ہوتا ہے وہ ہر انسان کے ذاتی منافع کے حصول کا محرک ہوتا ہے۔

نظام سرمایہ داری اشیاء ضرورت کی پیداوار اور ترقی کے لیے جس چیز پر انحصار کرتا ہے وہ فائدے کی طمع اور نفع کی امید ہے جو ہر انسان کے اندر فطرۃً موجود ہے اور اس کو سعی و عمل پر ابھارتی ہے۔ نظامِ سرمایہ داری کے حامی کہتے ہیں کہ انسانی زندگی میں اس سے بہتر بلکہ اس کے سوا کوئی دوسرا محرک عمل فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نفع کے امکانات جس قدر کم کر دیں گے اسی قدر آدمی کی جدوجہد اور محنت کم ہو جائے گی نفع کے امکانات کھلے رکھنے چاہیے اور ہر شخص کو موقع دینا چاہیے کہ اپنی محنت و قابلیت سے جتنا کما سکتا ہے کمائے۔ ہر شخص خود زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کام کرنے کی کوشش کرنے لگے گا۔ اس طرح خود بخود پیداوار بڑھے گی، اُس کا معیار بھی بلند ہوتا چلا جائے گا، تمام ممکن ذرائع و وسائل استعمال میں آتے چلے جائیں گے، اشیاء ضرورت کی بہم رسانی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جائے گا اور ذاتی نفع کا لالچ افراد سے اجتماعی مفاد کی وہ خدمت خود ہی لے لے گا جو کسی دوسری طرح ان سے نہیں لی جاسکتی۔[3]

---

[1] اسلامی معیشت، فرزانہ بخاری – مہر محمد نواز خان، ص:99

[2] اسلام اور جدید معیشت و تجارت، مفتی تقی عثمانی، ص:29

[3] اسلام اور جدید معاشی نظریات، اَبو الاعلیٰ مودودی، ص:22

اس نظام میں انسان کے اپنے ذاتی منافع کو بطور محرک لایا گیا ہے اور معاشی سر گرمیوں میں تیزی لانے کے لئے اس کی ترغیب دی جاتی ہے۔ چونکہ ذاتی منافع ایک ایسا محرک ہے کہ جس کی وجہ سے ہر شخص ایسا کاروبار کرنے کہ کوشش کرتا ہے جس سے اسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل ہو، یوں ذرائع استعمال میں لانے کی سعی ترتیب پاتی ہے جس سے پیدائش کے عمل کا امکان بھی ہو چنانچہ آجر ان کے استعمال کو وسعت دینے کی سعی کرتے ہیں۔ اس طریقے سے پیداوار میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ تاہم بعض اوقات چند ذرائع بے کار بھی پڑے رہتے ہیں اور ملک و قوم ان کے فوائد سے محروم رہ جاتے ہیں۔

فری مارکیٹ اکانومی کا بھی ذاتی منافع کے محرک کے ساتھ بڑ گہرا تعلق ہے۔ مارکیٹ کی معیشت میں اشیاء اور سروسز کی خریداری دلیل ہے کہ ابھی بھی ان لوگون میں طلب اور مانگ موجود ہے جن کے ہاتھوں میں پیسا ہے۔ اگر آجر ان حالات سے یہ نتیجہ نکالے کہ یہ طلب ابھی مزید باقی رہنے کے امکانات ہیں تو وہ خود بھی مستقبل میں اسی چیز کو مارکیٹ میں مہیا کرنے اور اس ضمن میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے آمادہء خاطر ہوتے ہیں اور اس سلسلے میں اپنی تمام ممکنہ کوشش اور محنت کو لگانے کے لیے تیار ہوتے ہیں جس کہ وجہ مارکیٹ کے ماحول میں ممکنہ طور پر ان کو ملنے والے ذاتی نفع اور فائدہ ہے۔ ان حالات میں آجر نہ صرف یہ کہ مارکیٹ میں اپنی اشیاء کی فراہمی یقینی بنانے کی کوشش کرتے بلکہ اس کی قیمت کو مارکیٹ کی قیمت کے حساب سے مسابقانہ روش دینے کی کوشش کرتے ہیں جس کا فائدہ سراسر صارف کو بھی جاتا ہے یوں ذاتی منافع کی یہ سر گرمی جہاں آجر کی معاشی سر گرمیوں میں اضافے کی صورت میں اس کی آمدن میں بھی اضافے کا سبب بنتی ہے وہیں صارف کو بھی مناسب دام اور اچھی قیمت فراہم ہوتی ہے جس کے سبب آجر و صارف دونوں کے لیے یکساں فائدہ میسر ہوتا ہے[1]۔ آجر اور صارف دونوں کے لیے مفید معاشی سر گرمیاں ان کو غربت وافلاس کے گرداب سے دور رکھنے اور معاشی آزادی دینے کے لیے مفید، ممد اور معاون ثابت ہوتی ہیں۔

اس نظام کی بنیادی چیز جس کو پورے معاشی نظام کی روح قرار دیا گیا ہے، وہ ہر کاروباری کا ذاتی نفع ہے، یعنی تجارت و صنعت میں ملک و قوم کے نفع نقصان کو بھی پیشِ نظر رکھنا لازمی نہیں، بلکہ ہر وہ پالیسی اختیار کر سکتا ہے جو اس کی ذات کیلئے مفید ہو ، ملک و قوم کو اس سے فائدہ کی بجائے اگر نقصان پہنچتا ہو تو فرد اس کا جوابدہ نہیں۔

فری مارکیٹ اکانومی کے ماہرین اقتصادیات اس بات کے قائل ہیں کہ ذاتی منافع کا محرک مسابقتی فضا کے ساتھ مل کر اشیاء صرف کی قیمتوں میں اضافے کی بجائے، اس کی کمی کا باعث ہے۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ ذاتی منافع کا یہ تحرک جس قدر بڑھے گا اسی قدر

---

[1] The Skeptical Economist: Revealing the Ethics Inside Economics, Jonathan Aldred, Earthscan, London, 2009, p.144

معیشت و اقتصاد میں تعامل زیادہ ہو گا جو افراد کے ساتھ ساتھ معاشرے کی اقتصادیات کے لیے بھی سود مند ثابت ہو گا۔ پس کسی چیز کو کم منافع کے ساتھ لیکن زیادہ مقدار میں بیچنا، اس کی کم مقدار کو زیادہ منافع کے ساتھ فروخت ہونے سے زیادہ سود مند ہے، اس سے تحرک چونکہ کم ہو جاتا ہے لہذا معاشی فائدہ بھی کم ہوتا ہے۔

اس حوالے سے تھومس سوویل (Thomas Sowell) لکھتے ہیں:

> "It has been estimated that a supermarket makes a clear profit of about a penny on a dollar of sales. If that sounds pretty skimpy, remember that it is collecting that penny on every dollar at several cash registers simultaneously and, in many cases, around the clock."[1]

ترجمہ: یہ اندازہ لگایا گیا ہے ایک سپر مارکیٹ ایک ڈالر کی فروخت پر تقریباً ایک پینی کا منافع کماتی ہے۔ اگر یہ مقدار بہت تھوڑی لگ رہی ہے تو یاد رہے کہ یہ دن بھر میں ہونے والے معاملات کی تمام اماؤنٹ کے ڈالرز کے ہر ہر ڈالر میں ایک پینی کے حساب سے ہے۔ (جو یقیناً دن بھر کے معاملات کے بعد کافی بڑی مقدار میں جمع ہو جاتی ہے)

گویا منافع کے ذریعے افراد یا کمپنیاں جانتی ہیں کہ کوئی سی چیز پیداوار کے قابل ہے یا نہیں۔

مشہور ترین ماہر اقتصادیات ملٹن فرائیڈ مین (Milton Friedman) کا یہ ماننا تھا کہ لالچ اور ذاتی مفاد عالمگیر انسانی خصلتیں ہیں۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ:

> "The world runs on individuals pursuing their separate interests. Only in capitalist countries, where individuals can pursue their own self-interest, people have been able to escape from "grinding poverty."[2]

---

[1] Sowell, Thomas, "Profit Motive underrated by Intelligentsia" Sun-sentinel.com. 26 Dec. 2003. REtrived on: April 21, 2014.

[2] http://www.nysun.com/business/milton-friedman-answers-phil-donahues-charges/66258 (Pantin Travis, "Milton Friedman Answers Phil Donahue's Charges", Nysun.com, Retrived on: June 13, 2016)

ترجمہ: دنیا ان افراد کے بل بوتے پر چل رہی ہے جو اپنے الگ الگ مفادات اور منافع کے حصول کے لیے ہر دم متحرک رہتے ہیں۔ صرف سرمایہ دار ممالک ہی کو دیکھ لیں، جہاں لوگوں کو اپنی ذاتی منافع کی بنا پر تمام امور انجام دینے کی آزادی ہے، لوگ غربت کے اذیت ناک اور پیس دینے والے اثرات سے آزاد ہو چکے ہیں اور غربت سے چھٹکارا حاصل کر چکے ہیں۔

مشہور معیشت دان آئن رینڈ (Ayn Rand) ذاتی منافع کے محرک کو بعض افراد کی جانب سے لالچ پر مبنی رویہ قرار دیے جانے کے الزام کو سختی سے رد کرتی ہیں اور اخلاقی بنیادوں پر فطری جذبات پر مبنی اس محرک کا بھرپور دفاع کرتی ہیں اور یہ کہتی ہیں کہ ذاتی مفادات کے حصول کے لیے ایسی کوشش کرنا جس سے عوام الناس کی معیشت کو بھی سہارا ملے خود غرضی نہیں بلکہ ایک اخلاقی اچھائی ہے، کسی کی بھی عزت کی جانی چاہیے نہ کہ ان کو نظر انداز کیا جائے یا معاشرے کے برے افراد کے زمرے میں ان کا شمار کیا جائے۔[1]

انسانی سماجی اخلاقیات کا یہ تقاضہ ہے کہ انسان کو اپنے ذاتی فائدہ کے لیے کام کرنا چاہیے اور کسی بھی کام کرنے والے کو اس کے کام کا فائدہ اور ثمرات ملنے چاہئیں۔ یہ بات انسانی فطرت کا تقاضہ اور انسانی معاشرے کی بنیادی اخلاقی اکائی ہے۔ انسانی سماج ہو یا عقل انسانی یا پھر انسانی اخلاقی رجحانات سب ہی ذاتی منافع کے لیے محنت اور تگ ودو کرنے کی تائید کرتے ہیں اور ایسا کرنے والوں کو سراہتے ہیں۔ ایسے افرا کی محنت ہی افلاس و غربت اور محرومی کے خلاف ایک منظم اور کامیاب کوشش ہے۔ اگر تمام افراد کو ان کے ذاتی مفادات کے لیے کام کرنے کی آزادی ہو اور وہ ایسا کر بھی رہے ہوں اور ان کی اس محنت و کوشش کے ثمرات ان کی ذاتی منافع شمار ہوں تو یقینا یہ ایک ایسا محرک ہے جو دنیا میں فقر و افلاس اور غربت کے خلاف سب سے مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔

اپنی ذات کو زیادہ نفع پہنچانے کی پالیسی کی وجہ سے ہر آجر کی یہ پالیسی ہوتی ہے کہ اشیاء پر خرچ کم آئے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ منافع کما سکے۔ تبھی عاملین کو وہ اس طریقے اور تربیت سے لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ کم ترین اخراجات پر بہترین منافع حاصل کیا جاسکے،اس مقصد کے لیے نئے طور طریقے بھی ایجاد کیے جاتے ہیں، طریقہ کار میں اصلاح کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں ۔مشینوں کا صحیح استعمال اور تنظیم کی صحیح تربیت وغیرہ سے کماحقہ فوائد حاصل کیے جاتے ہیں اور آئے روز ان مقاصد کی خاطر نئے تجربات کیے جاتے ہیں۔

---

[1] The Virtue of Selfishness, Ayn Rand, Signet publishers, 2005, p.109

ذاتی منافع یا فائدہ ایک ایسا محرک ہے جو افراد کو کام کرنے اور محنت و مشقت کرنے پر ابھارتا ہے۔ درحقیقت ذاتی فائدہ کے محرک کا مطالعہ کرنا اور اس کے بارے میں کچھ جاننا، اقتصادی عوامل کے مرکزی افکار و نظریات کے بارے میں بات کرنے کے مترادف ہے چونکہ اس عنوان یعنی ذاتی فائدہ کے محرک کو معاشیات و اقتصادیات میں مرکزی حیثیت و مقام حاصل ہے۔ ذاتی فائدہ کے محرک کو معیشت و اقتصاد میں ہمیشہ ہی اولیت اور مرکزیت حاصل ہے چاہے ان اقتصادیوں سرگرمیوں کا محور مرکز افراد بحیثیت افراد ہوں یا کہ کمپنیاں اور کارخانے وغیرہ۔ چونکہ جب تک ذاتی فائدہ و منافع نہیں ہوگا تحرک اور کوشش اپنی تمام تر طاقتوں اور وسعتوں کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔[1]

سرمایہ دارانہ نظام کے تحت افراد ذاتی منافع کے لیے معاشی جدوجہد کرتے ہیں۔ وہ اپنے سرمایہ اور صلاحیتوں کا رخ ان ہی پیشوں کی طرف موڑتے ہیں جہاں انہیں کثیر منافع متوقع ہے۔ اس میدان میں ان کو نہ فقط یہ کہ فائدہ زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے بلکہ انکی اقتصادی حالت بھی بہتر سے بہتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یوں افراد کو ذاتی فائدہ اور منافع حاصل کرنے کی آزادی دے کر انہیں اپنے مالی حالات میں بہتری پیدا کرنے کی آزادنہ اجازت مل جاتی ہے جو انہیں فقر و افلاس کے ماحول سے نکالنے اور مالی آسودگی و وسعت حاصل کرنے کا سبب بنتی ہے۔

افراد کی مجموعی آمدن میں اضافہ

افراد کے اندر پایا جانے والا منافع کا ذاتی محرک نہ صرف افراد کی من حیث الافراد آمدن اور ملکیت میں اضافے کا سبب بنتا ہے بلکہ اقوام اور ممالک کی اقتصاد پر بھی مثبت اور دور رس نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ ورلڈ بینک کے مطابق غریب اور نادار افراد کی آمدنی میں اضافہ فقر و افلاس کی مشکل پر قابو پانے کی غرض سے کی جانے والی کاوشوں کا مرکزی نکتہ اور مغز ہے۔ بنگلہ دیش میں غربت و افلاس کے مسئلے سے نمٹنے کے لیے کی جانے والی کوششوں کے بارے میں ورلڈ بینک کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ چھوٹے کسانوں کی زرعی پیداوار میں ہونے والے اضافے کا اگر غیر زرعی شعبوں میں ہونے والے اضافے کے ساتھ تقابل کیا جائے تو ملک کی تقریباً آدھی غریب ترین آبادی کے لیے زرعی پیداوار کی صورت میں مجموعی آمدن میں ہونے والا اضافہ دوگنا مفید ثابت

---

[1] Armstrong's Handbook of Reward Management Practice, Michael Armstrong, Kogan Page, New Delhi, 2012, p.38

ہوا ہے۔[1] جس کی ایک وجہ زرعی شعبے کی ترقی کی وجہ سے افراد کی مجموعی آمدنیوں میں ہونے والا اضافہ ہے کہ جس کے سبب فقر وافلاس کے سائے ان افراد سے چھٹنے لگ پڑے ہیں۔

افراد کی مجموعی آمدن ان کی غربت میں کمی کا بہت بڑا سبب ہے بلکہ بعض اوقات تو اس کے ذریعے غربت وافلاس کا مکمل خاتمہ بھی ممکن ہوتا ہے، اسی سبب یہ ہمیشہ سے معاشی واقتصادی ماہرین کے ہاں موضوع گفتگو اور موضوع بحث رہتی ہے۔

غربت کو ختم کرنے کے لیے ابتدائی یا بنیادی آمدن میں پائے جانے والی صلاحیت کی بنیاد دراصل اس مفروضے پر قائم ہے کہ غربت کی حد سے اوپر غیر مشروط اور مستقل و متعین آمدنی غربت کی لائن کو افراط زر یا دیگر اثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ چونکہ افراد زر کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ اور پیسے کی قدر میں کمی و بیشی ہوتی ہے لہذا وہی بنیادی آمدنی غربت کے اثرات سے محفوظ رکھ سکتی ہے جو مستقل ہو اور افراد زر کے اثرات سے بھی محفوظ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بنیادی آمدن کا مستقل ہونا انسان کی اقتصادی ترقی کے امکانات کو روشن کرتا ہے۔[2]

---

[1] "Climate Change: Bangladesh facing the challenge". The World Bank. 8 September 2008. Retrieved 20 July 2017.

[2] Basic Income Guarantee: Your Right to Economic Security, Allan Sheahen , Palgrave Macmillan, New York, 2012, p.131

فصل چہارم

صارف کی حکمرانی

(Consumers Sovereignty)

کسی بھی معیشت میں ایک ایسی صورت حال جہاں صارف کی ضروریات، اس کا ذوق اور اس کا رجحان پیداواری عوامل کے پورے نظام کو مکمل کنڑول کرتے ہوں "صارف کی حکمرانی" کی صورت حال کہلاتی ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشیات کی اصطلاح "صارف کی حکمرانی" کے مطابق صارف کسی بھی چیز کی پیداوار کے بارے میں فیصلہ کن کردار ادا کرتا ہے کہ مارکیٹ میں کس چیز کی پیداوار کو لانا ہے اور کس چیز کی بازار میں طلب اور مانگ نہیں ہے۔"صارف کی خود مختاری یا حکمرانی (Consumer Sovereignty)" کی اصطلاح سب سے پہلے ولیم ہیرالڈ ہٹ (Willian Harold Hutt) نے 1936 میں اپنی کتاب Ecomomists and the Public میں استعمال کی تھی۔[1]

سرمایہ دارنہ نظام میں صارف کی حکمرانی اس طرح سے قائم ہوتی ہے کہ سرمایہ دار افراد اور کمپنیاں صارف کی ترجیحات کو ہی مد نظر رکھتی ہیں اور اسی حساب سے وہی چیزیں بناتی ہیں جن میں صارف کی دلچسپی ہوتی ہے یا جن کو صارف نے طلب کیا ہوتا ہے۔وہ چیزیں جو صارف کی دلچسپی اور طلب سے خالی ہوں چاہے وہ جتنی ہی مفید اور نفع بخش کیوں نہ ہوں آجر یا کمپنیوں کو ان کے بنانے میں متوقع نقصان کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ صارف اس میں عدم دلچسپی کی وجہ سے اس کو طلب ہی نہیں کرتا اور یوں پیداوار کے ضائع چلے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

اس کے متبادل میں ایک بالعکس رائے کے مطابق صارفین کی خود مختاری فقط ایک خیالی چیز ہے۔اس لیے کہ کمپنیاں یا آجر حضرات چیزیں بنا کر ان کو بیچنے کے لیے مارکیٹنگ تکنیک یا اشتہار بازی کا سہارا لیتے ہیں اور بظاہر صارف کی عدم دلچسپی والی اور غیر ضروری چیز کو اس کی ضرورت بنا کر پیش کرتے ہیں اور آجر ایسی اشیاء بیچتے ہیں جس کی صارف کو ضرورت ہوتی ہے نہ ہی اس کی اس میں دلچسپی ہوتی۔پس ایسا نہیں ہے کہ صارف جو چاہے اس کو وہی ملتا ہے بلکہ صارف کو وہی لینا پڑتا ہے جو اس کے سامنے آفر کیا جاتا ہے۔[2]

عملی دنیا میں دیکھا جائے تو اشیاء کی پیداوار میں یہ دونوں عوامل کارفرما ہیں۔کمپنیاں نئی چیزیں پیدا کرنے اور مارکیٹ میں انہیں لانے کے لیے کامیاب مارکیٹنگ کرتی ہیں اور ان اشیاء کو صارفین کی

---

[1] The Concept of Consumers' Sovereignty, Willian Harold Hutt, the economic Journal Wiley, vol.13, p.50

[2] The Illusion of Consumer Sovereignty, Barry Commoner, Smithsonian Institution Press, Washington, 199, p.121

ضرورت کے طور پر متعارف کرواتی ہیں، لیکن اس سب کچھ کے باوجود صارف کو متوجہ اور پھر متاثر نہ کر سکیں تو یہ چیزیں بکنے کے مرحلے تک نہیں پہنچتیں اور بازار کے اندر پڑی پڑی ضائع ہونے لگتی ہیں اور ان کی طلب کے لیے کوئی گاہک نہیں آتا۔ بازار میں بے شمار ایسی نئی مصنوعات ہیں جو اپنے گاہک پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ لہذا عملاً جب تک دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہ ہو جائیں پیداوار سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا، کمپنیز صارف کی ضرورت اور ذوق کے مطابق اشیاء کو مارکیٹ میں پیش کریں اور صارف کی بھی ان اشیاء میں دلچسپی اور رجحان ہو۔ یہ دونوں عوامل جب مل جائیں تو تبھی مارکیٹ حرکت میں رہتی ہے اور سرمایہ منافع بخش سرگرمیوں پر منتج ہوتا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں صارف کو حکمران کی حیثیت حاصل ہوتی ہے، لہذا سرمایہ کار وہی چیزیں پیدا کرتا ہے جن کی طلب بازار میں زیادہ ہوتی ہے، کسان بھی وہی فصلیں اگاتا ہے جو صارفین کو مطلوب ہوتی ہیں، اسی طرح درآمد کنندہ وہی چیزیں درآمد کرتا ہے جو لوگ طلب کرتے ہیں، اور برآمد کنندہ وہی چیزیں برآمد کرتا ہے جو بیرونی ملکوں کے صارفین پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر حال میں صارف کی خواہش کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔[1]

البتہ بعض معیشت دانوں کا یہ ماننا ہے کہ صارف کی حکمرانی و خود مختاری کا امکان فقط اور فقط ایسی فری مارکیٹ اکانومی میں ممکن ہے جہاں حکومت وریاست یا دیگر غیر بازاری عوامل (non-market institutions) کا عمل دخل اور اجارہ داری نہ ہو[2]۔

علمِ معاشیات میں صارف کی خود مختاری کا مطلب صارف کے اس حق کا اظہار کرنا ہے کہ اس کی ترجیحات ہی اشیاء اور خدمات کی پیداوار کا تعین کرتی ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت کا خیال یہ ہے کہ صارف کی طاقت و قوت ہی یہ بتا سکتی ہے کہ کون سی اشیاء اور چیزوں کو پیداواری عمل سے گزار کر مارکیٹ کی زینت بننا ہے۔ اس نظریے کے حامی افراد کے مطابق اس بات کا فیصلہ کہ کونسی پروڈکٹس سب سے زیادہ فائدہ مند اور استعمال ہونے والی ہیں، صارف کی دلچسپی، توجہ اور ذوق کے ذریعے ہوتا ہے نہ کہ پیداواری عوامل کے ذریعے، پس سرمایہ دار حضرات اور فرمز اگر اپنی پروڈکٹس کو مارکیٹ میں کامیابی کے ساتھ پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس

---

[1] اسلام اور جدید افکار، ڈاکٹر سید تنویر بخاری، پروفیسر حمید اللہ جمیل، ایور نیو بک پیلس، لاہور، سن ندارد، ص:127

[2] Retrospectives: Consumer Sovereignty, Joseph Persky, Journal of Economic Perspectives, vol: 7, p183-191

سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ وہ صارف کی ضروریات اور ترجیحات کو مانیٹر کریں اور اسی موافقت سے اشیاء کی پیداوار کو مارکیٹ میں لایا جائے۔[1]

سرمایہ دارنہ نظام کی فری مارکیٹ اکانومی کے اندر صارفین کی خود مختاری کا بہت بڑے پیمانے پر بازار کی تجارت میں کردار ہوتا ہے۔جب کہ ریاستی سرمایہ دارانہ نظام (State Capitalist System) میں ریاست یا حکومت کی مرضی اور منشاو حکم کے مطابق اشیاء پیدا اور فروخت کی جاتی ہیں اور اس سسٹم میں صارفین کی خود مختاری کا تصور موجود نہیں ہوتا۔

مسابقی معیشتوں (competitive economies) اور فری مارکیٹ اکانومی میں صارفین کو پیداواری عمل کی حد تک بھی مکمل خود مختاری حاصل ہوتی ہے، اور صارف اس چیز کو بخوبی جانتا ہے کہ کون سی چیز اس کے فائدے اور فلاح کے لیے ہے۔ پس ان کی ترجیحات وسائل و اشیاء کی پیداوار اور ان کی تقسیم کا تعین کرتی ہیں۔

صارفین اپنی ترجیحات کے مطابق اجناس کو منتخب کرتے ہیں، پھر ان کی ترجیحات ان کے انتخاب کی اہمیت کو واضح کرتی ہیں جو اشیاء کی پیداوار کا سب سے بڑا محرک سمجھا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت میں صارفین کو اجناس کے انتخاب میں آزادی حاصل ہوتی ہے۔ صارفین کو اس نظامِ معیشت میں ایک خود مختار بادشاہ یا حکمران کی سی حیثیت حاصل ہے۔ اور "صارف کی حکمرانی "کا معنی و مفہوم بھی یہی ہے۔

صارف کسی بھی جنس کو خریدنے میں مکمل آزاد ہوتا ہے اور اس چیز میں بھی اس کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ اس جنس کی مقدار کو بھی اپنی مرضی کے مطابق منتخب کرے۔اس کی ترجیحات کی بنیاد پر بازار میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی اشیاء کا تعین ہوتا ہے اور ہر پروڈیوسر، صارفین کی پسند اور ترجیحات والی چیزوں کی تمام ورائٹی بازار میں لانے کا خواہش مند ہوتا ہے۔

صارف کی حکمرانی کے نتیجے میں "پیداوار کی آزادی "کا تصور بھی ابھر کر سامنے آتا ہے، آجر یا کمپنیاں خود مختار ہیں کہ صارف کی پسند اور مرضی کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف اور متعدد نوعیت کی ایسی اشیاء کو پیدا کریں جو صارف کو اپنی طرف متوجہ کریں اور اس کی ضرورت کو بھی پورا کریں۔یوں صارف کی خود مختاری کے ساتھ پیداوار کی آزادی بھی سرمایہ دارنہ نظام کا حصہ بن جاتی ہے۔

صارف ہی پیدائش دولت کی سرگرمیوں کا رخ متعین کرتا ہے۔اس کی جانب سے جن اشیاء و خدمات کی طلب کا اظہار ہوتا ہے آجر اپنے منافع کے لیے انہی کو پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اگرچہ اب پراپیگنڈہ کے جدید اور اجارہ دارانہ نوعیت کا اثر ورسوخ

[1] http://www.businessdictionary.com/definition/consumer-sovereignty.html

رکھنے والی کثیر القومی فرمز کے صارف کی طلب کو بھی متاثر کیا جانے لگا ہے۔ صارف کی ترجیحات پیدا کی جانے والی اشیاء کی نوعیت اور مقدار وغیرہ پر گہرا اثر ڈالتی ہیں۔ ان ترجیحات کو نظر انداز کر کے آجر حصولِ منافع کے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔[1]

قیمتوں کی میکانیت میں صارف کا کردار

آزاد نظامِ معیشت میں صارف قیمتوں کی میکانیت، نظامِ اشیاء اور خدمات کی پیدائش نیز مصنوعات کے مبادلے اور تقسیم کو متعین کرتا ہے۔ صارف اپنی پسند، ذوق اور ترجیحات کا اظہار قیمتوں کے ذریعے ہی کرتا ہے اگر صارفین کی کپڑے کی طلب بڑھ جائے تو کپڑے کی قیمتیں بھی بڑھ جائیں گی۔ صارفین کی ان ترجیحات سے اس امر کا فیصلہ کیا جائے گا کہ کونسی شے پیدا کرنا ہے، کتنی مقدار میں پیدا کی جائے، کہاں پیدا کی جائے، کیسے پیدا کی جائے اور اس کا کتنا حصہ کسے ملے گا۔ اسی سے عاملینِ پیدائش کے معاوضوں کا تعین ہو گا۔ وسائل پیدائش کا تعین بھی قیمتوں کی میکانیت سے ہی ہو گا۔ اس نظام میں کوئی منصوبہ بندی بورڈ نہیں ہوتا بلکہ یہ صارف کی مرکزیت اور اس کے ذوق اور ترجیحات کے مطابق خود بخود چلتا ہے۔[2]

کنزیومر یا صارف اپنے ذوق، پسند اور ترجیحات کو قیمتوں کی میکانیت (Price mechanism) کے ذریعے کمپنیز یا آجر حضرات تک پہنچاتا ہے۔ سرمایہ دارنہ نظام درحقیقت حاجات کی کثرت اور وسائل کی کمی کی تصویر کشی کرتا ہے، جبکہ تمام خواہشات کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا صارف نے کمپنیوں کی پیش کردہ رنگا رنگ اور متعدد و مختلف قسم کی اشیاء میں اپنے ذوق اور طاقتِ خرید کے مطابق چند کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔

بعض اشیاء کے حوالے سے صارف میں پائے جانے والی فوری خواہش اس نوعیت کی ہوتی ہے وہ منہ مانگی اور بیش بہا قیمت کی ادائیگی پر راضی ہو جاتا ہے، وہ آجر کو اس قسم کی خریداری میں بہت بڑا منافع ادا کرتا ہے، لیکن اگر صارف اشیاء میں زیادہ فوری دلچسپی نہ دکھائے تو اُس چیز کی خریداری میں اُس کی نسبتاً کم دلچسپی اور کم پیسہ خرچ کرنے کا ارادہ ظاہر ہوتا ہے، نسبتاً کم دلچسپی کمپنی کے لیے خطرے کا نشان ہوتی ہے لہذا کمپنی اس چیز کو بیچنے کے لیے نسبتاً کم منافع پر بھی آمادہ ہو جاتی ہے۔ ایسی صورتحال کا فائدہ صارف کو پہنچتا ہے۔

لہذا درحقیقت اشیاء واجناس کی خریداری کی نسبت صارف کا رویہ اور دلچسپی ہی وہ امر ہیں جو بازار کا رخ اور قیمتوں کا تعین کرتے ہیں۔ صارف کے خریداری کے رویے کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں میں ہونے والا اتار چڑھاؤ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ

---

[1] اسلامی معاشیات، پروفیسر عبد الحمید ڈار، علمی کتاب خانہ لاہور، اشاعت 2014، ص:100

[2] اسلام کا معاشی نظام، غلام رسول چیمہ، علم وعرفان پبلشرز، طبع 2007ء، ص:73

صارف کا رویہ اجناس کی قیمتوں پر اثر انداز ہو کر فقر و غربت سے متاثرہ افراد کے لیے قیمتوں کی کمی کی صورت میں معاون ہو سکتے ہیں ۔نہ صرف یہ بلکہ غربت زدہ طبقہ جب اشیاء کی خرید و فروخت میں ایک خاص پس و پیش کا مظاہرہ کرے گا تو اس سے ناجائز منافع کا مطالبہ کرنے والے نقصان کے خدشے کے پیشِ نظر اپنی اشیاء کی قیمتوں میں مناسب کمی روا رکھیں گے جس سے غریب کی قوتِ خرید میں اضافہ ہو گا اور اس کو اپنی معیشت کو متوازن رکھنے میں مدد ملے گی۔

اگر کمپنیز یا آجر حضرات صارف کی ڈیمانڈ اور اس کی طرف سے لی گئی کسی قسم کی دلچسپی کے بغیر کسی بھی جنس کی مقدار کی سپلائی میں اضافہ کر دیں تو اس چیز کی قیمت آجر کے تخمینے سے کہیں کم سامنے آئے گی جب کہ اس کی محدود مقدار کو سپلائی کرنا صارفین کے ذہن میں اجناس کے وقار کو بڑھاتا ہے جس کے سبب وہ اس کی زیادہ قیمت دینے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔

پس قیمتوں کی وہ مختلف مقدار کہ جس کو صارف مختلف اجناس کے مقابل میں ادا کرتا ہے، دراصل یہ اس کے نزدیک ان اشیاء کی تقابلی اقدار کی نمائندگی کرتی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی آزاد منڈی کی تجارت میں یہ ایک واضح اور کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قیمتیں بھی صارفین کے ذوق اور ترجیحات کے ساتھ تبدیل ہوتی ہیں۔ صارف کا کسی چیز کے لیے کم سے کم قیمت کا آفر کرنا اس چیز میں اس کی پائی جانے والی کم دلچسپی کی حکائیت کرتا ہے۔ جبکہ کسی چیز کے لیے زیادہ قیمت کی ادائیگی صارف کے نزدیک اس کی اہمیت وافادیت کو بتلاتی ہے اسی سبب سے وہ زیادہ قیمت ادا کرنے پر بھی آمادہ ہوتا ہے۔[1]

پس معلوم ہوا کہ صارف کسی بھی چیز کی قیمت اس کی افادیت کی بجائے اس چیز میں پائے جانے والی اپنی ذاتی دلچسپی اور شوق کی بنا پر ادا کرتا ہے، پس اس کی پسند و ناپسند اور ترجیحات کو اجناس کی قیمتوں کے تعین میں بڑا عمل دخل ہے، بلکہ سب سے بڑا عامل جو اشیاء کی قیمتوں کے کم ہونے یا زیادہ ہونے کا سبب بنتا ہے وہ صارف کا کسی بھی چیز میں پایا جانے والا شوق و ذوق اور اس کی دلچسپی ہے۔

پس اشیاء کی قیمتوں میں، صارف کا ذوق اور اس کی ترجیحات جھلک رہی ہوتی ہیں۔ صارف کی پسند اور اس کا ذوق کارخانوں اور کمپنیوں کے لیے راہنمائی خطوط وضع کرتا ہے کہ جس کی روشنی میں کمپنیز، کارخانوں اور دیگر پیداواری اداروں اور ذرائع کو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فی زمانہ صارفین کی دلچسپی کن اجناس میں زیادہ اور ان کی ضروریات کن چیزوں سے زیادہ وابستہ ہیں۔ پس اس دوران میں نئے کارخانے لگانے والے مالکوں نیز پرانے کارخانوں اور کمپنیز کے مالکوں کو اشیاء کی اجناس اور پیداوار کے حوالے سے راہنمائی صارف کے ذوق سے وابستہ ہے۔

---

[1] Stabilizing an Unstable Economy, Hyman Minsky, Yale University Press, 2008, p.57

لہذا کمپنیز پیداوار کے لیے کسی ایسی جنس کا انتخاب کریں گی کہ جس کی آنے والے دنوں میں ڈیمانڈ بہت زیادہ ہو، لہذا اب اسکی قیمت بھی بلند رہنے کا امکان ہو۔ اور یہ امور بالآخر صارفین کی پسند اور ترجیحات پر انحصار کریں گے۔ یوں سرمایہ دارانہ معیشت کی منڈی میں صارف سب سے بڑی خود مختار طاقت کا نام ہے۔ دوسروں لفظوں میں قیمتوں کا تعین وہی کرتا ہے اور پروڈیوسر اس کے لیے وہی اجناس پیدا کرتے ہیں جن کو وہ چاہتا ہے۔ ان کے ذوق کے عین مطابق سرمایہ دار جتنی زیادہ اشیاء پیدا کرے گا اتنا ہی زیادہ منافع کما سکے گا۔ اگر بالفرض صارف کسی بھی آجر، کمپنی، کارخانے یا پروڈیوسر کی چیز میں دلچسپی نہیں لیتا یا اس کے لیے کم قیمت کا تعین کرتا ہے تو ان کی قسمت ان کے حق میں کچھ بھی اچھا نہیں کر سکے گی۔[1]

یہی وجہ کہ جب بھی صارف اپنی دلچسپی، پسند، ذوق یا ترجیحات کی تعیین کر دیتا ہے تو آجر فوراً پیداواری عمل کے ذریعے اپنا رد عمل دیتا ہے، اور یوں جب وہ صارف کی پسند کے مطابق نئی اشیاء پیدا کرتا ہے تو اشیاء کی پیداوار کے ساتھ ساتھ وسائل کی تقسیم بھی عمل میں آتی ہے۔ یہی وہ امر ہے جس کے ناطے صارف کو پیداواری عمل کی ایک خود مختار طاقت کہا جاتا ہے۔

صارف کی فوقیت کی بندشیں

سرمایہ دارانہ نظام میں صارف کو دی گئی خود مختاری کی کچھ حدود و قیود ہیں، جن کی وجہ سے کچھ لوگ اسے محض خیالی چیز سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ صارف کی حکمرانی کے رستے میں آنے والی حدود و قیود درج ذیل ہیں۔

آمدن کی غیر مساویانہ تقسیم(Unequal Income Distribution)

سرمایہ دارنہ معاشرے میں صارف کی خود مختاری، افرادِ معاشرہ میں آمدن کی غیر مساویانہ تقسیم کی وجہ سے محدود و مقید ہو جاتی ہے، چونکہ ایک ایسا صارف جو غریب ہے اس کے سامنے پیداوار یا مصنوعات میں سے انتخاب کے محدود مواقع ممکن ہوتے ہیں، لہذا جب اس کے پاس محدود آمدن اور کم وسائل کی بنیاد پر ہر چیز کو خریدنے کے امکانات موجود نہیں ہوتے تو اس کی خواہشات ادھوری اور نامکمل رہ جاتی ہیں اور ان کی تکمیل فرد کے معاشی مسائل کی وجہ سے ممکن نہیں رہتی۔ یہ بات تو فقط امیر صارفین کے حصے میں آتی ہے کہ وہ پیداوار یا اشیاء کی مختلف اقسام میں سے اپنی مرضی کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ پس پیداوار کی غیر منصفانہ اور غیر مساویانہ تقسیم کی وجہ سے صارف کی کامل حاکمیت یا خود مختاری کا عملی وجود ناپید اور ناممکن ہو جاتا ہے۔

---

[1] The Secularization of the European Mind in the Nineteenth Century, Owen Schadwick, Cambridge University Press, p.141

مال کی عدم دستیابی (Availability of Goods)

صارف کی مرضی اور اختیار فقط ان اجناس تک محدود ہوتا ہے کہ جن کو مقامی مارکیٹ میں تیار کیا جاتا ہو۔ جس کے نتیجے میں اشیاءِ خرید و فروخت کی دستیابی بھی، ملک میں موجود ٹیکنالوجی اور قدرتی وسائل کی دستیابی پر منحصر ہے۔ مثال کے طور پر ایک گاؤں میں ایک صارف ایسے موبائل فون خریدنے کی خواہش کرتا ہے کہ جس کی اس ملک یا دیہات میں دستیابی ہی نہیں ہے، پس ایسے صارف کا کسی چیز کو خریدنے کی خواہش کرنا کافی نہیں ہے اور نہ ہی اُس خواہش کے حوالے سے اس کو خود مختاری یا حکمرانی حاصل ہے چونکہ اس کی خواہش کردہ چیز عملاً اس علاقے میں حاصل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ پس ایسے صارف کی خود مختاری محدود خود مختاری تصور کی جائے گی۔[1]

---

[1] Economics, Ethics and Religion(Jewish, Christian and Muslim Economic Thought), Rodney Wilson, Palgrave Macmillan UK, 1997, p.131

اجتماعی خواہش(Combined Choice)

کسی واحد صارف کی خواہش کو اشیاء کی پیداوار میں حکمرانی حاصل نہیں ہے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ کوئی سا صارف اپنی مرضی سے کسی بھی پیداوار کی خواہش کرے، تو پروڈیوسر یا آجر حضرات اس کی اس خواہش میں خود مختاری اور حکمرانی کو تسلیم کرتے ہوئے ہر ہر صارف کے لیے ان کی مرضی کی الگ الگ مصنوعات تیار کریں۔ بلکہ صارفین کی وہ اجتماعی خواہش جو کہ قیمتوں کی میکانیت کو کنٹرول کرتی ہے، وہ اشیاء و مصنوعات کی تیاری اور فراہمی کے لیے خود مختار حیثیت کی حامل ہوتی ہے اور آجر حضرات اسی کی پسند ،ذوق اور ترجیحات کے مطابق مصنوعات تیار کر کے مارکیٹ میں لاتے ہیں یوں صارفین کی اجتماعی مرضی اور ذوق وخواہش بازار اور مارکیٹ میں آنے والی پیداوار میں حاکم وخود مختار ہوتا ہے۔

اشتہارات(Advertisement and Propaganda)

موجودہ زمانے میں مارکیٹ یا بازار کی قوتوں میں ایک قوت کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے مصنوعات کے اشتہارات کا رواج۔ فری مارکیٹ اکانومی میں صارف کی حکمرانی کو جس چیز نے سب سے زیادہ زچ پہنچائی وہ اشتہارات اور ایڈز (Ads) ہیں۔ عموماً ان اشتہارات میں صارف کی ضرورت وحاجت کی بجائے فرمز اور کمپنیاں اپنی ذاتی دلچسپی اور منافع کی بنیاد پر مصنوعات تیار کرتی ہیں اور پھر انہیں مختلف اشتہارات کی صورت میں صارف کی ضرورت کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ ان اشتہارات میں سیلز مین شپ کے طور پیش کیے گئے اشتہارات، آزمائشی بنیادوں پر نمونے مفت فراہم کرنا، گھروں تک فری ڈیلیوری سروسز، اخبار کے اشتہارات، میڈیا پر کمرشل نشریات وغیرہ صارفین کی خود مختاری کی پالیسی کو نقصان پہنچاتے ہیں اور انہیں غیر محسوس انداز میں ان اشیاء کی خریداری کی طرف راغب کرتے ہیں جو ان کی ضرورت کم اور فرمز کی تجارت وکاربار کا ذریعہ زیادہ ہوتی ہیں۔[1]

صارف اشتہارات اور رنگ رنگ قسم کی چیزوں سے متاثر ہو جاتا ہے اور ان سے دھوکہ کھا کر اپنی ترجیحات کو مدنظر رکھنے اور اپنی ضروریات کے مطابق فیصلہ کرنے کی بجائے غیر ضروری چیزوں کا انتخاب کر بیٹھتا ہے اور اپنی ضرورت کی اشیاء کا انتخاب کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔

---

[1] Happiness and Economic Performance, Andrew Oswald, Economic Journal, Vol. 107:445, p. 185-188

اجارہ داریاں(Monopoly)

فرمز اور کمپنیوں کی اجارہ داری اور ان کا باہمی گٹھ جوڑ بھی صارف کی خود مختاری کے رستے ایک رکاوٹ کے طور پر سامنے آتا ہے، کیونکہ افراد یا کمپنیوں کی اجارہ داری کے ہوتے ہوئے صارف انہی کی طرف سے پیدا کی گئی مصنوعات کو ان کے مقرر کردہ داموں سے خریدنے پر مجبور ہوتا ہے۔ صارف اگر اشیاء صرف وضرورت خریدنا چاہتا ہے تو اجارہ داریوں کی موجودگی میں اس کے پاس اپنی ضروریات کی خاطر اُن کی مصنوعات کو خریدنے سے ہٹ کر کوئی متبادل رستہ موجود نہیں۔[1]

حکومتی وریاستی پابندیاں(Government Restrictions)

حکومتیں بھی بعض اشیاء کی پیداوار اور کھپت کو کنٹرول کرتی ہیں جس کی وجہ سے صارف کی خود مختاری خطرے کی زد میں ہوتی ہے۔ مثلاً شراب اور ممنوعہ ادویات کو نہ صرف یہ کہ سخت حکومتی نگرانی میں رکھا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات حکومت پابندی بھی لگا دیتی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اشیاء ضروریہ مثلاً مٹی کا تیل، چاول، گندم، چینی وغیرہ کی پیداوار، تقسیم اور نگرانی بھی صارف کی خود مختاری کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ اس طرح کی پابندیاں صارفین کی پسند کو محدود کر دیتی ہیں۔

اس کے علاوہ حکومتوں کی طرف مختلف اجناس پر لگائے گئے ٹیکس اور انکم ٹیکس وغیرہ بری طرح صارف کی خود مختاری کو متاثر کرتے ہیں۔ حکومت کی طرف سے اشیاء ضروریہ یا دیگر اجناس پر لگایا جانے والا کسی قسم کا ٹیکس بلکہ یہاں تک کہ انکم ٹیکس بھی صارف کی آمدن کو کم کرنے کا سبب بنتے ہیں، یوں اسکی قوت خرید متاثر ہوتی ہے اور ایک بار پھر اس کی خود مختاری چیلنج ہو جاتی ہے۔

[1] Will Raising the Income of all Increase the Happiness of All?, Richard Easterlin, Journal of Economic Behaviour and Organization, 27:1, p. 35:48.

فصل پنجم

ذاتی کاروبار کے مواقع اور عوامی آگاہی فراہم کرنا

غربت موجودہ دنیا پیچیدہ ترین اور گھمبیر مسئلہ ہے۔ایک اندازے کے مطابق سن 2013ء میں دنیا بھر میں 2.47 بلین لوگ غربت کی لائن کے نیچے یعنی فی کس دوڈالر یومیہ سے بھی کم آمدن کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہے تھے، جن میں اکثریت کا تعلق براعظم ایشیا اور افریقہ کے خطے سے تھا۔ غربت زدہ افراد کی تعداد 1981ء میں 59ء2ریکارڈ کی گئی تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان 1981 سے 2013 کے درمیان غربت فقط 59ء2 سے کم ہو کر فقط 2.47 بلین تک آئی، اور ان میں سے بھی اکثر افراد کا تعلق ترقی یافتہ ممالک سے تھا۔

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ غربت آمدن کی کمی، اثاثہ جات کی محدودیت اور اہلیت و اعتماد کی کمی کا دوسرا نام ہے۔ غربت افراد اور گھرانوں کی کم پیداواری صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے، اسی سبب وہ معاشی مشکلات اور ذاتی کاروبار و تجارت کے مواقع میں مشکلات سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ مشہور معیشت دان ایلن سنگر(Alan E.Singer)غربت کے علاج کا سب سے بہترین طریقہ ذاتی کاروبار یا ذاتی معاشی مصروفیات کو قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> "The best cure for poverty alleviation in any region of the world lies in encouraging more on business activity and startup the new ventures through entrepreneurship development."[1]
>
> ترجمہ: دنیا کے کسی بھی خطے میں غربت کے علاج کا دارومدار وہاں تجارتی مصروفیات کی حوصلہ افزائی کرنے پر ہے ،تاکہ ذاتی کاروبار اور ذاتی کام کی مہم جوئی (entrepreneurship development)شروع کی جاسکے۔

دراصل ذاتی کاروبار اور ذاتی کام کے مواقع ،نئے مواقع کی تخلیق اور اقتصادی ترقی وتبدیلی کے لئے ایک بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ دوسری طرف اقتصادی ترقی، پیداواری مواقع کے زیادہ سے زیادہ امکانات کے پیدا کیا جانے، نئی نئی مصنوعات اور اشیاء کی تخلیق اور خدمات کو اپنانے اور نئی مہارتوں اور نئے علوم کو آزمانے کو دعوت دیتی ہے اور انہی چیزوں پر انحصار کرتی ہے۔ اقتصادی ترقی کے دائرے میں یہ تبدیلیاں ان مہم کاروں کے ذریعے ہی لائی جاسکتی ہیں جو اپنے ذاتی کاروبار کے ذریعے نئے نئے مواقع کی تخلیق کرنے کے علاوہ صلاحیتوں کو آزمانے کے لیے میدان تیار کرتے ہیں۔

---

[1] Business strategy and poverty alleviation, Alan. E. Singer, Journal of Business Ethics, vol.66,2006, p. 225-231

ذاتی کاروبار کے مواقع اور معاشی فردی مصروفیات در حقیقت بہت سارے معاشی و اقتصادی ترقی کے پہلوؤں کی راہ کھولتے ہیں۔اس کی وجہ سے سرمائے کے تمام عوامل حرکت میں آتے ہیں، آجر، مزدور، محنت اور ٹیکنالوجی سب چیزیں جو کہ کسی بھی چیز کی پیداوار کے بنیادی عوامل ہیں، وہ متحرک ہوتے ہیں اور سرمائے کی پیدائش و گردش عمل میں آتی ہے۔معاشی واقتصادی میدان میں نئے کامیاب منصوبے شروع ہوتے ہیں جو کہ بعد میں مقامی سطح پر ترقی کے مواقع پیدا کرنے اور براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری پر انحصار کم سے کم کرنے کا سبب بنتے ہیں۔[1]

اس طرح کے کاروباری مواقع سے نہ صرف ذاتی کاروبار بلکہ اس کے پیداواری عمل میں شریک دیگر تمام عوامل کے لیے بھی معاشی ترقی و بہتری کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔جن میں اس کو مال سپلائی کرنے والے ٹرانسپورٹرز، خام مال کی سپلائی کرنے والے گودام اور ان چیزوں کی نقل و حرکت کے لیے استعمال ہونے والی مشینری و مزدور وغیرہ شامل ہیں۔اس سارے کاروباری عمل کے نتیجے میں دیگر تمام کمانے والے افراد کے ساتھ ساتھ، کاروبار کرنے والا فرد اور مزدور طبقہ معاشی حوالے سے زیادہ خومختار اور آزاد ہو جاتے ہیں اور اپنی زندگی کے معاشی چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیے زیادہ بااعتماد ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ذاتی کاروبار نہ صرف کسی بھی معیشت میں فرد کی آمدنی کو بااختیار بنانے کے نظریے کو فروغ دیتا ہے بلکہ ترقی یافتہ دنیا میں یہ اقتصادی ترقی کی حوصلہ افزائی اور غربت کے خلاف جنگ کے لئے ایک نیا اور مؤثر نقطہ نظر فراہم کرتا ہے۔[2]

ذاتی کاروبار کے مواقع کا آغاز ہو یا بعد میں ان کی توسیع یہ ہمیشہ دیگر افراد کے لیے روزگار کھولتے ہیں، اور ان میں توسیع کی صورت میں نئی مارکیٹس، نئی صنعتیں، نئی ٹیکنالوجی، انڈسٹریل فارمز، ملازمتوں نیز اصلی پیداوار میں نیٹ اضافہ اور آمدن میں اضافہ کی کئی صورتیں سامنے آتی ہیں۔نہ صرف یہ بلکہ ان کاروباری مواقع کی صورت میں آنے والے منافع کی وجہ سے رہن سہن کے معیار میں اضافہ ہوتا ہے، اور جیسے جیسے کسی بھی ملک میں لوگوں کا ذاتی کاروبار بڑھتا ہے، اس حساب سے غربت کے اشاریوں

---

[1] Knowledge creation and human capital for development: the role of graduate entrepreneurship, Jay Mitra, Y.A. Abubakar, M. Sagagi, Education & Training, Vol. 53, 2011,

[2] Entrepreneurship, job creation, income empowerment and poverty reduction in low-income economies, Deodat E. Adenutsi, Munich Personal RePEc Archive (MPRA),

میں کمی آتی چلی جاتی ہے۔یوں لوگوں کا ذاتی کاروبار موجودہ صورتوں میں عالمی غربت کو کم کرنے کے لیے اپنا نہائت اہم اور گہرا کردار ادا کرتا ہے۔[1]

ذاتی کاروبار یا کہ پرائیویٹ سیکٹر ڈویلپمنٹ Private Sector Development) مختلف شکلوں اور صورتوں میں معاشرے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہوتا ہے۔یہ براہ راست فرموں کے ساتھ کام کرنے کے ذریعے بھی ہو سکتا ہے، رکن تنظیموں میں ان کی نمائیندگی کرنے کے ذریعے یا پھر مسابقتی منڈیوں کو فروغ دینے کی صورت میں ہو سکتا ہے۔

افرادِ معاشرہ کی ذاتی کاروبار میں دلچسپی اور نجی کاروباری شعبے کی وجہ سے کسی بھی معیشت میں تجارتی مہم جوئی کی فضا تشکیل پاتی ہے اور سرمایہ دار مسابقتی ماحول میں تجارتی خطرات سے کھیلتے ہوئے کاروبار میں جدت لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، یوں اعلی معیار اور ترقی کی حامل کمپنیوں اور فرمز کی تشکیل عمل میں لائی جاتی ہے۔اسی بنا پر آج نجی کاروباری سیکٹر معاشی ترقی کا سب سے بڑا اور اہم مہرہ ہے۔ چھوٹی صنعتوں یا فرمز سے ایک سرمایہ دار اپنے ذاتی کاروبار کا چھوٹے پیمانے پر آغاز کے بعد کاروبار کو توسیع دینے اور اس کے ذریعے بھرپور استفادہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی محرک کے نتیجے میں وہ ملکی معیشت کے لیے دولت اور خاص طور روزگار کی ایک خاصی بڑی تعداد کی تخلیق کرتا ہے، جس کے معاشی و سماجی ترقی پر گہرے اور دور رس نتائج مرتب ہوتے ہیں جو غربت کی خلاف جنگ لڑنے کے لیے ایک آلہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں۔[2]

دنیا میں موجود چار ارب یا اس سے زیادہ غریب لوگوں کی غربت و افلاس کو دور کرنے کے لیے کاروباری سرگرمیوں کو بطور حل پیش کرنے والوں میں CK Prahalad کا نام سرفہرست آتا ہے جب انہوں نے 2004 میں اپنی کتاب Fortune at the Bottom of the Pyramid: Eradicating Poverty Through Profits کے ذریعے بہت سارے کاروباری

[1] Entrepreneurship development and poverty reduction: Empirical survey from Somalia, Ali Yassin Shaeikh Ali and Abdel Hafiez Ali, American International Journal of Social Science, vol.2 2013, p.108-113

[2] Entrepreneurship, job creation, income empowerment and poverty reduction in low-income economies, Deodat E. Adenutsi, vol. 29569,2009, p.1-21

کارپوریشنز اور کاروباری اداروں میں کاروبار اور کاروباری مصروفیات کو غربت کے حل کے طور پر متعارف کرایا اور ان کے اس آئیڈیا کو بزنس کمیونٹی میں بھرپور پذیرائی ملی۔[1]

ہاورڈ بزنس سکول (Harvard Business Schoo) کے ایک پراجیکٹ میں شریک اقتصادی امور کے ماہرین Kash Rangan، John Quelch اور دیگر فیکلٹی ممبران کا اس بات پر اتفاق تھا کہ افراد کو قائل کیا جانا چاہیے کہ اپنے ذاتی کاروبار کے شروع کرنے یا پہلے سے موجود کاروبار کو پھیلانے کی صورت میں نہ صرف ترقیاتی اہداف کا حصول آسان ہو جائے گا بلکہ اس کے ذریعے غریب ترین افراد اور خاندانوں کو غربت سے نکالنے اور ان کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے حوالے سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔Rangan کے مطابق دنیا کی ابھرتی ہوئی معیشتوں میں ابھی تک ذاتی کاروبار کی عملی کوششیں بالکل ابتدائی مرحلے میں ہیں۔ابھی تک کا یہ تجربہ بہت اچھا ثابت ہو رہا ہو لہٰذا اس تجربے کی روشنی میں ہمیں لوگوں کو ان کے کاروبار اور بزنس کی طرف راغب کر کے معاشرتی بدحالی اور غربت کا خاتمہ کرنا ہو گا۔[2]

پول پولاک (Paul Polak) اور مال ویرک (Mal Warwick) کے مطابق بڑے پیمانے پر کیے جانے والے کاروبار اور کاروباری سرگرمیاں غربت کے خاتمے کے لیے اس قدر موزوں اور مفید نہیں ہیں جس قدر چھوٹے اور درمیانے درجے کے کاروبار۔ اس امر کی وجہ یہ ہے کہ بڑے کاروباری ادارے اکثر ایسی مصنوعات بنانے میں ناکام رہے ہیں جو دراصل چھوٹے درجے کے حامل گاہکوں کی ضروریات اور خواہشات کو پورا کر سکتے ہوں۔ وہ کاروبار جو اس بازار میں کامیابی چاہتا ہو چاہیے کہ وہ اپنے صارفین سے آگاہی رکھتا ہو اور انکی ضرورتوں کو سمجھتا ہو اور انکے مالی حالات اور ضروریات کے مطابق بازار میں اشیاء اور پیداوار کو پیش کرتا ہو۔[3]

پول پولاک (Paul Polak) تاجر حضرات کے کاروبار کی کامیابی کے لیے اپنی کتاب Out of Poverty: What Works When Traditional Approaches Fail میں مزید راہنمائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ایک کامیاب کے لیے

---

[1] Fortune at the Bottom of the Pyramid: Eradicating Poverty Through Profits, C. K. Prahalad, Pearson Prentice Hall, 2006, p.137

[2] The Business of Global Poverty, Garry Emmons, Howard Buisness School Working Knowledge. Retrieved july 20, 2017

[3] The Business Solution to Poverty: Designing Products and Services for Three Billion New Customers, Paul Polak & Mal Warwick, Berrett-Koehler Publishers, 2013,

ضروری ہے کہ اس کی بنائی گئی پیداوار اور اشیاء بین الاقوامی معیار کی ہوں اور ان کی کم از کم ایک بلین افراد تک رسائی ممکن ہو، نیز اس کی ترسیل اور نقل و حمل اس قدر آسان ہو کہ اس کو دنیا کے کسی بھی خطے تک پہنچانا آسان ہو یہاں تک کہ یہ ان علاقوں میں بھی بآسانی دستیاب ہو سکے کہ جہاں روڈ بھی موجود نہیں۔ علاوہ ازیں اس کو بنیادی طور پر اس قدر سستا ہونا چاہیے کہ یہ ایسے شخص کی پہنچ میں بھی ہو کہ جس کی یومیہ آمدن دو ڈالر یا اس سے بھی کم ہو۔[1]

غربت میں کمی کے لیے ذاتی و نجی کاروباری مواقع کا کردار

بے روزگاری کی وجہ سے دنیا بھر میں اور بالخصوص ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک میں فقر و افلاس کے خلاف لڑی جانے والی جنگ اور کوششیں بری طرح متاثر ہو رہی ہیں۔ ان ممالک کی ترقی میں یہ مسئلہ ایک اہم رکاوٹ ہے جس کی وجہ سے وہ نہ صرف ابھی تک پسماندہ یا غربت زدہ ممالک کی فہرست میں شامل ہیں، بلکہ آئے روز ان کی غربت و افلاس ان کی پسماندگی اور دوسروں پر انحصار کے رویوں کو مزید بڑھاتی جا رہی ہے جس سے نہ صرف ان ممالک یا اقوام کی معاشی ترقی متاثر ہو رہی ہے بلکہ ان کی معاشی و سماجی بنیادیں بھی لڑکھڑا رہی ہیں۔

اگرچہ مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان غربت اور بے روزگاری کی شرح اور شدت مختلف ہونے کا مشاہدہ کیا گیا ہے، یعنی ایسا نہیں کہ تمام ممالک میں بے روزگاری کی شرح ایک سی ہو یا مثلاً غربت کی شدت تمام ممالک و اقوام میں ایک سی نہیں ہے، لیکن یہ اب بھی انسانی وسائل کی زیادہ سے زیادہ قوموں کی دونوں سماجی اور اقتصادی ترقی کے لئے استعمال کرنے کے لئے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ اسی لیے ورلڈ بینک دنیا میں نسبی فقر اور مطلق فقر[2] دونوں درجہ بندیوں کی موجودگی اور ان کی وجہ سے لاحق خطرات کی طرف اپنی رپورٹس میں بار بار متوجہ کر رہا ہے۔[3]

ابتدائی طور پر غربت کا تعلق مختلف اور متعدد محرومیوں سے ہوتا ہے جیسا کہ جیسا کہ تعلیم اور شعور کی کمی، بیماری، معاشی پیداوار کے مواقع کی عدم دستیابی، بیماری اور کمزوری وغیرہ جیسے متعدد عوامل اور محرومیاں غربت و افلاس کو جنم دیتی ہیں۔

---

[1] Out of Poverty: What Works When Traditional Approaches Fail, Paul Polak, Berrett-Koehler Publishers, 2008, pg:165

[2] ان دونوں کی تعریف باب اول میں گزر چکی ہے۔

[3] Do women entrepreneurs play a role in reducing poverty? A case in Kenya, S. B. Misango and O. K. Ongiti, International Review of Management and Business Research, vol. 2, 2013, p. 87-103

افراد معاشرہ کے اندر سرایت کر جانے والی غربت کے علاج کا ایک حل نجی کاروباری شعبہ یا افراد کی ذاتی کاروبار میں دلچسپی ہے۔ دراصل اس مقصد کے پیچھے یہ سوچ کارفرما ہے کہ نئے کاروباری مواقع کو زیادہ سے زیادہ پیدا کیا جائے، نیز پرانے کاروبار کو مزید وسعت دینے کے لیے ہر طرح کی ممکنہ سہولت اور تعاون میسر کی جائے تاکہ اقتصادی وسائل میں تحرک اور گردش باقی رہے۔ نجی کاروباری شعبہ کو جب ان معاملات کی اجازت اور ماحول دستیاب ہوتا ہے تو وہ خطرے اور غیر یقینی حالات کے باوجود اپنے ذاتی کاروبار کو منافع بخش بنانے کے لیے سر توڑ محنت و کوشش کرتے ہیں۔

ذاتی کاروباری مواقع اور نجی کاروباری شعبے کے ہوتے ہوئے یہ بات یقینی ہوتی ہے کہ دولت کا بہاؤ اور گردش اس کے ضمن میں باقاعدگی سے تخلیق ہوتا رہتا ہے اور ملک کی معیشت جمود کا شکار نہیں ہوتی چونکہ افراد اور نجی سیکٹر باقاعدہ طور پر کاروباری سرگرمیوں کے فروغ میں سرگرمِ عمل ہوتے ہیں اور ان کا ذاتی فائدہ بھی اسی چیز میں ہوتا ہے کہ دولت گردش کرتی رہے اور ان کو اپنا حصہ منافع کی صورت میں ملتا رہے۔

نجی کاروباری شعبہ اور ذاتی کاروباری عوامل داخلی اور مقامی صنعتوں کی ترقی اور فروغ کے لیے بنیادی اور کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ذریعے مقامی خام مال کو پرسیسنگ کے ذریعے ملکی و غیر ملکی نیز گھریلو صنعتوں کے لیے آمادہ کیا جاتا ہے۔ نجی شعبے نے چھوٹے اور درمیانے پیمانے پر اداروں میں بہتر اور مؤثر سرمایہ کاری اور مفید و موزوں ٹیکنالوجی کے استعمال کو بھی فروغ دیا ہے جس سے دولت کی گردش اور بہاؤ میں تیزی آتی ہے جو افلاس اور فقر کی راہ میں رکاوٹ کی صورت ظاہر ہوتا ہے۔[1]

ڈاکٹر Kuratko اور R. Hodgetts اس شعبے کی افادیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

> "Entrepreneurship is a dynamic process of vision, change and creation"
>
> ترجمہ: نجی و ذاتی کاربار کا شعبہ، معاشی تبدیلی و تخلیق اور اقتصادی ترقی و بہتری کے لیے ایک متحرک عمل ہے۔

کسی بھی ملک کے اقتصاد میں نجی شعبہ بہر صورت ایک کلیدی کردار ہے۔ یہ نہ صرف معاشی خود مختاری کی طرف ایک قدم ہے بلکہ یہ اپنی معاشیات کے انتظامی امور کو خود ترتیب اور انجام دینے کا دوسرا نام ہے، اس شعبے کی بدولت صارفین میں تخلیقی

[1] Entrepreneurship : theory, process and practice, Howard H. Frederick, Donald F. Kuratko and Richard M. Hodgetts, South Melbourne Thomson Learning,

سوچ، کاروباری مواقع کی تلاش، معاشی جدت کے پہلو اور مثبت مالی تبدیلیوں کا رجحان جنم لیتا ہے جو ہر عنوان سے سراسر معاشرے کے مالی و اقتصادی فائدے میں ہے۔[1]

ذاتی کاروباری سرگرمیوں یا پرائیویٹ سیکٹر ڈیویلپمنٹ (Private Sector Development) کی اہمیت کے پیش نظر دنیا بھر میں اسکی قدر بڑھی ہے۔ ذاتی کاروبار یا نجی معاشی سرگرمیوں کی صورت میں آجر یا سرمایہ دار، معاشرے میں موجود صارفین کی ضروریات کے پیش نظر معاشی میدان میں نئی پیداوار و خدمات کو پیدا کرنے کے خطرات مول لینے سے چوکتے نہیں ہیں۔ نجی سیکٹر کے تاجر حضرات کا یہ جارحانہ معاشی رویہ ان کی مقبولیت اور کامیابی کی وجہ ہے، اسی سبب سے موجودہ دنیا میں اس شعبے کو قوموں کی معاشی ترقی کے لئے مرکزی نکتہ سمجھا جانے لگا ہے۔[2]

پرائیویٹ سیکٹر ڈیویلپمنٹ کی وجہ سے تاجر حضرات کی خود مختاری، خود انحصاری اور خطرناک معاشی معاملات میں خطرناک معاشی اقدامات اٹھانے جیسے معاملات میں اضافہ ہوا ہے۔ اس سیکٹر کی وجہ سے بڑی تعداد میں کاروباری مواقع پیدا ہوتے ہیں۔ اس بات کے مضبوط تجرباتی ثبوت موجود ہیں کہ نجی شعبہ یا ذاتی کاروباری مصروفیات غربت میں کمی کی وجہ ہیں اور ان کے ذریعے غربت کے گراف کو مزید کم کیا جاسکتا ہے۔ مالی پسماندگی میں مبتلا کسی بھی غربت زدہ معاشرے کو معاشی ترقی ہی اس ناسور سے نجات دلا سکتی ہے اور معاشی ترقی و خوشحالی کے لیے نجی معاشی شعبہ یا پرائیویٹ سیکٹر سب سے بڑے عامل کے طور پر سامنے آرہا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ کاروباری ترقی اقتصادی ترقی کی شرح میں نمایاں اضافے کا سبب ہے۔

سنگاپور، تائیوان، تھائی لینڈ اور جنوبی کوریا جیسے ممالک کی صنعتی ترقی میں اکانوے سے ترانوے فیصد شئیر مائیکرو، چھوٹے اور درمیانے درجے کے ادارروں کا ہے، جنہیں فرد واحد یا چند افراد مل کر چلاتے ہیں۔ ان ممالک میں ملازمتوں کے مواقع پیدا کرنے کے حوالے سے ان اداروں کی شراکت داری تقریباً 35 سے 61 فیصد کے درمیان ہے۔ ملائیشیا کے اندر مختلف اداروں کی تشکیل کے لیے ان اداروں کا تناسب 84 فیصد ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ ذاتی کاروبار کے لیے تشکیل پانے والے یہ چھوٹے اور درمیانے

---

[1] Entrepreneurial leadership learning: In search of missing links, A. Bagheri and Z. A. L. Pihie, Procedia-Social and Behavioral Sciences, 2010, vol. 7, pp. 470-479

[2] Entrepreneurship education in Sub-Saharan African universities, Jean D. Kabongo & John O. Okpara, International Journal of Entrepreneurial Behaviour & Research,

درجے کے ادارے بعد میں خود کو بڑی اور ملٹی نیشنل کمپنیوں سے منسلک کر لیتے ہیں، جیسا کہ جاپان، امریکا، برطانیہ، جرمنی اور کینیڈا وغیرہ میں یہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔[1]

تجارتی و کاروباری اداروں کے علاوہ کاروبار کی ایک اور قسم بھی متعارف ہو چکی ہے جس کا نام Social Entrepreneurship یا سماجی کاروباری اپروچ ہے، یعنی سماجی مقاصد کے لیے کی جانے والی کاروباری سرگرمی۔ سماجی کاروباری اپروچ در حقیقت مہارت، ہنر اور صنعت کار افراد کے وسائل کو ترقی پذیر ممالک کو درپیش مشکلات جیسا کہ تعلیم، صحت، امن عامہ، سماجی ترقی، معاشی خوشحالی اور غربت کے خاتمہ وغیرہ کے لیے استعمال کرنے کا نام ہے۔ سماجی کاروباری اپروچ نے ایک عالمی رجحان تیار کیا ہے جس میں معاشرتی مسائل کو کم کرنے کے لئے جدید نقطہ نظر کا استعمال کیا جاتا ہے۔[2]

سماجی کاروباری اپروچ (Social Entrepreneurship) جدید طریقہ کے ساتھ سماجی اقدار کو تخلیق کرنے کے لیے کاروباری مواقع کو تلاش کرنے اور وسائل کا پیچھا کرنے کا عمل ہے۔ جدید سماجی کاروباری ادارے جدید معاشی نظریات کے حامی، کہنہ مشق، وسائل سے مالا مال اور نتائج پر مبنی طریقہ کار کے حامل ہیں۔ ایسی حکمت عملی تیار کرنے کے لیے جو زیادہ سے زیادہ سماجی اثرات کی حامل ہو، یہ ادارے کاروباری اور غیر منافع بخش دنیا دونوں میں سب سے بہترین سوچ پر مبنی ہیں۔ ذاتی کاروبار اور منافع کی غرض سے سامنے آنے والے یہ کاروباری رہنما ہر طرح کی تنظیموں، افراد اور اداروں کے ساتھ چاہے وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، نئے ہوں یا پرانے، مذہبی ہوں یا سیکولر اور منافع بخش ہوں یا غیر منافع بخش ہر ایک کے ساتھ کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی کامیابی کے امکانات دیگر ریاستی سرگرمیوں کی نسبت نہایت زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ دنیا کا معاشی میلان اس سیکٹر کی طرف بہت زیادہ بڑھ چکا ہے۔

خلاصہ کلام

اس وقت ساری دنیا کو بالعموم اور اکثر اسلامی ممالک کو بالخصوص درپیش سنگین اور تشویشناک مسائل میں سے ایک اہم اور فوری غور و فکر اور موثر حل کا متقاضی مسئلہ غربت و افلاس ہے جس نے لوگوں کو خودکشیوں پر مجبور کر رکھا ہے۔ دنیا میں موجود اس

---

[1] The accessibility of the government-sponsored support programmes for small and medium-sized enterprises in Penang, Moha Asri Abdullah, Cities, vol. 16, 1999, p. 83-

[2] A conceptual model for social entrepreneurship directed toward social impact on society, Hao Jiao, Social Enterprise Journal, vol. 7, 2011, p.130-149

مسئلے اور مشکل سے نجات حاصل کرنے کے لئے کئی طرح کی حکمت عملیاں موجود ہیں۔ کسی بھی معاشرے کی فلاح اور کامیابی کے راہ پر گامزن ہونے کے اوپر یقین پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ وہ معاشرہ صنعتی ترقی، معاشی انصاف، معاشرتی اقدار، انسانی حقوق کے معیار، روزگار کے مواقع کی فراہمی اور دیگر بنیادی سہولیات کے لحاظ سے کس مقام پر کھڑا ہے۔

اس مشکل سے نجات حاصل کرنے کے لئے غریب ملکوں میں غربت سے رفاہ کی سمت حرکت کرنے اور اور اقتصادی ،سماجی اور ثقافتی میدانوں میں ترقی لانے کی ضرورت ہے۔ جس معاشرے میں اقتصادی ترقی نہیں ہے وہ اقتصادی کمزوری کی وجہ سے سماجی اور فلاہی سہولیات فراہم نہیں کر سکتا ہے۔ تجربہ سے پتہ چلتا ہے کہ غربت وافلاس سے مقابلے کے لئے مؤثر ترین طریقہ روزگار کا فراہم کرنا ہے۔ زراعت وصنعت اور دیگر تجارتی میدانوں میں سرمایہ کاری اور عالمی سطح پر تجارتی لین دین میں فعال کردار ادا کرکے اقتصادی حالات بہتر بنائے جاسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں مختلف طبقات کے درمیان ثروت کی منصفانہ تقسیم اور اجتماعی طور پر پایا جانے والا انصاف بھی اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔

مغرب کے توسیع پسند سامراجی ممالک کی پالیسیوں نے بھی ترقی پذیر ممالک کو سیاسی اور اقتصادی مشکلات مجملہ غربت وافلاس سے دوچار کر دیا ہے۔ لہذا غربت کی مشکلات کو دور کرنے میں ترقی پذیر ممالک کی ذمہ داری زیادہ بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مغربی ممالک جنگ اور جنگی اخراجات کے بجائے دنیا میں زراعت کی صورت حال کو بہتر بنائیں نیز اپنے ممالک اور دنیا کے دیگر ملکوں کے غریب لوگوں کی مدد کریں تو عالمی سطح پر غربت کی شرح میں ضرور کمی واقع ہو گی۔ بطور مسلم غریب ممالک کے ناقابل وصول قرضوں کی معاف اور جدید ٹیکنالوجی تک ان ممالک کی دسترسی کے لئے اسباب فراہم کر دیئے جائیں تو غربت میں کمی آئے گی اور دنیا کے ممالک کے درمیان توازن کے قیام کے لئے مؤثر ثابت ہو گا۔

نتائج بحث

ا۔ عربی لغات، اسلامی مصادر اور علمائے اسلام کی نگاہ میں فقر و افلاس کا مفہوم پیٹ بھرنے کے لیے دو وقت کا کھانا پاس نہ ہونے تک محدود نہیں بلکہ اس میں کسی بھی فرد بشر کا اپنی تمام بنیادی انسانی ضروریات آزاد اور خود مختار حیثیت میں پوری نہ کر سکنا اور اپنی حوائج وضروریات پوری کرنے کے لیے کسی غیر کی جانب دیکھنا سب شامل ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اگر کوئی بھی شخص اپنے مقام و منصب کے عین مطابق کھانا، پینا، لباس، رہائش، تعلیم، صحت کی مناسب سہولتوں اور دیگر تمام بنیادی ضروریات کو پورا نہ کر سکتا ہو، وہ بھی اس مفہوم میں شامل ہوگا اور فقراء و مساکین کے مخصوص فنڈ سے اس کی بھی مدد کی جائے گی۔ اسلام اس مقصد کے لیے ظاہری حالت کا پابند نہیں بلکہ یہ ذمہ داری افرادِ معاشرہ کو سونپی ہے کہ وہ باخبر رہیں کہ سماج کے اندر کون سے ایسے افراد ہیں جو ضرورت و احتیاج کی حالت کو پہنچے ہوئے ہیں۔

2۔ غربت و افلاس ایک کثیر الجہتی معاشی مسئلہ ہے، جغرافیائی اور ثقافتی حدود سے قطع نظر یہ مسئلہ انسانوں میں نسل در نسل اور ہر معاشرے میں موجود رہا ہے اور اس کے بھیانک اثرات فقط عقیدہ و ایمان، عائلی نظام، معاشرتی و سماجی مسائل، انسانی صحت اور اقتصادی معاملات تک محدود نہیں بلکہ اس کے اثرات نے انسانی فکر و شعور اور ذہن کو بھی بری طرح متاثر کرتا ہے۔

3۔ اسلامی تعلیمات فقط اخلاقیات ،ایمانیات، دعا اور عبادات سے ہی عبارت نہیں بلکہ اسلام تمام سماجی، فکری، معاشرتی، سیاسی، اور اقتصادی و معاشی معاملات میں اپنے اختراعی اصول وضوابط اور قوانین کا حامل ہے، جو اس کی اپنی ایجاد ہیں اور کسی اور معاشی مکتبِ فکر کی تقلید، امضاء یا مغلوبہ ہرگز نہیں۔ اس کی معاشی و اقتصادی تعلیمات ایسے اسلامی ضوابط پر مبنی ہیں جنہیں اسلام کے بنیادی مصادر ہی سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کا ہدف اخروی زندگی کی کامیابی کے ساتھ ساتھ خوشحال، پرسکون اور کامیاب دنیاوی زندگی بھی ہے جس کے لیے اس کے معاشی و اقتصادی قوانین وضوابط بے مثل و بے نظیر ہیں۔

4۔ اسلام میں انسان کی معاشی زندگی کے لیے وسائل و ذرائع کے حصول اور تقسیم کا متوازن اور مخصوص طریقہ وضع کیا گیا ہے۔ اسلام کی نظر میں نہ صرف دولت و مالداری کا حصول مباح و جائز ہے بلکہ اکتسابِ معیشت اور وسائلِ زندگی کے حصول کو اکلِ حلال اور لازمی دینی فریضہ کہا گیا ہے۔ ثروت مندی کو فضلِ الٰہی جبکہ فقر و فاقہ کو بطورِ اصلِ معاش ممدوح نہیں گردانا گیا بلکہ ایک ایسا پیچیدہ معاشی مسئلہ قرار دیا گیا کہ جس سے پناہ مانگنی چاہیے۔

5۔ اسلامی معاشی قوانین وضوابط حق معیشت میں مساوات پر مبنی ہیں۔ ان قوانین کے مطابق ہر چیز کی مالکِ اصلی صرف خدا کی ذات ہے، یہ قوانین تمام وسائل و ذرائع پیداوار سے ہر انسان کو فائدہ اٹھانے کا مساوی حق فراہم کرتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اسلام جس طرح حقِ معیشت میں مساوات کا داعی ہے اور ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے فراہم کردہ اسبابِ معشیت سے فائدہ اٹھانے

کا حق دیتا ہے، اسی طرح حالات کو سامنے رکھتے ہوئے درجاتِ معیشت میں تفاوت کی نشاندہی کرتا ہے۔یعنی اسلام میں معاشی مساوات کا مفہوم یہ ہے کہ ہر ذی روح کو دنیا میں رہنے کا حق حاصل ہو، محنت اور ترقی کے راستے سب کے لئے ہوں اوراسبابِ معیشت تک رسائی تمام افراد کو حاصل ہوتا کہ وہ نہ صرف اپنے واجب النفقہ افراد کے لیے بلکہ قومی وملی معیشت کی بہتری میں بھی اپناکردار ادا کرسکیں۔

6۔اسلام میں معاشی عدل وانصاف کے نظریے کا مطلب یہ ہے کہ وسائلِ رزق اور معیشت پر چند افراد کی اجارہ داری نہ ہو بلکہ معاش کی راہیں سب کے لیے یکساں طور پر کھلی ہوں، ہر انسان کو ان سے استفادہ کرنے اور فائدہ اٹھانے کے مساوی حقوق میسر ہوں اور ان کے اس حق کے حصول میں دیگر افرادِ معاشرہ کی جانب سے رکاوٹیں اور بندشیں پیدا نہ کی جائیں۔

7۔اسلام کے اقتصادی اصول، کلیات اور احکام ایک اٹل حیثیت رکھتے ہیں۔اسلام ضرورت سے زائد دولت جمع کرنے کو معیوب قرار دیتا ہے۔اس لیے کہ اسلامی نظام معیشت کا اصول، دولت کی مساوی تقسیم نہیں بلکہ منصفانہ تقسیم ہے۔اس کے وضع کیے گئے معاشی قوانین میں کسی بھی فرد کی اپنی ذاتی محنت ومشقت اور کاوش سے حاصل کی گئی حلال کی کمائی پر محروموں اور محتاجوں کا حق مقرر کیا گیا ہے۔یہاں ایسا نہیں ہے کہ کسی فرد نے جیسے اور جس قدر دولت کمائی ہے معاشرے کے دیگر افراد کا کوئی حق اس سے وابستہ نہ ہو۔

8۔اسلامی نظامِ معیشت میں مال ودولت کے حصول وکمائی کے ساتھ ساتھ اس کے استعمال وخرچ اور اس سے استفادہ کرنے کے لیے معاشی واخلاقی دونوں طرح کے قواعد وضوابط وضع کیے گئے ہیں جو کہ

اسلامی نظامِ معیشت کا درخشندہ باب ہیں۔اسلام اپنے نظمِ معیشت میں خدائی، اخلاقی اور مخصوص ریاستی پابندیوں کا قائل ہے اوراپنے ماننے والوں کو ان اصول وضوابط کا پابند ٹھہراتا ہے۔اسلام کی نظر میں کنجوسی وبخل ہو یا فضول خرچی واسراف وتبذیر ،یہ سبھی رویے ناپسندیدہ اور نامطلوب ہیں۔اور اس کی نظر میں پسندیدہ رستہ اعتدال ومیانہ روی یعنی اقتصاد کا راستہ ہے۔

9۔افرادِ معاشرہ کی اقتصادی ابتری اور بدحالی کو ختم کرنے کے لیے سرمایہ دارانہ نظام بھی کوشاں ہے جو کہ دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں رائج معاشی نظام بھی ہے۔معاشی آزادی، مسابقت ومقابلہ کی فضا، حکومت وریاست کی عدم مداخلت، نجی ملکیت اور ذاتی منافع کا محرک اس نظام کی وہ خصوصیات ہیں جو فقر وافلاس کے مسئلے کے حل میں معاون و مددگار ہوسکتی ہیں۔جب افراد معاشرہ کے لیے کام کرنے کے رستے میں آنے والی تمام بندشوں اور مواقع کی عدم دستیابی جیسے امور کو ختم کردیا جائے تو لوگ اس معاشی آزادی کے سبب اقتصادی خوش حالی تک بآسانی پہنچنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں اور یہی مطلوب و مقصود ہے کہ اقتصادی

مشکلات کو معاشرہ سے دور کر دیا جائے۔ البتہ سرمایہ دار کو دی گئی بے مہار آزادی اس نظام کے مثبت پہلوؤں کو بھی داغدار کر دیتی ہے جس کی وجہ سے معاشی آسودگی کی منزل دور ہی رہتی ہے۔

مندرجہ بالا ابحاث کے نتائج کی روشنی میں موضوعِ تحقیق کے بنیادی مسئلے کے جوابات یوں واضح ہوتے ہیں:

- بنیادی طور پر فقر و افلاس معاشی و اقتصادی مواقع کی عدم دستیابی، یا دستیاب اکتسابی مواقع کی عدم کفایت کا نام ہے۔ غربت یہ ہے کہ انسان کے پاس وہ وسائل وذرائع ناپید ہوں کہ جن کہ وجہ سے وہ اپنے ذاتی و عائلی اخراجات کو پورا کر سکے اور معاشرے کی بہتری میں فعال کردار ادا کر سکے۔ اس کے پاس اتنے وسائل نہ ہوں کہ جن کے ساتھ وہ اپنے خاندان کو مناسب غذا اور لباس فراہم کر سکے، تعلیم کے لیے سکول اور صحت کے لیے کلینک جا سکے، اتنی زمین نہ رکھتا ہو کہ جس پر اپنی فصلیں اگا سکتا ہو اور نہ ہی کوئی ایسی ملازمت یا مواقع میسر ہوں کہ جن سے اپنے معاش کو پورا کر سکے۔ فقر و افلاس کا دائرہ کار فقط انہی وسائل تک محدود نہیں بلکہ غربت ان تمام وسائل کی کمی سے عبارت ہے جو انسان کی جسمانی و ذہنی اور نفسیاتی احساسِ کمتری اور محرومی کا سبب بنتی ہیں۔
- غربت آمدن کی کمی، اثاثہ جات کی محدودیت اور اہلیت و اعتماد کی کمی کا دوسرا نام ہے۔ غربت افراد اور گھرانوں کی کم پیداواری صلاحیت سے پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ معاشی مشکلات اور ذاتی کاروبار و تجارت کے مواقع میں مشکلات سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ ابتدائی طور پر غربت کا تعلق مختلف اور متعدد محرومیوں سے ہوتا ہے جیسا کہ تعلیم اور شعور کی کمی، بیماری، معاشی پیداواری مواقع کی عدم دستیابی، بیماری اور کمزوری وغیرہ جیسے متعدد عوامل اور محرومیاں غربت و افلاس کو جنم دیتی ہیں۔ غربت ایسے حالات کا پیش خیمہ بن جاتی ہے کہ جن میں جسمانی، سماجی و معاشرتی اور نفسیاتی سکون حاصل کرنے کے لیے تمام ممکنہ وسائل و اسباب ناپید ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ غربت کے اثرات بھی کثیر الجہتی ہوا کرتے ہیں اور خطرناک محرومی پر منتج ہوتے ہیں۔
- فقر و افلاس کی معاشرے میں کئی شکلیں اور قسمیں ہیں، جس میں افراد کے پاس اپنے معاشی حالات کو مستحکم اور پائیدار رکھنے کے لیے آمدن اور پیداواری وسائل کی کمی، غذائیت کی کمی اور بھوک، صحت کی ناکافی سہولیات، تعلیم و تعلم کے وسائل کا نہ ہونا علاوہ ازیں دیگر بنیادی ضروریات زندگی کا ناپید ہونا، بیماریوں کی وجہ سے شرح اموات میں بڑھتا ہوا اضافہ، رہائش کی ناکافی سہولیات اور مناسب گھروں کا نہ ہونا، غیر محفوظ ماحول اور سماجی امتیازی سلوک وغیرہ سب شامل ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کی نمایاں خصوصیات میں مذکورہ بالا وجوہات کی وجہ سے سماجی و معاشرتی اور ثقافتی سرگرمیوں نیز اجتماعی معاشرتی فیصلوں میں عدم شرکت بھی شامل ہے۔

- اسلام انسان کے انفرادی معاملات سے لیکر اس کے اجتماعی، معاشی و معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں تک غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں ہدایت و راہمنائی کا واضح اور جامع نظام پیش کرتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق وسائلِ دولت کا حصول اور استعمال نا پسندیدہ نہیں بلکہ ان کا ارتکاز اور استحصالی استعمال ممنوع ہے۔
- اسلام کا معاشی و اقتصادی نظریہ اور اس کے مالی قوانین و ضوابط، فقط مادی معاملات کی بجا آوری اور مال و دولت کے اکتساب کے ذریعے اپنی ذاتی خوہشات کی تکمیل تک محدود نہیں بلکہ اقتصادِ اسلامی میں عوام کے معاشی اخلاقیات کے پہلو کو باقاعدہ قانون سازی کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اقتصادی و مالی اخلاقیات اسلامی مالی تعلیمات کا وہ درخشندہ باب ہیں جس سے سبھی معاشی مکاتبِ فکر اور اقتصادی نظام محروم ہیں۔ ان تعلیمات کے مطابق ہر صاحب ثروت شخص کی ذاتی ملکیت میں محروموں کا حق شامل کر کے اس کو ان کے بارے میں فکر مند رہنے اور ان کے حالات سے باخبر رہنے کا پابند کر دیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے دولت کا بہاؤ معاشرے کے سبھی طبقات کی طرف جاری رہتا ہے اور تقسیم و گردشِ دولت کے عمل کے سبب معاشرہ معاشی ناہمواری جیسے مسائل سے محفوظ رہتا ہے۔
- سرمایہ داری بطور ادارہ اور بطور نظام، انسانی معاشی و سماجی مشکلات کا حل اکتسابِ معیشت کے میدان میں شخصی آزادی کے عنوان سے فراہم کرتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کا کہنا ہے کہ جب افراد معاشرہ اکتسابِ مال میں آزاد معاشی سرگرمیاں انجام دیتے ہوں اور ان پر کسی قسم کی سیاسی، فکری، معاشی یا شخصی قدغن اور پابندی نہ ہو تو وہ آزادی سے اپنی تمام قواہ اور طاقتوں کو بروئے کار لاتے ہیں اور خوب محنت اور مشقت کرتے ہیں جس سے نہ صرف فرد بلکہ اقتصادِ معاشرہ پر بھی مثبت اور دیرپا اثرات پڑتے ہیں۔ اس طرح سے نہ صرف اس شخصِ خاص بلکہ معاشرے کے سر پر بھی منڈلانے والے معاشی خطرات، فقر و فلاس اور غربت کے امکانات دم توڑ جاتے ہیں اور معاشرہ مثبت سمت میں ترقی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

تجاویز و سفارشات

1۔ اسلامی نکتہ نظر سے دولت اللہ کی امانت ہے۔ اسلام نے اس کے حصول و خرچ میں مخصوص شرائط و ضوابط مقرر کیے ہیں، لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ مال و دولت کو کسب و صرف کے مواقع میں مالکِ حقیقی کی ہدایات اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہی کمانے اور صرف کرنے کے حوالے سے افراد کی راہنمائی کی جائے۔

2۔ اسلامی معاشروں میں پائی جانے والی اس فکر کی حوصلہ شکنی ضروری ہے جو معاشی خوشحالی کو دنیا پرستی، اقتصادی بہبود کو ناپسندیدہ عمل اور دولت مندی کے حصول کو ناجائز اور غیر اسلامی فعل قرار دیتی ہے حالانکہ اس نظریے کا اسلام سے کوئی واسطہ

نہیں۔ علماء، مشائخ اور دانشور حضرات دولت مندی و ثروت مندی کے ممدوح ہونے اور فقر و افلاس کے ناپسندیدہ ہونے کے اسلامی فلسفے سے عوام کو روشناس کرانے کے لیے اپنی ذمہ داری ادا کریں۔

3۔ اسلامی اصولِ محنت کو مد نظر رکھتے ہوئے معیشت و اقتصاد کی ترقی سے وابستہ تمام محنت طلب اور پُر مشقت کاموں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ اسلام میں تمام صحت مند معاشی سرگرمیوں کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے اور اسلامی تعلیمات میں کسبِ معاش کے معاملے میں کی جانے والی سستی، کوتاہی اور غفلت کی قطعی گنجائش نہیں ہے، لہذا کام کاج اور محنت و مشقت کو عار سمجھنے والے رویے کی حوصلہ شکنی ضروری ہے۔ اس سلسلے میں معاشرے کے امراء، فضلاء اور حکمران طبقے کا کردار نہایت اہم ہے۔

4۔ قانونی سطح پر تقسیمِ دولت کے اصول متعارف کرائے جائیں تاکہ تمام افراد اس سے مستفید ہو سکیں۔ تقسیمِ دولت کے تمام اصولوں کو معاشرے میں نافذ کیا جائے اور حکومتِ اسلامی اس سلسلے میں اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرے۔ بالخصوص اس سلسلے میں قانونِ وراثت کی مکمل تنفیذ کے ذریعے اور نظامِ زکاۃ قائم کر کے معاشرے سے غربت کے خاتمے کے لیے عملی قدم اٹھایا جائے۔

5۔ اسلامی معاشی تعلیمات کی روشنی میں انفرادی و اجتماعی سطح پر مفید اقتصادی پالیسیوں کے طور عوام الناس میں سادگی و میانہ روی کے رویے کو عملی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے نہ صرف افراد کو آگاہ کرنا اور انہیں اعتدال و اقتصاد کی طرف راغب کیا جانا چاہیے بلکہ ضروری ہے کہ حکومتی سطح پر بھی اخراجات کے ضمن میں ہونے والی شاہ خرچیوں، قومی دولت کو ضائع کرنے جیسے رویوں نیز کرپشن اور مالی بے ضابطگیوں جیسے معاملات کو ہر صورت روکا جائے۔

6۔ تعلیماتِ اسلامی میں معاشی اخلاقیات کا باب غربت و افلاس کے خلاف اس کا سب سے اہم اور مؤثر ہتھیار ہے۔ اسلام فقر و افلاس کو فقط معاشی مسئلہ ہی نہیں بلکہ سماجی و اخلاقی مسئلہ بھی قرار دے کر معاشرے کے ہر فرد کو غربت کے خاتمے کے لیے متحرک کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اسلام کے متطوع صدقات، واجب صدقات، انفاق اور ایثار پر مشتمل چار نکاتی غربت کے خاتمے کے ایجنڈے کو بالخصوص اسلامی دنیا میں نافذ کرنے اور دیگر معاشی مکاتبِ فکر تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔

7۔ معاشرے میں بے قید سرمایہ داری کے نتیجے میں امیر اور غریب کا فرق اب افراد و اقوام کے دائرے سے نکل کر ممالک کی حد تک جا پہنچا ہے۔ ضروری ہے کہ عالمی سطح پر ایسے تمام عوامل کے حوالے سے قانون سازی کی جائے جو امیر اور غریب کے درمیان فرق کے دن بدن بڑھنے کا سبب ہیں۔ نیز اس قانون سازی کے ذریعے وسائل معیشت پر ایسے قیود و شرائط نافذ کیے جائیں۔

8۔اسلامی اقتصاد کی پوری عمارت احترامِ آدمیت اور مظلوموں، محتاجوں اور مستحقین کی دادرسی پر قائم ہے، علماء و محققین ، دانشور حضرات اور اسلامی ممالک کے اعلی تعلیمی ادارے دور حاضر کے معاشی و اقتصادی چیلنجز اور جدید معاشی افکار کو موضوعِ بحث بناتے ہوئے انسانیت کو درپیش اقتصادی و معاشی مسائل کا اسلامی نکتہ نظر سے جامع حل پیش کریں، نیز نئے اذہان کے شکوک و شبہات دور کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

9۔سرمایہ دارانہ نظام کے وہ مثبت و مفید پہلو جو غربت و افلاس کے خاتمے کے لیے عملی طور آزمائے جاچکے ہیں اور مفید اثرات کے حامل ہیں، بالخصوص بے روزگار اور محروم طبقے کے لوگوں نیز غربت کے شکار افراد کو ذاتی کاروبار کے مواقع اور راہنمائی فراہم کرنا، نیز ذاتی منافع کے محرک کو استعمال کرکے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ معاشی سرگرمیوں کی طرف راغب کرنا ایسے عوامل ہیں جن سے استفادہ کیے جانے کی ضرورت ہے۔

10۔اسلام نے اپنی اقتصادی تعلیمات سے استفادہ کرنے والوں کے لیے مسلمان ہونے کی شرط نہیں لگائی، چنانچہ اقتصادی اصولوں کے تمام پہلو بالخصوص وہ پہلو جو غربت و افلاس کے خاتمے سے متعلق ہیں، افراد، دانشوروں،اقتصادی ماہرین، دنیا کے مالی اداروں نیز دنیا کے رائج معاشی نظاموں کو متعارف کرائے جائیں تاکہ کرہ ارض پر بسنے والے تمام افراد کو ان سے استفادہ کرنے کے مواقع مل سکیں۔غربت و افلاس کے خاتمے کے اسلامی اصولوں میں سے اسلامی تقسیمِ دولت کے اصول، معاشی اخلاقیات، غریب پروری کی تلقین اور قانونِ وراثت جیسے قوانین وضوابط کو اگر تمام ممالک معاشی قانون سازی کرکے اپنے ہاں نافذ کرلیں تو مسئلہ فقر و افلاس کا تدارک کیا جاسکتا ہے۔

11۔تمام اسلامی ممالک بالخصوص او-آئی-سی کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اسلام کی آفاقی معاشی تعلیمات کو موجودہ ترقی یافتہ دور سے ہم آہنگ کرنے کے لیے خصوصی تحقیقی پروگرام تشکیل دیں۔اس ضمن میں ضروری ہے کہ تمام اسلامی ممالک مل کر اسلامی اقتصادی تعلیمات کی روشنی میں تمام اقتصادی مسائل کا حل پیش کرنے کے ایک لائحہ عمل ترتیب دیں۔اس مقصد کے حصول کے لیے تحقیقی اداوں، مسلمان دانشوروں، ذرائع ابلاغ اور میسر تمام وسائل وذرائع سے ہر ممکن استفادہ کیا جائے۔

12۔تعلیمی اداروں میں فقر و افلاس کی وجوہات اور اثرات و نتائج کے حوالے سے مواد کو تعلیمی نصاب کا حصہ بنایا جائے اور طلاب کو غربت کے خاتمے کے لیے اپنا کردار ادا کرنے کے لیے آمادہ اور تیار کیا جائے۔

فہارس

1. فہرستِ آیات کریمہ

2. فہرست احادیث نبویہ

3. فہرست اصطلاحات

4. فہرست شخصیات

5. فہرست مراجع و مصادر

فہرست آیات

نمبر شمار	آیت	سورت	آیت نمبر	صفحہ نمبر
1.	هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا	البقرة	29	159
2.	وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ	البقرة	61	15
3.	وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى و	البقرة	83	248
4.	يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلْ مَا أَنفَقْتُم مِّنْ خَيْرٍ	البقرة	187	190
5.	وَأَنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى	البقرة	195	189
6.	مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا	البقرة	245	228
7.	وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ	البقرة	247	176
8.	لِّلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْض	البقرة	284	159
9.	زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ	آل عمران	14	160
10.	لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا	آل عمران	92	165
11.	ولَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ	آل عمران	180	172
12.	وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْ	النساء	8	289
13.	وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي	النساء	36	180
14.	وَهُوَ الَّذِي أَنشَأَ جَنَّاتٍ مَّعْرُوشَاتٍ وَغَيْرَ مَعْرُوشَاتٍ	الانعام	141	170
15.	وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعا	الاعراف	10	139
16.	وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ	الاعراف	156	255
17.	إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ	الانفال	2	197
18.	وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي	الانفال	41	194
19.	وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا	التوبہ	34	80
20.	إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ	التوبہ	60	20
21.	وَمِنَ الْأَعْرَابِ مَن يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ	التوبہ	99	230

163	6	ہود	وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا	22.
154	12	ہود	فَلَعَلَّكَ تَارِكٌ بَعْضَ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَضَائِقٌ بِهِ	23.
167	71	النحل	وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا	24.
171	26	الاسراء	وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ	25.
80	29	الاسراء	وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا	26.
113	31	الاسراء	وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ	27.
110	73	مریم	وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا	28.
171	81	طہ	كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيهِ فَيَ	29.
159	33	النور	وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِينَ فِيهِ	30.
12	24	القصص	رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ	31.
282	58	القصص	وَكَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ	32.
173	77	القصص	وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ	33.
163	17	العنکبوت	إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ لَكُمْ رِزْقًا	34.
145	7	الحشر	كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ	35.
88	10	الجمعہ	فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن	36.
183	16	التغابن	وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ	37.
295	15	الملک	هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِىْ مَنَاكِبِهَا	38.
181	34-25	الحاقہ	وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ	39.
88	20	المزمل	وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ يَبْتَغُونَ مِن فَضْلِ اللَّهِ	40.
181	45-42	المدثر	قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ	41.

فہرست احادیثِ نبویہ

نمبر شمار	حدیث کا متن	کتاب کا نام	صفحہ نمبر
.1	إِذَا سَمِعَ بِرُخْصٍ سَاءَهُ، وَإِذَا سَمِعَ بِغَلَاءٍ فَرِحَ بِهِ	المعجم الکبیر	148
a	أَطْعِمُوا الْجَائِعَ وَفُكُّوا الْعَانِيَ وَعُودُوا الْمَرِيض	مسند ابی داؤد	183
.2	الاقتصاد فی النفقة نصف المعيشة	مکارم الاخلاق	83
.3	الاقتصاد في النفقة نصف المعيشة، والتودد إلى الناس	کنز العمال	173
.4	أَمْسِكْ عَلَيْكَ بَعْضَ مَالِكَ فَهُوَ خَيْرٌ لَكَ	صحیح بخاری	170
.5	إن الله تعالى يحب أن يرى عبده تعبا في طلب الحلال	فتح القدیر	295
.6	إِنَّ المكْثِرِينَ هُمُ المقِلُّونَ يَوْمَ القِيَامَةِ، إِلَّا مَنْ أَعْطَاهُ اللَّهُ خَيْرًا	صحیح بخاری	149
.7	إِنْ شِئْتُمَا أَعْطَيْتُكُمَا مِنْهَا، وَلَا حَظَّ لِغَنِيٍّ	مسند احمد بن حنبل	220
.8	إِنَّ صَدَقَةَ الْمُسْلِمِ تَزِيدُ فِي الْعُمُرِ، وَتَمْنَعُ مِيتَةَ السَّوْءِ	المنہاج شرح صحیح مسلم	232
.9	إِنَّمَا الْعُشُورُ عَلَى الْيَهُودِ، وَالنَّصَارَى وَلَيْسَ عَلَى	مسند احمد بن حنبل	212
.10	أَيُّمَا مُؤْمِنٍ أَطْعَمَ مُؤْمِنًا عَلَى جُوعٍ أَطْعَمَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ	سنن الترمذی	231
.11	بادروا بالأعمال فتناً كقطع الليل المظلم يصبح الرجل	صحیح مسلم	115
.12	تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ فَإِنَّهَا مِنْ دِينِكُمْ	مسند الدارمی	284
.13	تَعَلَّمُوا الْقُرْآنَ وَعَلِّمُوهُ النَّاسَ، وَتَعَلَّمُوا الْعِلْمَ	سنن الکبری	283
.14	الذهب باالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر...	صحیح مسلم	70
.15	الصَّدَقَةُ عَلَى المِسْكِينِ صَدَقَةٌ، وَهِيَ عَلَى ذِي الرَّحِمِ	سنن الترمذی	233
.16	طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة	سنن الکبری للبیہقی	89
.17	الْعِلْمُ ثَلَاثَةٌ، وَمَا سِوَى ذَلِكَ فَضْلٌ: آيَةٌ مُحْكَمَةٌ، أَوْ	سنن ابو داؤد	284
.18	الغنى غنى النفس ...	صحیح بخاری	11
.19	فأبشروا وأملوا ما يسركم، فوالله لا الفقر أخشى عليكم	صحیح بخاری	168
.20	فَأَعْلِمْهُمْ أَنَّ اللَّهَ افْتَرَضَ عَلَيْهِمْ صَدَقَةً فِي أَمْوَالِهِمْ	صحیح بخاری	217

227	صحیح بخاری	كل معروف صدقة	.21
154	سنن الکبری	كل مال لا تؤدى زكاته فهو كنز	.22
69	مسند الامام احمد بن حنبل	لا تبيعوا الدرهم بدرهمين،فانى أخاف ...	.23
191	صحیح مسلم	لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ	.24
111	صحیح مسلم	اللهم انى اسئلک الهدى والتقى والعفاف والغنى	.25
111	مسند احمد ابن حنبل	اللهم انى اعوذ بک من الفقر والقلة والذلة و اعوذ	.26
104	السنن الکبری	لَوْ تَعْلَمُونَ مَا فِي الْمَسْأَلَةِ مَا مَشَى أَحَدٌ إِلَى أَحَدٍ	.27
191	صحیح بخاری	مَا زَالَ يُوصِينِي جِبْرِيلُ بِالْجَارِ، حَتَّى ظَنَنْتُ أَنَّهُ سَيُوَرِّثُهُ	.28
198	صحیح مسلم	مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَالٍ، وَمَا زَادَ اللهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ	.29
157	صحیح بخاری	مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلاَ يَبِعْهُ حَتَّى يَقْبِضَهُ	.30
148	معجم ابن الاعرابی	مَنِ احْتَكَرَ طَعَامًا أَرْبَعِينَ يَوْمًا فَقَدْ بَرِئَ مِنَ اللهِ وَبَرِئَ اللَّهُ مِنْهُ	.31
187	مسند احمد بن حنبل	مَنْ كَانَ عِنْدَهُ طَعَامُ اثْنَيْنِ، فَلْيَذْهَبْ بِثَالِثٍ. مَنْ كَانَ عِنْدَهُ	.32
113	اتحاف المہرۃ لابن حجر	نعم العون على تقوى الله الغنى	.33
162	شرح صحیح بخاری لابن بطال	نعم المال الصالح للرجل الصالح	.34
89	صحیح بخاری	نعم كنت ارعى على قراريط لاهل مكة	.35
294	صحیح بخاری	وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَأَنْ يَأْخُذَ أَحَدُكُمْ حَبْلَهُ، فَيَحْتَطِبَ	.36
105	سنن الترمذی	وَلاَ فَتَحَ عَبْدٌ بَابَ مَسْأَلَةٍ إِلاَّ فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْهِ بَابَ فَقْرٍ	.37
209	المعجم الاوسط	وَلَمْ يَمْنَعُوا زَكَاةَ أَمْوَالِهِمْ إِلَّا مُنِعُوا الْقَطْرَ مِنَ السَّمَاءِ	.38
147	صحیح بخاری	يَا أَبَا ذَرٍّ أَتُبْصِرُ أُحُدًا؟ قَالَ: فَنَظَرْتُ إِلَى الشَّمْسِ	.39
191	شعب الایمان	يَا أَبَا ذَرٍّ، إِذَا طَبَخْتَ مَرَقَةً فَأَكْثِرْ مَاءَهَا وَتَعَاهَدْ جِيرَانَكَ	.40
189	سنن نسائی	يَدُ الْمُعْطِي الْعُلْيَا، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ: أُمَّكَ، وَأَبَاكَ	.41
182	صحیح بخاری	يَسِّروا ولا تُعسِّروا، وبشِّروا ولا تُنفِّروا	.42
165	صحیح بخاری	يكبر ابن آدم ويكبر معه اثنان: حب المال وطول العمر	.43

فہرستِ اصطلاحات

نمبر شمار	اصطلاحات	صفحہ نمبر
1	احتکار	66,73,148
2	احناف	21,26,151
3	اسراف	95,172
4	افراطِ زر	316
5	اکتناز	58,73,144
6	اہل ذمہ	211,275
7	بیت المال	215,242
8	تبذیر	81,172
9	تقتیر	81,254
10	تنویری علمیت	304
11	تنویری فکر	304
13	ٹیکنو سائنسز	304
14	جزیہ	168,212
15	حنابلہ	23
16	خراج	23,24,25
17	خطِ غربت	46
18	ذخیرہ اندوزی	49,150
19	ذمی کافر	212,274
20	رکاز	176,194
21	سٹہ بازی	155,156,157
22	شرعی مصارف	254

23	شوافع	21,22
24	ضوائع	274
25	عالمگیریت	14,54
27	علم الاجتماع	10,40,252
28	علم الفرائض	282,283,284
29	قائم بالذات	303
30	قمار	73,245
31	قوامیس	10
32	کساد بازاری	49,179
33	کفالت عامہ	278,279
34	کنایہ	8
35	متبنی	285,288
36	محاصل	75,272
37	محتسبوں	275,277
38	مرتد	276
39	مستامن حربی	274,276
40	مصارف	168,210
41	مصارف ثمانیہ	273
42	منقولہ اشیاء	275
43	نصاب	21,26,180
44	واجب النفقہ	15,24,119

فہرستِ شخصیات

نمبر شمار	شخصیات	صفحہ نمبر
1.	ابراہیم عسل	122
2.	ابراہیم مذکور	10
3.	ابن تیمیہ	13,14,204
4.	ابن جوزی	269
5.	ابن عابدین	32,151
6.	ابن عمارہ	10
7.	ابن فارس	5,7,196
8.	ابن منظور افریقی	7,150
9.	ابوعبیدہ بن جراح	268
10.	الازہری	5
11.	امام ابن قیم	153
12.	امام ابویوسف	153,272
13.	امام زیلعی	255
14.	امام شافعی	22,26,130
15.	امام نووی	22,147,151
16.	ایڈم سمتھ	18,19,317
17.	ایلن سنگر	345
18.	آئن رینڈ	331
19.	الباجی	151
20.	پول پولاک	348
21.	تھومس سوویل	330
22.	جوہن کینز	309

58,73,81	حفظ الرحمن سیوہاروی	.23
106	حمدی عبد العظیم	.24
6	خلیل ابن احمد الفراہیدی	.25
71	ڈاکٹر انور اقبال قریشی	.26
87	ڈاکٹر نور محمد غفاری	.27
11,227	راغب اصفہانی	.28
81	رفیق مصری	.29
134	الزبیتھ سوویل	.30
3,32	زبیدی	.31
24	زین الدین العاملی	.32
3	سمین الحلبی	.33
150,216	شاہ ولی اللہ	.34
22	شہاب الدین	.35
184	شیخ محمود شلتوت	.36
25	شیخ مفید	.37
14,205,209	طبری	.38
97,99	عبد الرحمن آل سعود	.39
57	عبد اللہ عبد الرحمن	.40
102	عبد النعیم حسنین	.41
124	عریقات حربی	.42
98	عطف عجوہ	.43
171	علامہ آلوسی	.44
9	علامہ جرجانی	.45
5	علامہ جوہری	.46
23	علامہ خرشی	.47
9	علامہ شبلی	.48

14	علامہ قسطلانی	.49
267,273	علامہ ماوردی	.50
8	علی مشکینی	.51
308	فرائیڈمین	.52
316	فریڈرک ہائیک	.53
4,110	قرطبی	.54
25	کاظم یزدی	.55
71,308	کینز	.56
348	مال ویرک	.57
103	ماہر علی	.58
71	باقر الصدر	.59
72	محمد تقی عثمانی	.60
40	محمد جصاص	.61
117	محمد عبد اللہ حماد	.62
63	محمد غزالی	.63
106	محمد مبارک	.64
82	محمد مرعی	.65
308,330	ملٹن فرائیڈمین	.66
327	ہینری ہیزلٹ	.67
50	والٹر ولیمز	.68
17,64,109	یوسف قرضاوی	.69

فہرست مصادر و مراجع

القرآن الکریم

عربی کتب

- ابن درید، ابو بکر محمد بن الحسن، جمہرۃ اللغۃ، دار العلم الملایین، بیروت، طبع اول 1973ء
- ابن ابی العزاء، صدر الدین علی بن علی، التنبیہ علی مشکلات الھدایۃ، مکتبۃ الرشد ناشرون، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، طبع اول 2003ء
- ابن ابی شیبہ، أبو بکر، الکتاب المصنف في الأحادیث والآثار (مصنف ابن ابی شیبہ)، مکتبۃ الرشد، الریاض، طبع اول 1409ھ
- ابن اثیر، عزالدین، الکامل فی التاریخ، دار الکتاب العربي، بیروت، لبنان، طبع اول 1997ء
- ابن اثیر، محمد بن محمد الجزری، النھایۃ في غریب الحدیث والاثر، المکتبۃ العلمیہ بیروت، طبع 1399ھ
- ابن اثیر، علي بن أبي الکرم، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابہ، دار الکتب العلمیہ، طبع اول 1415ھ
- ابن اثیر، عزالدین، الکامل في التاریخ، دار الکتاب العربي، بیروت، لبنان، طبع اول 1997ء
- ابن اعرابی، ابوسعید، معجم ابن الاعرابی، دار ابن جوزی، المملکۃ العربیہ السعودیۃ، طبع اول 1997ء
- ابن عربی، محمد بن عبد اللہ ابو بکر، احکام القرآن، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبع ثالثہ 2003ء
- ابن قیم الجوزی، محمد بن ابي بکر، احکام اہل الذمۃ، رمادی للنشر، الدمام، طبع اول 1997ء
- ابن قیم، محمد بن ابي بکر، الطرق الحکمیۃ، مکتبۃ دار البیان، بدون طبعۃ وبدون تاریخ
- ابن ہمام، کمال الدین محمد بن عبد الواحد، فتح القدیر، دار الفکر، سال طبع ندارد
- ابن وردی، عمر بن مظفر، تاریخ ابن الوردي، دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول 1417ھ
- ابن بدوی، عبد العظیم بن بدوي بن محمد، الوجیز في فقہ السنۃ والکتاب العزیز، دار ابن رجب، مصر، طبع ثالثہ 2001ء
- ابن بطال، ابو الحسن علي بن خلف بن عبد الملک، شرح صحیح البخاری لابن بطال، مکتبۃ الرشد، السعودیۃ، الریاض، طبع ثاني 2003ء

❖ ابن تیمیہ ،احمد ابن عبدالحلیم ،مجموع الفتاوی، مجمع الملک فہد لطباعۃ المصحف الشریف، المدینۃ النبویۃ، مملکۃ العربیۃ السعودیۃ، 1995ء
❖ ابن تیمیہ، امام محمد، منہاج السنۃ النبویۃ فی نقض کلام الشیعۃ القدریۃ، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیۃ، طبع اول 1986ء
❖ ابن جزی، محمد بن احمد بن محمد بن عبد اللہ، القوانین الفقہیہ، طباعت و سن طبع ندارد
❖ ابن حزم، علي بن احمد الاندلسي، المحلی بالآثار، دار الفکر، بیروت، طبع ندارد
❖ ابن حنبل، ابو عبد اللہ احمد بن محمد، مسند الامام احمد بن حنبل، مؤسسۃ الرسالۃ، طبع اول 1421ھ
❖ ابن سعد، ابو عبد اللہ محمد، الطبقات الکبری، دار صادر، بیروت، طبع اول 1968ء
❖ ابن عابدین، محمد امین بن عمر، رد المحتار علی الدر المختار (حاشیہ ابن عابدین)، دار الفکر، بیروت، طبع ثاني 1992ء
❖ ابن عباد، الصاحب اسماعیل، المحیط فی اللغۃ، عالم الکتب، بیروت، 1994ء
❖ ابن عبد الحکم، عبد الرحمن بن عبد اللہ، فتوح مصر والمغرب، مکتبۃ الثقافۃ الدینیۃ، سال طبع 1415ھ
❖ ابن فارس، ابو الحسین احمد بن فارس ابن زکریا، معجم مقاییس اللغۃ، مکتب الاعلام الاسلامی، قم، ایران، 1404ھ
❖ ابن قدامہ، ابو محمد موفق الدین محمد، المغني لابن قدامۃ، مکتبۃ القاہرۃ، طبع 1968ء
❖ ابن کثیر، ابو الفداء اسماعیل بن عمر، تفسیر القرآن العظیم، دار الکتب العلمیۃ،، بیروت، طبع اول 1419ھ
❖ ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، دار الاحیاء الکتب العربیہ، سن ندارد
❖ ابن مفلح، الحنبلی، المبدع فی شرح المقنع، مکتب الاسلامی، بیروت، طبع اول 1994ء
❖ ابو عُبید، قاسم بن سلاّم الھروي، کتاب الأموال، دار الفکر، بیروت، سن طباعت ندارد
❖ ابو یوسف، یعقوب بن ابراہیم، الخراج، مکتبۃ الازہریۃ للتراث، سال طبع ندارد
❖ الازہری، محمد بن احمد، تہذیب اللغۃ، دار القومیہ العربیہ للطباعۃ، طبع اول 1964ء
❖ اصفہانی، راغب، محاضرات الادباء و محاورات الشعراء والبلغاء، منشورات دار مکتبۃ الحیات، بیروت
❖ اصفہانی، احمد ابن اسحاق حافظ ابو نعیم، حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء، السعادۃ -بجوار محافظۃ مصر، 1394ھ
❖ اصفہانی، راغب، المفردات فی غریب القرآن، قدیمی کتب خانہ کراچی

❖ الاعرجي، زهير، العدالة الاجتماعية وضوابط توزيع الثّروة في الإسلام، سازمان اوقاف وامور خيريه، قم، ايران، طبع اول

❖ افريقي، محمد ابن مكرم ابن منظور، لسان العرب، دار صادر، بيروت، طبع اول1376ھ

❖ آلوسی، شهاب الدين محمود بن عبد الله، روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني، دار الكتب العلمية، بيروت، طبع اول1425ھ

❖ امام، محمد علي محمد، احلى الكلام فى مناجاة ذى الجلال والاكرام، مطبع السلام، مصر، طبع اول2007ء

❖ بخاری، محمد بن اسماعیل بوعبدالله، الجامع المسند الصحيح المختصر من امور رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وسننه وايامه- صحیح البخاری، دار طوق النجاة، طبع اول1422ھ

❖ البعلى، محمد بن ابى الفتح، المطلع على الفاظ المقنع، مكتبة السوادى للتوزيع، طبع اول2003ء

❖ البقری، محمد بن عمر ،حاشية محمد بن عمر البقري على شرح المنظومة الرحبية في علم الفرائض ، المطبعة الميمنية، مصر، طبع1334ھ

❖ باز، عبدالعزیز بن عبدالله ،اخلاق الدعاة، رئاسة ادارة البحوث العلمية والافتاء، رياض، السعودية، طبع رابع 1422ھ

❖ البہوتی، منصور بن يونس، كشاف القناع عن متن الاقناع، دار الكتب العلمية، سن ندارد

❖ البيهقى، احمد بن الحسين ابو بكر، شعب الايمان، مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض، طبع اول2003ء

❖ البيهقى، احمد بن حسين، سنن الكبرى للبيهقى، دار الكتب العلميه، بيروت، لبنان، 1424ھ

❖ الترمذی، محمد بن عیسی، سنن الترمذی، دار الحرب الاسلامی، بیروت، طبع 1998ء

❖ جرجانی، علی ابن محمد، کتاب التعريفات، دارالکتاب المصری، بیروت لبنان، 1991ء

❖ الجصاص، احمد بن علي الرازی، احکام القرآن، دار احیاء التراث العربی، بیروت، سن ندارد

❖ الجنیدل، حمد بن عبد الرحمان ،مناہج الباحثين في الاقتصاد الاسلامي، شركة العبيكان للطباعة والنشر، رياض، السعوديه، طبع1406ھ

❖ جوردون مارشالی، موسوعه علم الاجتماع، (مترجم: احمد عبد الله زايد)، مكتبة بستان المعرفة للطباعة والنشر والتوزيع، طبع اول2000ء

- الجوزی، عبد الرحمن بن علي أبو الفرج، مناقب امیر المؤمنین عمر بن الخطاب، دار ابن خلدون، طبع 1996ء
- الجوزی، ابو الفرج عبد الرحمن بن علی، مواسم العمر، دار البشائر الإسلامیۃ، طبع اول 2004ء
- جوہری، اسماعیل ابن حماد، الصحاح تاج اللغۃ وصحاح العربیہ، دار العلم الملایین، بیروت، 1410ھ
- حرکات، محمد، الاقتصاد السیاسي وجدلیۃ الثروۃ والفقر، مطبعۃ المعارف الجدیدۃ، الرباط، طبع اول 2002ء
- حسنین، عبد النعیم، الانسان والمال في الاسلام، دار الوفاء للطباعۃ والنشر، المنصورۃ، طبع 1986ء
- حسین عمر، التنمیۃ والتخطیط الاقتصادی، دار الشروق، جدہ، طبع ثانیہ 1978ء
- حسین عمر، موسوعۃ المصطلحات الاقتصادیۃ، دار الشروق، جدۃ، سن ندارد
- حشیش، عادل، اصول الاقتصاد السیاسي، دار الجامعۃ الجدیدۃ للنشر الاسکندریہ، مصر، طبع 2003ء
- حصکفی، محمد بن علی بن محمد الحنفی، الدر المختار شرح تنویر الانوار وجامع البحار، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان
- حطاب، ابو عبد اللہ محمد بن محمد، مواہب الجلیل في شرح مختصر خلیل، دار الفکر، طبعہ ثالثۃ 1992ء
- حلبی، احمد بن یوسف بن عبد الدائم، عمدۃ الحفاظ فی تفسیر اشرف الالفاظ، عالم الکتب، بیروت، طبع اول 1973ء
- حماد، ڈاکٹر محمد عبد اللہ، التحضر والجریمۃ، المرکز العربي للدراسات الامنیۃ والتدریب، ریاض، طبع 1406ھ
- حمدی، عبد العظیم، فقر الشعوب بین الاقتصاد الوضعی والاقتصاد الاسلامی، اکادمیۃ العلوم الاداریۃ، مصر، 1995ء
- حنبل، ابو عبد اللہ احمد ابن محمد، مسند امام احمد حنبل،، مؤسسۃ الرسالۃ، طبع اول 1421ھ
- الخرشی، امام محمد بن عبد اللہ، حاشیہ الخرشی علی مختصر سیدی خلیل، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، طبعہ اولی 1997ء
- الخطیب، عبد الکریم یوسف، التفسیر القرآنی للقرآن، دار الفکر العربی، قاہرہ
- خطیب البغدادی، تاریخ بغداد، ابو بکر احمد بن علي بن ثابت، دار الغرب الاسلامی، بیروت، طبع اول، 1422ھ
- خیری، محمد خیري المفتي، علم الفرائض والمواریث في الشریعۃ الاسلامیہ والقانون السوري، طبع وسن طبع ندار
- الدارمی، ابو محمد عبد اللہ ابن عبد الرحمن، مسند دارمی المعروف بسنن الدارمی، دار المغنی للنشر و التوزیع، السعودیۃ، طبع اول 2000ء
- الدارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمن، مسند الدارمي المعروف بسنن الدارمي، دار البشائر، بیروت، طبع اول 1434ھ

- الدريني، ڈاکٹر محمد فتحی، الفقہ الإسلامي المقارن مع المذاهب، منشورات جامعۃ دمشق، طبع ثالثہ 1992ء
- الدسوقی، محمد بن احمد بن عرفۃ، حاشیۃ الدسوقي علی الشرح الکبیر، دار الفکر، سال اشاعت ندارد
- دوزی، رینھارت بیتر آن، تکملۃ المعاجم العربیۃ، (نقلہ إلی العربیۃ وعلق علیہ: محمد سلیم نعیمی، جمال خیاط)، وزارۃ الثقافۃ والإعلام، الجمہوریۃ العراقیۃ، طبع اول 2000ء
- دیار، علی جمعہ محمد مفتی، المکائیل والموزون الشرعیہ، القدس للاعلان والنشر، قاہرہ، طبعہ ثانیہ
- رازي، زین الدین محمد بن ابي بکر، مختار الصحاح، المکتبۃ العصریۃ، بیروت، طبع خامسہ 1420ھ،
- رشوان، حسین عبد الحمید، اضواء علی الحیاۃ الاجتماعیہ، المکتب الجامعی الحدیث، الاسکندریہ، 1999ء
- رشوان، حسین، مشکلات المدینۃ ودراسۃ في علم الاجتماع الحضري، المکتب العربي الحدیث، الاسکندریۃ، طبع 2002ء
- رمانی، زید، اقتصاد الفقر: بؤس و ازمات، مکتبۃ الرشد للنشر و التوزیع، ریاض، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، طبع اول 2003ء
- زبیدی محمد ابن مکرم ابن منظور،، تاج العروس من جواہر القاموس، شدار الھدایہ، بیروت، 1965ء
- زحیلی، وہبہ بن مصطفی، الفقہ الاسلامی وادلتہ، دار الفکر، دمشق، طبع رابعہ، سال اشاعت ندارد
- زرقا، محمد انس، دور الزکاۃ في الاقتصاد الاسلامي والسیاسۃ المالیۃ، ندوۃ اقتصادیات الزکاۃ، المعہد الاسلامي لبحوث والتدریب، البنک الاسلامي للتنمیۃ، جدۃ، طبع ثانیہ 2002ء
- زیلعی، عثمان بن علي فخر الدین، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، المطبعۃ الکبری الأمیریۃ، بولاق، قاہرہ، طبع اول 1313ھ
- سجستانی، أبو داود سلیمان بن الأشعث، سنن ابي داود، المکتبۃ العصریۃ، صیدا، بیروت، سن طبع ندارد
- سحیبانی، محمد ابراہیم، اثر الزکاۃ علی تشغیل الموارد الاقتصادیۃ، طبع اول، 1990ء
- سراحنہ، جمال حسن، مشکل البطالۃ وعلاجھا: دراسۃ بین الفقۃ والقانون، دمشق، سوریہ، طبع 2001ء
- سرخسی، شمس الدین، المبسوط، دار المعارف، بیروت، طبعہ ثانیہ
- سیستانی، السید علي الحسیني، منہاج الصالحین، دار المؤرخ العربي، بیروت، طبع رابعۃ عشر، 2008ء
- شافعی، امام ابو عبد اللہ محمد بن ادریس، الام، درالافکار الدولیہ، بیروت

❖ شاہ ولی اللہ، احمد بن عبد الرحیم بن شہید وجیہ الدین، حجۃ اللہ البالغہ، دار الجیل، بیروت، طبع اول 1426ھ
❖ شحاتیت، ڈاکٹر محمد، موشرات الفقر فی الاردن، جامعہ الامیرہ سمیہ
❖ شربینی، شمس الدین، محمد بن احمد، مغني المحتاج الی معرفۃ معاني الفاظ المنہاج، دار الکتب العلمیہ، طبع اول 1994ء
❖ شلتوت، شیخ محمود، الاسلام عقیدۃ وشریعۃ، دار القلم، مصر، طبع ثالثۃ 1966ء
❖ شوکانی، محمد بن علي، فتح القدیر، دار ابن کثیر، دار الکلم الطیب، دمشق، بیروت، طبع اول 1414ھ
❖ شوکانی، محمد بن علي بن محمد بن عبد اللہ، نیل الأوطار، دار الحدیث، مصر، طبع اول 1993ء
❖ شیبانی، محمد بن حسن بن فرقد، الاصل، دار ابن حزم، بیروت، طبع اول 2012ء
❖ شیرازی، السید مرتضی حسین، استرتحیۃ مکافحۃ الفقر، دار الامین، لبنان، بیروت، طبع اول 2012ء
❖ شیرازی، محمد حسینی، من أسباب الفقر والحرمان فی العالم، مؤسسۃ المجتبی، بیروت، 1424ھ
❖ صفوات، احمد زکی، جمہرۃ خطب العرب في عصور العربیۃ الزاہرۃ، المکتبۃ العلمیۃ بیروت، لبنان، سن ندارد
❖ طباطبائی، سید محمد کاظم، العروۃ الوثقی فیما تعم بہ البلوی، مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات، بیروت، لبنان، طبع ثانیہ 1409ھ
❖ لطبرانی، سلیمان بن احمد بن ایوب، المعجم الأوسط، دار الحرمین، قاہرہ، سال طبع ندارد
❖ طبرانی، سلیمان بن احمد، الروض الداني (المعجم الصغیر)، المکتب الاسلامي، دار عمار، بیروت، طبع اول 1985ء
❖ طبرانی، ابو القاسم، مکارم الاخلاق، دار الکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، طبع اول 1409ھ
❖ طبرانی، سلیمان بن احمد، المعجم الکبیر، دار النشر مکتبہ ابن تیمیہ، قاہرہ، طبع ثانیہ
❖ طبری، محمد ابن جریر، تاریخ الرسل والملوک (المعروف بہ تاریخ الطبري)، دار التراث، بیروت، طبع ثانیہ 1387ھ
❖ طبری، محمد ابن جریر، جامع البیان فی تاویل القرآن، موسسۃ الرسالۃ، طبعہ اولی 1420ھ
❖ طبری، محمد ابن جریر، تفسیر طبری جامع البیان عن تفسیر القرآن، مرکز البحوث والدراسات العربیہ والاسلامیہ، دار ہجر، قاہرہ، طبع اول 1422ھ
❖ طبری، محمد بن جریر، جامع البیان عن تاویل آي القرآن (تفسیر الطبري)، دار ہجر للطباعۃ والنشر والتوزیع، طبع اول 2001ء

- ❖ طویل، نبیل صبحی، الحرمان والتخلف فی دیار المسلمین، کتاب الاۃ، قطر، طبع اول1404ھ
- ❖ لطیالسی، ابو داود سلیمان بن داود، مسند ابي داود الطیالسي، دار ہجر، مصر، طبع اول1419
- ❖ طیالسی، ابو داود سلیمان بن داود بن الجارود الطیالسي، مسند ابي داوٗد الطیالسي، دار ہجر، مصر، طبع اول1999ء
- ❖ عامر، فاتن محمد، الفقر، جامعہ الملک سعود، المملکۃ السعودیۃ العربیہ، سن ندارد
- ❖ عاملی، زین الدین، الروضۃ البہیۃ في شرح اللمعۃ الدمشقیۃ، منشورات مؤسسۃ الاعلمي للمطبوعات، طبع اولی
- ❖ عاملی، محمد بن حسن، وسائل الشیعہ الی تحصیل مسائل الشریعۃ، مؤسسۃ آل البیت لإحیاء التراث، قم، طبع اول 1998ء
- ❖ عبد اللہ بن عبد الحکم، سیرۃ عمر بن عبد العزیز علی ما رواہ الامام مالک بن انس واصحابہ، عالم الکتب، بیروت ،لبنان، طبع سادسہ 1984ء
- ❖ عبد المنعم، محمود عبد الرحمن، معجم المصطلحات والفاظ الفقہیۃ، دار الفضیلۃ للنشر والتوزیع والتصدیر، قاہرہ، سن طبع ندارد
- ❖ عبد الحمید، احمد مختار، معجم اللغۃ العربیۃ المعاصرۃ، عالم الکتب، طبع اول2008ء
- ❖ عبد الرحمان، عبد اللہ، علم الاجتماع الاقتصادی، دار المعرفۃ الجامعیۃ، مصر، 2003ء
- ❖ عبد الرحمن بن سعد، مشکلۃ الفقر و سبل علاجہا فی ضوء الاسلام، دار النشر بالمرکز العربی للدراسات الامنیۃ و التدریب، ریاض، طبع 1411ھ
- ❖ عبد العظیم، حمدی، فقر الشعوب بین الاقتصاد الوضعی والاقتصاد الاسلامی، اکادیمیۃ العلوم الاداریۃ، مصر، طبع 1995ء
- ❖ عبدہ، امام محمد، تفسیر المنار، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، قاہرہ، 1973ء
- ❖ عبود، صموئیل، خمسۃ مشکلات اساسیۃ لعالم متخلف، کلیۃ التربیۃ الریاضیۃ، جامعیہ حلوان، بنین، الھرم، طبع 1986ء
- ❖ عجوہ، عامطف عبد الفتاح البطالۃ فی عالم العربی و علاقتہا بالجریمۃ، ،دار النشر بالمرکز العربی للدراسات الامنیۃ و التدریب، طبع1406ھ
- ❖ عدوان، منیر حسن عبد القادر، مؤسسۃ بیت المال في صدر الإسلام، مکتبۃ الجامعۃ الأردنیۃ 2014ء

- ❖ عریقات، حربی، مبادی فی التنمیۃ والتخطیط الاقتصادی، دار الفکر للنشر والتوزیع، اردن، طبع اول 1992ء
- ❖ عسقلانی، احمد ابن حجر، اتحاف المہرۃ بالفوائد المبتکرۃ من اطراف العشرۃ(المعروف اتحاف المہرۃ لابن حجر)، مجمع الملک فہد للطباعۃ المصحف الشریف، مدینہ، طبع اول 1415ھ
- ❖ عسقلانی، احمد بن علی بن حجر، فتح الباری شرح صحیح البخاری، دار المعرفۃ، بیروت، 1379ھ
- ❖ عسل، ابراہیم، التنمیۃ فی الاسلام: مفاہیم، مناہج وتطبیقات، المؤسسۃ الجامعۃ للدراسات، بیروت، طبع 1996ء
- ❖ علاء الدین، علي بن حسام الدین، کنز العمال في سنن الأقوال والأفعال، مؤسسۃ الرسالۃ، طبع خامسہ 1981ء
- ❖ علاء الدین، محمد بن علي بن محمد الحِصْني المعروف بعلاء الدین، الدر المختار شرح تنویر الأبصار وجامع البحار، دار الکتب العلمیۃ، طبع اول 1423ھ
- ❖ علی، ماہر، الخدمۃ الاجتماعیۃ في مجال الدفاع الاجتماعي، مکتبۃ زہراء الشرق، مصر، طبع چہارم 2003ء
- ❖ عمارہ، محمد، قاموس الاصطلاحات الاقتصادیۃ فی الحضارۃ الاسلامیہ، دار الشرف، بیروت، طبعہ اولی 1993ء
- ❖ عیادی، احمد مصطفی، الامن الغزائی فی الاسلام، دار النفائس، عمان، اردن، طبع اول 1999ء
- ❖ غزالی، محمد، جدد حیاتک،، دار الارقم، دمشق، سوریہ، طبع 2004ء
- ❖ غزالی، محمد، الاسلام والاوضاع الاقتصادیۃ، نھضۃ مصر للنشر والتوزیع، سال طبع ندارد،
- ❖ فراء، قاضي ابویعلی، محمد بن الحسین، الاحکام السلطانیہ للفراء، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان، طبع ثانیہ 2000ء
- ❖ فراہیدی، خلیل ابن احمد، کتاب العین، سازمان اوقاف وامور خیریہ، قم، ایران، طبع دوم 1383ھ
- ❖ فرغانی، علی بن ابی بکر، الہدایۃ فی شرح بدایۃ المبتدی، دار احیاء التراث العربي، بیروت، لبنان
- ❖ فیومی، احمد بن محمد، المصباح المنیر في غریب الشرح الکبیر، المکتبۃ العلمیۃ، بیروت، سن ندارد
- ❖ قرافی، احمد بن ادریس بن عبد الرحمن، أنوار البروق في أنواء الفروق (الفروق)، عالم الکتب، سن ندارد
- ❖ قرضاوی، یوسف، دور الزکاۃ فی علاج مشکلات الاقتصادیۃ، قراءات فی اقتصاد الاسلامی مرکز ابحاث الاقتصادی الاسلامی، کلیۃ الاقتصاد والادارۃ، جامعہ الملک عبد العزیز، السعودیہ، طبع اول 1987ء
- ❖ قرضاوی، یوسف، دور القیم والاخلاق فی الاقتصاد الاسلامی، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، لبنان، طبع دہم 1994ء
- ❖ قرضاوی، یوسف، مشکلۃ الفقر وکیف عالجہا الاسلام، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، طبع 1406ھ
- ❖ قرضاوی، یوسف، دور الزکاۃ في علاج المشکلات الاقتصادیۃ وطرق نجاحہا، دار الشروق، قاہرہ، طبع اول 2001ء

- قرطبی، سلیمان بن خلف بن سعد، المنتقی شرح الموطا، مطبعة السعادة، مصر، طبع اولی 1332ھ
- قرطبی، محمد بن احمد بن ابی بکر، الجامع لاحکام القرآن، دارالاحیاء التراث العربی، بیروت، طبع اول 1952ء
- قرطبی، یوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر، الاستیعاب في معرفة الأصحاب، دار الجیل، بیروت، طبع اول 1992ء
- قطب، سید، العدالة الاجتماعیة في الاسلام،، دار الشروق، قاہرہ، 1395ھ
- قطلانی، شھاب الدین احمد بن محمد، ارشاد الباری شرح صحیح البخاری، دارالفکر، بیروت، طبع 1990ء
- قلعجی، محمد رواس، حامد صادق قنیبي، معجم لغة الفقهاء، دار النفائس للطباعة والنشر والتوزیع، طبع ثانیہ 1988ء
- کاسانی، علاء الدین، ابو بکر بن مسعود بن احمد، بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع، دار الکتب العلمیہ، طبع ثاني 1986ء
- کور تل، فرید، التشخیص ظاهرة الفقر بالجزائر ودور الزکاة في مواجهتها، الملتقی الدولي حول مؤسسات الزکاة في الوطن العربي، کلیة العلوم الاقتصادیة وعلوم التسییر، جامعة سعد حلب، البلیدة، 2004 2003
- مالک ابن انس بن مالک، الموطا، موسسہ زید بن سلطان آل نہیان للاعمال الخیریہ والانسانیہ، ابوظبی، الامارات، طبع اول 2004ء
- لمالکی، ابو العباس شہاب الدین احمد ابن ادریس، الذخیرہ، دارالغرب الاسلامی، بیروت، طبعہ اولی 1994ء
- ماوردی، ابوالحسن علي بن محمد، الاحکام السلطانیہ، دار الحدیث، قاہرہ، سن طباعت ندارد
- ماوردی، ابوالحسن علي بن محمد، ادب الدنیاوالدین، دارمکتبة الحیاة، طبع 1986ء
- مبارک، محمد، نظام الإسلام الاقتصاد مبادئ و قواعد عامة، دار الفکر، بیروت، لبنان، طبع ثالثہ 1980ء
- مجلسی، محمد باقر، بحار الانوار الجامعة لدرر اخبار الائمة الاطهار، منشورات مؤسسة الاعلمي للمطبوعات، طبع اول 2008ء
- محیي الدین مستور الزکاة فقهها وأسرارها وعلاج مشکلة الفقر في الإسلام
- مذکور، ابراہیم، معجم العلوم الاجتماعیہ، الھیئة العامة للکتاب، 1975ء
- مرعی، محمد، الحاجات البشریہ، دار البحوث للدراسات الاسلامیہ واحیاء التراث، الامارات العربیہ المتحدہ، دبی، طبع 2001ء

❖ مسلم ، مسلم بن حجاج نیشاپوری، المسند الصحیح المختصر بنقل العدل عن العدل الی رسول اللہؐ،المعروف صحیح مسلم،احیاء التراث العربی،بیروت، طبع ندارد
❖ مشکینی، علی، مصطلحات الفقہ،موسسہ دارالحدیث العلمیہ والثقافیہ ، قم،ایران، طبع 1434ھ
❖ مصری،رفیق، اُصول الاقتصاد في الإسلام،دار القلم,سوریا،طبع سوم1420ھ
❖ مطہری، مرتضی، المجتمع والتاریخ،وزارۃ الارشاد الاسلامي جمہوریۃ ایران الإسلامیۃ، طبع اولی1987ء
❖ المعجم الوسیط، مجمع اللغۃ العربیۃ بالقاھرۃ(ابراھیم مصطفی ،احمد الزیات ، حامد عبد القادر ، محمد النجار)، دار الدعوۃ،سن ندارد
❖ معجم الوسیط،مجمع اللغۃ العربیۃ بالقاھرہ(ابراھیم مصطفی،احمد الزیات،حامد عبد القادر، محمد النجار)،دار الدعوۃ،سن واشاعت ندارد
❖ مغنیہ، محمد جواد،الفقہ علی المذاہب الخمسہ،سازمان اوقاف وامور خیریہ، قم،ایران، طبع ہفتم1982ء
❖ مفید، محمد ابن نعمان، المقنعہ،مؤسسۃ الاعلمی للمطبوعات،بیروت،لبنان
❖ مناوی، محمد،التوقیف علی مھمات التعاریف،عالم الکتب،القاھرۃ، طبع اول1990ء
❖ مہدی، شمس الدین محمد،دراسات فی نھج البلاغہ،دار الزہراء،بیروت، طبع ثانیہ1392ھ
❖ موسوعۃ الفقہیہ،وزارۃ الاوقاف والشؤون الاسلامیہ، کویت، طبع ثانیہ 1983ء
❖ ناصری، احمد بن خالد،الاستقصالأخبار دول المغرب الأقصی،دار الکتاب،الدار البیضاء،سن طبع ندارد
❖ نجفی، محمد حسن،جواہر الکلام فی شرح شرائع الاسلام،دارالاحیاء التراث العربی،1413ھ
❖ نسائی،ابوعبد الرحمن احمد بن شعیب ،المجتبی من السنن - السنن الصغری للنسائي(المعروف بسنن نسائی)،مکتب المطبوعات الاسلامیۃ، حلب، طبع ثانیہ1986ء
❖ نسائی،ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب،السنن الکبری،مؤسسہ الرسالۃ،بیروت، طبع اول1421ھ
❖ نووی، محیي الدین یحیی بن شرف،روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین، المکتب الاسلامي، بیروت، طبع ثالثۃ 1991ء
❖ نووی، یحی بن شرف ،المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج(شرح النووی علی المسلم)، دار إحیاء التراث العربي ،بیروت، طبع ثاني،1392ھ
❖ نووی،ابوزکریا محی الدین بن شرف،المجموع شرح المہذب، دارالفکر،بیروت

❖ نیشاپوری، ابوعبد اللہ الحاکم، المستدرک علی الصحیحین، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبع اول 1411ھ
❖ ہمدانی، عبد الرحمان ابن عیسی، کتاب الفاظ الاشباہ والنظائر، دار المعارف، قاہرہ، 1981ء
❖ وہب، علی، خصائص الفقر والازمات الاقتصادیہ فی العالم الثالث، دار الفکر، بیروت، 1996ء
❖ یوسف محمد، فقہ الاقتصاد الإسلامي، دار القلم للنشر والتوزیع، الکویت، طبع اول 1988ء

اردو کتب

❖ آزاد، مولانا ابوالکلام، اسلام اور جمہوریت، لاہور: طیب پبلشرز، س۔ن
❖ اردو جامع انسائیکلوپیڈیا، شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور
❖ اردو دائرۃ المعارف الاسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، طبع اول 1975
❖ اصلاحی، محمد عمر اسلم، معاشی مسائل اور قرآنی معلومات (مقالات سیمینار)، قرآن کی چند معاشی تعلیمات اور معاشرے سے ان کا ربط، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ، اترپردیش، طبع اول 2011ء
❖ اصلاحی، مولانا امین احسن، تدبر قرآن، تاج کمپنی، دہلی، طبع 1979ء
❖ افغانی، شمس الحق، سرمایہ دانہ واشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے موازنہ، مکتبۃ الحسن، لاہور، سن ندارد
❖ اولکھ، چوہدری مجید اے، اسلامی تصور محنت – سماجی معدلت، اولکھ پبلی کیشنز، لاہور
❖ بخاری، ڈاکٹر سید تنویر، اسلام اور جدید افکار، پروفیسر حمید اللہ جمیل، ایورنیو بک پیلس، لاہور، سن ندارد
❖ بخاری، فرزانہ، اسلامی معیشت، نیو بک پیلس، اردو بازار، لاہور، سن ندارد
❖ چیمہ، غلام رسول، اسلام کا معاشی نظام، علم و عرفان پبلشرز، طبع 2007ء
❖ ڈار، پروفیسر عبد الحمید، اسلامی معاشیات، علمی کتاب خانہ لاہور، اشاعت 2014ء
❖ سیوہاروی، محمد حفظ الرحمن، اسلام کا اقتصادی نظام، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور
❖ الشریف رضی، محمد بن حسین، نہج البلاغہ، امامیہ پبلی کیشنز، لاہور، طبع سیزدہم 1998ء
❖ شیرازی، ناصر مکارم، مادیت و کمیونزم، دار الثقافہ الاسلامیہ، کراچی، طبع اول 1987ء
❖ الصدر، محمد باقر، اسلامی اقتصادیات کا جائزہ (مترجم: ذیشان حیدر جوادی)، محمد علی بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، سن ندارد
❖ الصدر، محمد باقر، آج کا انسان اور اجتماعی مشکلات، (مترجم: ذیشان حیدر جوادی) معراج کمپنی لاہور، سن طبع ندارد

- الصدر، محمد باقر، اقتصادنا، (مترجم: سید ذیشان حیدر جوادی) معراج کمپنی، لاہور، سال طبع ندارد
- الصدر، محمد باقر، اسلامی اقتصادیات اور جدید اقتصادی مکاتب، (مترجم: ذیشان حیدر جوادی) سازمان تبلیغات اسلامی روابط بین الملل، تہران، طبع ثانیہ 1406ھ
- ظفر، حکیم محمود احمد، معیشت و اقتصاد کا اسلامی تصور، ادارہ اسلامیات، لاہور، طبع اول 2006ء
- عثمانی، مفتی محمد تقی، اسلام اور جدید معیشت و تجارت، مکتبہ معارف القرآن، کراچی، طبع 2010ء
- عثمانی، مفتی محمد رفیع، یورپ کے تین معاشی نظام، ادارۃ المعارف، کراچی، طبع 2007ء
- علوی، مستفیض احمد، تہذیب کا برزخ، یورپ اکادمی، اسلام آباد، طبع اول 2011ء
- غازی، ڈاکٹر محمود احمد، محاضراتِ معیشت و تجارت، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، طبع 2010ء
- غازی، محمود احمد، محاضرات معیشت و تجارت، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور۔ طبع 2010ء
- غفاری، نور محمد، اسلام کا معاشی نظام، شیخ الہند اکیڈمی، کراچی، سن طبع ندارد
- قریشی، انور اقبال، اسلام اور سود، اسلامک بک سروس لاہور۔ طبع سوم 1978ء
- کیلانی، عبد الرحمن، احکام تجارت اور لین دین کے مسائل، مکتبۃ السلام، لاہور، طبع ششم، 2013ء
- گیلانی، سید مناظر احسن، اسلامی معاشیات، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد
- محسنی، محمد آصف، اسلامی اقتصاد (ترجمہ: محسن علی نجفی)، جامعہ اہل البیت، اسلام آباد، طبع اول 1983ء
- محمود احمد، شیخ، سود کی متبادل اساس، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، طبع دوم 1990ء
- مطہری، مرتضی، اسلامی اقتصاد کا ایک جائزہ، (مترجم: سید مسعود اختر رضوی) دارالثقافہ الاسلامیہ، پاکستان، طبع اول 1420ھ
- ملاٹھوی، مظفر حسین، معاشیات اسلام، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی، 1984ء
- مودودی، ابو الاعلی، اسلام اور ضبط ولادت، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد
- مودودی، ابو الاعلی، معاشیات اسلام، اسلامک پبلی کیشنز پرائیوٹ لمیٹڈ، لاہور، سن ندارد
- مودودی، ابو الاعلی، سود، اسلامک پبلی کیشنز پرائیوٹ لمیٹڈ، لاہور، سن ندارد
- مودودی، سید ابو الاعلی، اسلام اور جدید معاشی نظریات، اسلامک پبلی کیشنز لاہور، اشاعت ششم 1969ء

English Books:

- Adams, Charles C, Islam and Modernism in Egypt, London: Oxford University Press, 1933
- A. Bagheri and Z. A. L. Pihie, Entrepreneurial leadership learning: In search of missing links, Procedia-Social and Behavioral Sciences, 2010
- A.C.Fernando, Business Environment, Dorling Kindersley(India), New Delhi, 2011
- Aldred, Jonathan, The Skeptical Economist: Revealing the Ethics Inside Economics, Earthscan, London, 2009
- Allan Sheahen , Palgrave Macmillan, Basic Income Guarantee: Your Right to Economic Security, New York, 2012
- Andrew S. Zimbalist, Howard J. Sherman, Stuart Brown Harcourt Brace Jovanovich, Comparing Economic Systems, Harcourt College Publications,1989
- Attacking Poverty, The World Bank World Development Report (WDR) 2000/2001, Oxford University Press, New York, 21 September 2000
- Augustus, James, Capitalism, University of Minnesota Press
- Ayn Rand , The Virtue of Selfishness, , Signet publishers, 2005
- Barry Commoner, The Illusion of Consumer Sovereignty, Smithsonian Institution Press, Washington, 1991
- Basij J. Moore, Horizontalists and Verticalists: The Macroeconomics of Credit Money, Cambridge University Press, 1988
- Bellamy, Richard , The Cambridge History of Twentieth Century Political Thought, Cambridge University Press
- C. K. Prahalad, Fortune at the Bottom of the Pyramid: Eradicating Poverty Through Profits, Pearson Prentice Hall, 2006
- Capitalism, World Book Encyclopedia, published in 1988
- Chapra, M. Umer, Islam and the Economic Challenge, The Islamic Foundation, Leicester, U.K
- Deodat E. Adenutsi, Entrepreneurship, job creation, income empowerment and poverty reduction in low-income economies, Munich Personal RePEc Archive (MPRA)
- Easterlin, Richard, Will Raising the Income of all Increase the Happiness of All?, Journal of Economic Behaviour and Organization
- Ehrlich, Paul, The Population Bomb, Ballantine Books, 1971

- Encyclopedia Britannica, 1964
- Encyclopedia Britticana, USA Chicago, 15th Edition 2005
- Frederick Howard H., Donald F. Kuratko and Richard M. Hodgetts,Entrepreneurship : theory, process and practice, South Melbourne Thomson Learning, 2006
- Gottfried Haberler, Prosperity and Depression, Transaction Publishers, 2011
- Harrison, Paul, Inside the Third World: The Anatomy of Poverty, New York, Penguin Books. 3rd edition
- Harrison, Paul, Third World: The Anatomy of Poverty, New York: Penguin Books, 3rd Edition
- Hayek, Friedrich The Road to Serfdom, University Of Chicago Press, 1944
- Hayek, Friedrich, The Pure theory of Capital, University of Chicago Press
- Hezlitt, Henry, Economics in One Lesson, Crown Publishing Group 2010
- Howard White & Tony Killick, African Poverty at the Millennium: Causes, Complexities, and Challenges, Washington D.C, World Bank
- Human Development Report, United Nations Development programme, Nov 27 2007
- Jacqueline Rorabeck Kasun, The War Against Population: The Economics and Ideology of World Population Control, Ignatius Press, 1999
- James D.Forma, Capitalism, Dell Publishing New York,1976
- Jay Mitra, Y.A. Abubakar, M. Sagagi, Knowledge creation and human capital for development: the role of graduate entrepreneurship, Education & Training
- Joseph L. Bast, Herbert J. Walberg ,Education and Capitalism, Hoover Institution Press
- Karatnycky, Adrian, Freedom in the World: The Annual Survey of Political Rights and Civil Liberties, Transaction Publishers, 2001
- Kogan Page, Armstrong's Handbook of Reward Management Practice, Michael Armstrong, New Delhi, 2012
- Linda J. Bilmes,The Financial Legacy of Iraq and Afghanistan: How Wartime Spending Decisions Will Constrain Future National Security Budgets, Harvard Kennedy School, March 2013
- Malthus, Thomas Robert, An Essay on principles of Populatioin, John Murray, London, 6th Edition
- Martin Ravallion, Shaohua Chen and Prem Sangraula,Dollar a day revisited, The World Bank conomic Review, June 2009
- Minsky ,Hyman, Stabilizing an Unstable Economy, , Yale University Press, 2008
- Moha Asri Abdullah, The accessibility of the government-sponsored support programmes for small and medium-sized enterprises in Penang, Cities

* Monitoring Global Poverty, Report of the Commission on Global Poverty, World Bank Group
* Owen Schadwick, The Secularization of the European Mind in the Nineteenth Century, Cambridge University Press
* P.G.Aquinas,Business and Socity, Anmol publications, New Delhi, 2005
* Paul R. Gregory, Robert C. Stuart, The Global Economy and its Economic Systems, South-Western College Publications
* Persky, Joseph, Retrospectives: Consumer Sovereignty, Journal of Economic Perspectives, 1993
* Polak, Paul, Out of Poverty: What Works When Traditional Approaches Fail, Berrett-Koehler Publishers, 2008
* Polak, Paul, Warwick, Mal, The Business Solution to Poverty: Designing Products and Services for Three Billion New Customers, Berrett-Koehler Publishers, 2013
* Ravallion,Martin Poverty Comparisons: A Guide to Concepts and Methods, Living Standards Measurement Papers, The World Bank, 1992
* Ricardo David, Principles of Political Economy and Taxation, John Murray Publisher, 3rd edition
* S. B. Misango and O. K. Ongiti, Do women entrepreneurs play a role in reducing poverty? A case in Kenya, International Review of Management and Business Research
* Smith,Adam, An Inquiry Into the Nature and Causes of the Wealth of Nations, Lincoln & Gleason Printers, 1804
* Stilwell, Frank, Political Economy: the Contest of Economic Ideas, First Edition. Oxford University Press. Melbourne, Australia. 2002
* Susanna sandstorm, Anthony Shorrocks, Edward N. Wolff, The World Distribution of Household Wealth, James B. Davies, Department of economics, University of Western Ontario, London, 2006
* T.R Jain, Microeconomics and Basic Mathematics, VK Publications, New Delhi
* The World Book Encyclopedia, Scott Fetzer Company, Chicago
* Williams, Raymond, A vocabulary of culture and society , Oxford University Press 1985
* Wilson, Rodney, Economics, Ethics and Religion(Jewish, Christian and Muslim Economic Thought), Palgrave Macmillan UK, 1997
* World Employment and Social Outlook Trends, International Labor Office, Geneva, 2016
* Ziauddin Ahmad, Islam, Poverty and Income Distribution, The Islamic Foundation, 1991

رسائل وجرائد اور ویب سائٹس

- سرمایہ دارانہ نظام کے نتائج، شیخ عثمان صفدر، سہ ماہی البیان، خصوصی اشاعت جدید معیشت تجارت مروجہ اسلامی بینکاری میزان شریعت میں، المدینہ ریسرچ سنٹر، کراچی، سلسلہ نمبر 6،7 جنوری تا جون 2013ء
- عوران، احمد، الدور الاقتصادي التنوي للزكاة من خلال معالجتها لقضية الفقر، مجلة دراسات، الجامعة الأردنية، المجلد 26، العدد، 1999ء
- المرسی، السید حجازی، الزكاة والتنمية في البيئة الإسلامية، مجلة جامعة الملك عبد العزيز، الاقتصاد الاسلامي، المجلد 17، عدد 2، 1425ھ
- المصری، رفیق، مصرف الغارمین وأثره في التكافل الاجتماعي، مجلة جامعة الملك عبد العزیر، الاقتصاد الاسلامي، جلد 18، عدد 1، 1426ھ
- Ali Yassin Shaeikh Ali & Abdel Hafiez Ali, Entrepreneurship development and poverty reduction: Empirical survey from Somalia, American International Journal of Social Science
- Choudhury Masudul Alam,The Micro-Economics Foundations of Islamic Economics: A Study in Social Economics, The American Journal of Islamic Social Sciences
- George Bulkley, Personal Savings and Anticipated Inflation, The Economic Journal
- Hao Jiao,A conceptual model for social entrepreneurship directed toward social impact on society, Social Enterprise Journal
- James Mundell, Inflation and Real Interest, Journal of Political Economy
- Jean D. Kabongo & John O. Okpara, Entrepreneurship education in Sub-Saharan African universities, International Journal of Entrepreneurial Behaviour & Research
- Morrisson, Christian, Bourguignon & François, Inequality Among World Citizens: 1820-1992, American Economic Review
- Oswald, Andrew , Happiness and Economic Performance, Economic Journal
- Singer, Alan, Business strategy and poverty alleviation, , Journal of Business Ethics, 2006
- Steve Fleetwood, Do labour supply and demand curves exist?, Cambridge Journal of Economics, 2014
- Willian Harold Hutt, The Concept of Consumers' Sovereignty, the economic Journal Wiley

- www.bbc.com
- www.britannica.com
- www.businessdictionary.com
- www.nysun.com
- www.ourworldindata.org
- www.poverty.org.uk
- www.Sun-sentinel.com
- www.theglobeandmail.com
- www.un.org
- www.unesco.org
- www.ur.wikipedia.org
- www.urduvoa.com
- www.worldbank.org

*****